اخلاق عملی

مؤلف

آیۃ اللہ مہدوی کنی

ناشر

معارف اسلام پبلشرز

بسم الله الرحمن الرحيم

خادم حسین

اخلاق عملی

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI
PH. 7211795

مؤلف
آیۃ اللہ مہدوی کنی

ناشر
معارف اسلام پبلشرز

نام کتاب	:	اخلاق عملی
مؤلف	:	آیت اللہ مہدوی کنی
ناشر	:	معارفِ اسلام پبلشرز
تاریخ اشاعت	:	جمادی الاول ۱۴۲۰ ھ۔ق
تعداد	:	دو ہزار

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

فہرست

مقدمہ ناشر ۹

پیش لفظ ۱۱

ابتدا کے نقطے ۴۱

۱۔ خود شناسی اور خدا شناسی ۴۳

۲۔ خود آگاہی اور احساس ذمہ داری ۴۹

۳۔ خدا کی یاد (تذکر) ۵۵

۴۔ تذکر اور تفکر (انفس و آفاق کی سیر) ۵۹

۵۔ الحب للّٰہ والبغض للّٰہ (تولیٰ و تبرا) ۶۳

۶۔ شریعت اور احکام خداوندی کا علم ۷۱

۷۔ مخلص دوست کا انتخاب ۷۵

۸۔ حرام سے پرہیز ۷۹

زبان کی آفتیں ۹۶

غیبت ۱۰۳

جھوٹ ۱۸۰

چغلخوری ۱۹۳
تضحیک واستہزاء ۱۹۷
حسد ۲۰۵
غصہ ۲۱۰
۹۔ توبہ واستغفار ۲۱۵
۱۰۔ واجبات اور فرائض کی ادائیگی ۲۲۵
امانت داری اور سچائی ۲۲۸
۱۱۔ نوافل اور مستحبات کی انجام دہی (اور مکروہات سے اجتناب) ۲۳۳
۱۲۔ مرابطہ ۲۳۹
مشارطہ ۲۴۱
مراقبہ ۲۴۶
نفس کا محاسبہ ۲۴۸
معاتبہ (یا اپنے اوپر تنقید) ۲۶۲
۱۳۔ نیت واخلاص کی بحث اور شرک وریا اور منافقت سے پرہیز ۲۶۵
نیت یا روح عمل ۲۶۷
عبادت میں اخلاص ۲۸۵
ریا اور عمل کا بطلان ۲۹۹
۱۴۔ ریاضت اور نفس کے ساتھ جہاد ۳۰۵
۱۵۔ نظم وانضباط اور وقت کی تقسیم ۳۱۳

۱۶۔ فرصت کے لمحات کو غنیمت سمجھنا ۳۱۹
۱۷۔ بندگان خدا کی خدمت ۳۲۵
لوگوں کے درمیان صلح کروانا ۳۳۷
یتیموں کی سرپرستی ۳۴۳
۱۸۔ اللہ پر توکل اور اعتماد ۳۴۹
۱۹۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک ۳۶۱
صلہ رحمی ۳۶۸
بیماروں کی عیادت ۳۷۶
کشادہ روئی ۳۸۲
مذاق اور خوش طبعی ۳۸۳
انصاف ۳۸۸
دوسروں کے حدود کا احترام ۳۹۳
جمال پسندی ۳۹۶
عفو و در گزر ۴۰۱
اتحاد و اتفاق ۴۰۶
عہد و پیمان کی پابندی ۴۱۱
۲۰۔ زہد ۴۱۹
۲۱۔ قناعت ۴۲۹
۲۲۔ تواضع ۴۵۱

مقدمہ ناشر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اخلاق ، انسانی اور الٰی علوم کے موضوعات میں سے ایک اہم اور ارزشمند موضوع ہے اور یہ اس حد تک اہمیت رکھتاہے کہ بعثت حضرت ختمی مرتبت کی علت مکارم اخلاق کی تکمیل بتائی گئی ہے۔ اس لیئے اخلاق کا موضوع پیغمبروں کی رسالت کے مہم ترین اہداف میں سے ایک ہے۔ اور آسمانی کتابوں کا ایک قابل ذکر حصہ اسی موضوع سے مخصوص ہے۔

انبیاء اور معصومین کی تعلیمات عالیہ کا زیادہ حصہ انسان کی تربیت اور تکامل اخلاق سے مربوط ہے۔ اس بناء پر علم اخلاق کا موضوع انسان ہے۔ اور انسان کے فطری اور اکتسابی اوصاف نیز اسکی کارکردگی کے عواقب علم اخلاق کی بحثوں کے دائرے میں آتے ہیں۔

اخلاق انسان کے اعمال و رفتار کا ارزشمند پہلو یعنی انسان کی تربیت اور اسکے تکامل کو مورد توجہ قرار دیتاہے۔ علم اخلاق کا ہدف یہ ہے کہ انسان کو اس سعادت تک پہنچائے جو خدا نے اسکے لیئے متعین فرمایاہے۔ اور انسان کی زندگی کے جو منفی پہلو ہیں ان سے اسکو دور رکھے۔

آج تک علم اخلاق کے موضوع پر مختلف زبانوں میں ، مختلف مذاہب اور نظریات کی بنیاد پر ہزاروں سے زیادہ کتابیں لکھی جاچکی ہیں ۔ اور ان میں سے ہر کتاب کے نویسندہ نے اپنے نظریے کے مطابق اس علم شریف کے مختلف پہلوؤں کی تشریح اور وضاحت کی ہے۔

لیکن آج کے انسان کی مادی زندگی میں پائی جانے والی اس خلا کو جبکہ آج وہ مباحث اخلاق کا زیادہ محتاج ہے کوئی بھی پر نہ کرسکا۔

اور جبکہ اس زمانے کا انسانی معاشرہ اخلاق اور اسکی بنیادی بحثوں پر شدت کے ساتھ توجہ دینے لگاہے ایسے میں معنویت اور اخلاق کے اس پیاسے انسان کو وہی تعلیمات سیراب کر سکتی ہیں کہ جنکا منبع وحی الٰہی ہے۔ اس لیئے کہ انسان کی جسمانی و روحانی اور مادی و معنوی ضرورتوں کو صرف وحی پہچان سکتی ہے۔ اور اس مادی انسان کے لاتنناہی دکھوں کی علاج کے حیات بخش اور زندگی ساز نسخے صرف وحی فراہم کر سکتی ہے۔

اور خوش قسمتی سے مسلمان دانشمندوں اور اہل بیت علیہم السلام کے پیروکاروں نے سمجھ بوجھ اور ذمہ داری کے ساتھ اسلام ناب (خالص) کی تعلیمات میں جستجو کر کے معاشرے کی ضرورتوں کا جواب فراہم کرنے لگے ہیں۔

اس سلسلے میں حضرت آیۃ اللہ مہدوی کنی (دامت برکاتہ) نے ایک نفیس اور ارزشمند کتاب " نقطہ ہای آغاز در اخلاق عملی " نہایت ہی سلیس بیان ، دلنشین نثر اور انوکھے انداز میں تالیف فرمایاہے حضرت آیۃ اللہ العظمٰی مہدوی کنی مخلص اور متخلق باخلاق الٰہی علماء میں سے ایک ہیں۔

آپ نے اپنی اس ماندگار کتاب میں روان اور سلیس انداز میں اخلاق عملی کے طریق کار تحریر فرمایا ہے۔ اور آپ ہی نے ان مطالب کو امام صادق یونیورسٹی کے طلبا کو لیکچرز کی صورت میں پڑھایا بھی ہے۔ اور آج اس کتاب کا شمار علمی حلقوں میں اور یونیورسٹیوں میں اخلاق کی معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔

معارف اسلام فاونڈیشن امید رکھتاہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ اردو زبان علمی حلقوں اور ثقافتی مراکز میں اور خصوصاً اسلامی تعلیمات کے جستجوگر جوانوں میں مقبول واقع ہوجائے۔

مؤسسہ معارف پبلشرز حوزہ علمیہ قم کے استاد اور فقیہ محترم حضرت آیۃ اللہ طاہری خرم آبادی کے تحت نظر اور سرپرستی میں علوم ومعارف اسلامی مانند اخلاق، تفسیر، حدیث، تاریخ اسلام، عقاید اور تربیت اسلامی کے مسائل کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں بہت بڑا قدم اٹھایا ہے۔

امید ہے اس مؤسسے پر حضرت بقیۃ اللہ الاعظم کی عنایتیں ہونگی اور یہ خدمات بارگاہ خداوندی میں مقبول ہونگی۔

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ ربّ العالمین و صلّی اللہ علی سیّدنا و
نبیّنا ابی القاسم محمّد و آلہ الطّاہرین المعصومین لا سیما بقیۃ اللہ فی
الارضین حجۃ بن الحسن المہدی عجّل اللہ تعالی فرجہ
الشّریف و جعلنا من انصارہ
و شیعتہ

اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ ہر انسان خوشبختی ، کامیابی اور سلامتی کا متلاشی ہے اور اس مقصد تک رسائی کی خاطر ہر کوئی ایک خاص راستے اور طریقے کا انتخاب کرتا ہے۔

کامیابی کا حقیقی راستہ قرآن کی زبانی:

سورۃ الشمس میں اللہ تعالی گیارہ بار قسمیں کھاکر اس نکتے پر زور دیتا ہے کہ کامیابی اور فلاح کا واحد راستہ تزکیہ نفس، روح کی پاکیزگی اور قلب کو اخلاقی رذائل سے منزہ رکھنا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

والشمس وضحیہا .... قد افلح من زکیہا و قد خاب من دسیہا (۱)
سورج اور اس کی روشنائی کی قسم اور چاند کی قسم .... بہ تحقیق وہ فلاح پاگیا
جس نے اپنے نفس کو پاک رکھا اور وہ شخص نامراد رہا جس نے اسے گناہ کرکے چھپایا

---

(۱) سورۃ الشمس / ۱۰،۹۔

بعثت کا فلسفہ رسول اللہؐ کی زبانی:

حضورؐ نے فرمایا:

بُعِثْتُ بمکارم الاخلاق و محاسنہا (۱)

میں اخلاق کی بلندیوں اور خوبیوں کے ہمراہ مبعوث ہوا ہوں۔

امیر المومنین علی علیہ السلام کی بیان کردہ عقلی دلیل:

لو کُنّا لاَ نرجو جَنّۃً وَ لاَ نَخْشی ناراً وَ لاَ ثواباً و لا عِقاباً لکانَ یَنْبَغِي لَنَا انْ نُطالبَ بِمکارِمِ الْاَخلاقِ فانّہا مِمّا تَدُلُّ عَلیٰ سَبیْلِ النَّجاح (۲)

اگر ہمیں جنت اور ثواب کی امید نہ بھی ہوتی نیز ہمیں جہنم اور عذاب الٰہی کا خوف نہ بھی ہوتا تب بھی ہمارے لئے بلند اخلاقی آداب سے متصف ہونے کی کوشش ضروری ہوتی کیونکہ اچھا اخلاق انسان کو خوشبختی اور کامرانی کے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

انسان کیلئے تربیت کی ضرورت:

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ بِذَوی العُقُولِ مِنَ الحاجَۃِ الَی الْاَدب کَمَا یَظْمَاء الزَّرعُ اِلَی المَطَرِ (۳)

عقل رکھنے والی مخلوقات کو تربیت اور ادب سکھانے کی اسی طرح ضرورت ہوتی ہے جس طرح نباتات کو بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔

---

(۱) بحارالانوار ج ۶۶ ص ۴۰۵۔

(۲) مستدرک الوسائل۔ج ۲ ص ۲۸۳۔

(۳) غرر الحکم ج ۱ ص ۲۲۴۔

نتیجہ

ایک آزاد، با صلاحیت، صاحب ارادہ، عاقل اور صاحب اختیار ہستی ہونے کی حیثیت سے انسان کو تربیت اور خودسازی کی ضرورت ہے۔ دنیا و آخرت میں انسان کی خوش بختی اور منزل کمال تک اس کی رسائی کا راز صرف اور صرف اس نکتے میں پنہان ہے کہ وہ اخلاقی کمالات سے متصف ہو اور اخلاقی برائیوں سے اجتناب کرے۔

اخلاق کی تعریف:

اخلاق جمع ہے "خلق" کی۔ خُلق انسان کی باطنی حالت سے عبارت ہے، جس طرح خَلق اشیاء کی ظاہری و مادی صورت یا ساخت کا نام ہے۔

انسان کی باطنی یا روحانی صفات، عادات اور جبلی خصائل کو اخلاق کہاجاتاہے نیز ان خصائل کے نتیجے میں سامنے آنے والے طرز عمل اور کردار کو بھی اخلاق کے نام سے پکارتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ خَلق اور لفظ خُلق ایک ہی مادے سے ماخوذ ہیں لیکن یہ دونوں معنی و مفہوم کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ ابن منظور کہتے ہیں:

الخُلُقُ بِضَمّ اللّام وَ سُكُونِهَا هُوَ الدِّينُ وِ الطَّبعُ وَ السَّجِيَّةُ وَ حَقِيقَتُهُ اَنَّهُ لِصُورَةِ الانسانِ الباطِنَةِ۔ وَ هِيَ نَفسُهُ وَ اَوصافُهَا وَ مَعَانِيها المُختَصَّة بِهَا بِمَنزِلَةِ الخَلقِ لِصُورَتِهِ الظَّاهِرَةِ وَ اَوصَافِهَا وَ مَعَانِيهَا وَ لَهَا اَوصَاف حَسَنَة وَ قَبِيحَة

خُلُق اور خُلْق سے مراد ہے، عادت، طبیعت، خصلت در حقیقت یہ انسان کی باطنی کیفیت سے عبارت ہے۔ یعنی انسان کی روح۔ اس روح سے مختص اوصاف و کیفیات، جس طرح انسان کی ظاہری ساخت، صورت، اوصاف اور کیفیات کو خَلق کہا جاتاہے۔ اسطرح باطنی کیفیات کو خُلق کہا جاتاہے یاد رہے کہ انسانی روح جس طرح صفات حسنہ سے متصف ہوتی ہے اسی طرح صفات قبیحہ سے بھی متصف ہوسکتی ہے۔

علم اخلاق کے ماہرین نے انسان کی روحانی اور نفسیاتی عادات، صفات اور کیفیات کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے جو یہ ہیں:

۱۔ فطری اور طبیعی (نیچرل)

۲۔ اکتسابی یا اختیاری

فطری صفات:

فطری صفات سے مراد انسانی فطرت میں موجود خداداد صلاحیتیں، جذبات اور جبلی خصلتیں ہیں۔ ان صفات کے حصول میں اختیار اور عمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا، مثال کے طور پر خداجوئی، عرفان اور ماوراء الطبیعات کے بارے میں تحقیق کا جذبہ نیز حقیقت کی جستجو، حق پرستی، عدالت پسندی، اپنی سربلندی و رفعت، شخصیت، آزادی، احترام ذات، حب بقاء، اور حب کمال کی حس، علاوہ ازیں عقل، شہوت اور جذبۂ غضب جیسی باطنی کیفیات۔

یہ وہ باطنی صفات و خصوصیات ہیں جو اس بہترین نظام آفرینش میں فطری طور پر اسے عطا ہوئی ہیں اور انسان کو دوسرے حیوانوں سے جدا کرتی ہیں۔ ان کے برعکس صفات اکتسابی سے مراد وہ صفات ہیں جو انسانی ارادے، اختیار اور عمل کے باعث تدریجاً حاصل ہوتی ہیں تاکہ انسان اپنی خداداد اور فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے چنانچہ اگر انسان اپنی خداداد اور فطری صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہ کرے تو اس کی اکتسابی صفات بری ہوں گی اس مرحلے کی اچھی صفات و عادات کو "مکارم" اور "فضائل" کا نام دیا جاتاہے اور بری صفات و عادات کو "رذائل" کا نام دیا جاتاہے۔ پس اگر انسان کے اعمال و کردار صفات عالیہ اور عادات فاضلہ کے زیر اثر ہوں تو محاسن اخلاق و آداب کہلائے جائیں گے لیکن اگر بری عادات اور ملکات رذیلہ کے تابع ہوں تو "سیئات" یا اخلاقی برائیوں کے نام سے موسوم ہوں گے۔

بہرحال ملکات فاضلہ اور فضائل عالیہ تک رسائی کے لئے علمی اور عملی میدانوں میں ریاضت اور جہد مسلسل کی ضرورت ہے۔ یہاں پہلے مرحلے میں اخلاقی فضائل و رذائل نیز انسان کے حقیقی مقام سے آگاہی کی ضرورت ہے اور اس کے بعد نفس امارہ کے ساتھ مقابلہ کرنے کی، کیونکہ جب تک نفس امارہ کا مقابلہ نہ کیا جائے انسان نفسانی خواہشات پر غالب نہیں آسکتا اور جو شخص اس میدان میں ناکام رہے وہ روحانی سلامتی، بلندی اور فضل و شرف سے محروم رہے گا۔ظاہر ہے جو شخص نفس اور روح کی سلامتی کے مرحلے تک نہ پہنچ سکے اس کا شمار قیامت کے دن مجرموں میں ہوگا۔

علم اخلاق کے مختلف زاویے

اخلاقی مسائل پر مختلف زاویوں سے بحث ہوسکتی ہے اور ہر زاویہ ایک مخصوص موضوع یا عنوان کا حامل ہے۔ یہاں ہم اہم ترین عناوین کی طرف اشارہ کریں گے۔

۱۔ اخلاقِ نظری یا فلسفۂ اخلاق

۲۔ اخلاق تطبیقی یا اخلاق مقارن

۳۔ خلاق عملی یا اخلاقی روش

اخلاق نظری میں فلسفہ اخلاق یعنی اخلاق کی بنیادوں نیز اخلاقی خوبیوں اور برائیوں کے معیاروں سے بحث ہوتی ہے، مثال کے طور پر اخلاق کے نسبی یا مطلق ہونے کا مسئلہ نیز حسن و قبح ذاتی اور مصالح و مفاسد جیسے مسائل۔

اخلاق تطبیقی میں مختلف نظریات اور مکاتب فکر کے درمیان موازنہ اور مقایسہ کیا جاتاہے یعنی مختلف نظریات سے آگاہی کے بعد ان نظریات میں سے ہر ایک کے معیاروں اور بنیادوں کا موازنہ کرکے ان میں سے بہترین نظریئے کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے۔

رہا عملی اخلاق (یا اخلاق عملی) تو واضح ہو کہ اس کتاب میں ہماری بحث اسی (عملی اخلاق سے ہی ہوگی ۔ اگر چہ ممکن ہے کہ ہم وضاحت یا تائید کی خاطر کہیں کہیں دیگر مباحث یا عنوانات کی طرف بھی اشارہ کرتے چلیں۔

عملی اخلاق کا ہدف اور مقصد وہ آداب و احکام ہیں جن پر تزکیہ نفس کی خاطر کاربند رہنا ضروری ہے اور جو عمل کے ذریعے ہمیں ہدف سے نزدیک تر کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہاں عمل سے مراد جسمانی اعمال کے ساتھ ساتھ باطنی اور قلبی اعمال بھی ہیں مثلاً نیت، محبت، نفرت، بدگمانی، حسد، کینہ، تواضع، اور تکبر و غیرہ و غیرہ۔

عملی اخلاق کی قدر و قیمت:

علم اخلاق (اخلاق عملی) میں عمل سے بحث ہوتی ہے اور وہ بھی اس لحاظ سے کہ " عمل " بجائے خود قدر و قیمت کا حامل اور ایک اخلاقی خصوصیت کا آئینہ دار ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہم علم اخلاق میں عمل کے شرعی یا قانونی پہلو سے بحث نہیں کرتے بلکہ ہم عمل سے اس لحاظ سے بحث کرتے ہیں کہ عمل ایک قابل قدر اور قیمتی چیز ہے۔ بنابراین اگر کوئی عمل کسی شخص سے گاہے گاہے اور نہایت کم انجام پائے اور ایک اتفاقی عمل شمار ہو تو ایسا عمل علم اخلاق کی بحث سے خارج ہے اگر چہ فقہی اور قانونی نقطہ نظر سے یہ عمل، احکام پنجگانہ (وجوب۔ حرمت۔ استحباب۔ کراہت۔ جواز) میں سے ایک کا تابع ضرور ہوگا لیکن اگر یہی عمل انسانی عادات و خصائل پر مبنی ہو تو ایسا عمل علم اخلاق میں موضوع بحث قرار پائے گا۔

اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ بہت سے موضوعات پر علم فقہ اور علم اخلاق دونوں میں بحث کی جاتی ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ یہ موضوعات مکمل طور پر ایک جیسے ہیں اور دونوں علوم میں ان پر یکساں بحث کی جاتی ہے ایسا نہیں بلکہ ان دونوں علوم میں ان موضوعات پر مختلف زاویوں سے بحث ہوتی ہے چنانچہ علم فقہ میں لوگوں کے افعال

سے اس لحاظ سے بحث کی جاتی ہے کہ ان افعال سے متعلق الٰہی احکام کیا ہیں ؟ نیز یہ کہ انسانی حقوق و ذمہ داریاں اور ان کے حدود کیا ہیں ؟ اس کے برخلاف علم اخلاق کا اصلی موضوع اعلیٰ اخلاقی اقدار اور انسان کے اچھے خصائل سے عبارت ہے۔ پس علم اخلاق انسان کے عمل سے بحث کرتا ہے۔ بنابریں اگر ہم کسی عمل پر اس خصوصیت سے قطع نظر بحث کریں تو ہماری بحث علم اخلاق کے دائرے سے خارج ہوگی۔

یاد رہے کہ علم اخلاق اور بعض سائنسی علوم کے درمیان بھی کچھ مسائل مشترک ہیں البتہ ان میں فرق کا معیار یہی اقدار اور اخلاقی پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر علم اخلاق میں بعض مناسبتوں سے انسان کے جبلی خصائل اور ان کی باہمی تاثیرات پر کافی بحث ہوتی ہے۔ یہ چیزیں نفسیاتی امور میں شامل ہونے کے اعتبار سے علم نفسیات سے مربوط ہیں۔ لیکن علم اخلاق میں اس لحاظ سے ان سے بحث کی جاتی ہے کہ ان خصلتوں کی ایک دوسرے پر تاثیر کا انسان کی معنوی اور روحانی شخصیت پر براہ راست اثر ہوتا ہے۔ اور یہ معنوی اقدار میں داخل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں علم اخلاق انسانی خصائل کی اخلاقی قدروں سے بحث کرتا ہے اس کے سائنسی یا فلسفی پہلو سے نہیں اگرچہ سائنس اور فلسفہ کے ذریعے بھی اخلاق اور اخلاقی اقدار کی خدمت ہوسکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسانی عمل کے قانونی و شرعی زاویوں اور آثار و نتائج سے علم قانون یا علم فقہ میں بحث کی جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی خصائل کی باہمی تاثیرات سے علم نفسیات میں بحث کی جاتی ہے جبکہ جسم و روح کے ایک دوسرے پر اثرات، روح کی تکاملی حرکت، اور روح کی بقاء سے مربوط امور کا تعلق علم فلسفہ سے ہے۔ علم اخلاق میں ان فلسفی مسائل، سے بحث کرنے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ مسائل علم اخلاق کو سمجھنے کا پیش خیمہ اور اخلاقی قدروں کی بحث کی بنیاد ہیں۔

نتیجہ

جو چیز کسی عمل کو اخلاقی پہلو عطا کرتی ہے وہ اس عمل کی مثبت قدریں ہیں نہ کہ اس کی خارجی اور سائنسی حیثیت ۔ اسی لئے ممکن ہے کہ ایک شخص بہت ساری مثبت اخلاقی خصوصیات کا حامل ہو بغیر اس کے کہ وہ سائنسی نقطہ نظر سے فضیلت اور کرامت کی کوئی منطقی تعریف کر سکے۔ اس کے برعکس ممکن ہے کہ ایک شخص علمی یا سائنسی اصطلاحات سے خوب آگاہ ہو لیکن اخلاقی خصوصیات اور نورانیت سے اس کا دامن تہی ہو۔

امیر المومنین علیؑ فرماتے ہیں:

رُبَّ عَالِمٍ قَدْ قَتَلَهُ جَهْلُهُ، وَعِلْمُهُ مَعَهُ لاَ يَنْفَعُهُ (۱)

کتنے ہی صاحبانِ علم ایسے ہیں جو اپنی جہالت کے باعث تباہ ہو جاتے ہیں اور ان کا علم انہیں فائدہ نہیں پہنچاتا۔

اس جہالت سے مراد ان انسانی اور اخلاقی خصوصیات کا فقدان ہے جو عالم کو تباہ کرتا ہے۔ بنابراین اخلاق فضیلت اور رذالت کی کسوٹی ہے ۔ پس اگر علم اخلاق میں عدالت سے بحث ہوتی ہے تو اس لحاظ سے یہ مثبت اقدار میں سے ایک ہے نہ اس لئے کہ یہ ایک ذمہ داری ہے. دوسرے لفظوں میں عدالت ایک اخلاقی فضیلت اور خوبی کی حیثیت سے علم اخلاق کے دائرے میں داخل ہوتی ہے جبکہ علم فقہ اور قانون میں ایک قانونی اور اجتماعی ذمہ داری کی حیثیت سے اس پر بحث ہوتی ہے۔

---

(۱) نہج البلاغہ فیض الاسلام حکمت نمبر ۱۰۴۔

علم اخلاق کی رو سے عدل کو اپنانا ایک اختیاری عمل اور انتخاب محسوب ہوتا ہے لیکن علم قانون یا علم فقہ کی رو سے یہ ایک ذمہ داری اور ضرورت گردانا جاتا۔ اسی لئے واضح ہے کہ اگر کوئی شخص سزا کے خوف سے عدالت کو اپنائے تو اس کی قانونی ذمہ داری ادا ہوجاتی ہے لیکن اخلاقی نقطہ نظر سے اس کا یہ عمل فائدہ مند نہیں ہے کیونکہ عدالت کا اپنانا اس وقت اہمیت کا حامل اور قابل قدر ہے جب یہ عمل اخلاقی فضیلت اور ایثار کی خاطر ہو۔

خلاصہ یہ کہ علم اخلاق مثبت بنیادوں اور اقدار سے بحث کرتا ہے اور اخلاقی طرز عمل وہ ہے جو مثبت معیاروں اور اقدار کا حامل ہو۔ اسی طرح اخلاقی احکام سے مراد وہ احکام ہیں جو مثبت اور اچھے اقدار کی بنیادوں پر استوار ہوں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ انسانی علوم میں دو قسم کے مسائل پر بحث کی جاتی ہے جو حقیقی مسائل اور اعتباری مسائل سے عبارت ہیں۔

اعتباری مسائل کی بھی یہ دو قسمیں ہیں:

۱۔ ارزشی

۲۔ غیر ارزشی

انسان سے مربوط وہ اعتباری مسائل جو مثبت معیاروں کے حامل ہوں اور اسکے نفسانی حالات اور اعمال و کردار سے الٰہی حدود کی روشنی میں بحث کرتے ہوں وہ علم اخلاق سے مربوط ہیں۔

چنانچہ ممکن ہے کہ ایک عمل قانونی نقطہ نظر سے ممنوع نہ ہو لیکن اخلاقی اصولوں کی رو سے غیر پسندیدہ اور قبیح قرار پائے مثلاً کسی برے کام کی انجام دہی کی نیت فقہی اور قانونی لحاظ سے سزا کا موجب نہیں لیکن علم اخلاق کی رو سے نیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اور لوگ اپنی نیتوں کی بناء پر ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہوتے ہیں. اسی طرح ممکن ہے کہ کسی کام کی انجام دہی فقہی اور قانونی نقطہ نظر سے اجتماعی مفادات یا انفرادی ضرورت کے پیش نظر جائز قرار پائے لیکن اس کے منفی اخلاقی یا روحانی اثرات سے چشم پوشی ممکن نہ ہو۔ مثلا ضرورت پڑنے پر جھوٹ بولنا یا غیبت کرنا فقہی زاویے سے گناہ کا باعث نہیں لیکن معنوی اور روحانی لحاظ سے اس کے منفی اثرات باقی رہتے ہیں. بنابرین اگر انسان ضرورت کے باوجود بھی جھوٹ نہ بولے تو مستحسن بات ہے۔ علم اخلاق کے ماہرین یہ نصیحت کرتے ہیں کہ جب تک توریہ کی گنجائش ہو جھوٹ سے احتراز کیا جائے نیز ضرورت کی صورت میں بھی غیبت کی کم ترین مقدار پر اکتفا کیا جائے اور حتی الامکان کوشش کی جائے کہ توجہ اور احتیاط برتتے ہوئے ان امور کی ضرورت کے امکانات کو کم کیا جائے۔

البتہ کچھ امور ایسے ہیں جو علم فقہ اور علم اخلاق دونوں کی رو سے ممنوع ہیں مثلا غیبت، جھوٹ، تہمت، وغیرہ لیکن ان دونوں علوم میں بحث کا معیار یکساں نہیں۔ علم فقہ، ان افعال کے قانونی و شرعی پہلو سے بحث کرتا ہے لیکن علم اخلاق ان کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی تشریح کرتا ہے. بطور مثال غیبت دو پہلوؤں کی حامل ہے. ایک یہ کہ غیبت مومن کی دل آزاری اور بے احترامی کی موجب ہے اور فقہی لحاظ سے حرام کام اور گناہ کبیرہ ہے۔ دوسرا یہ کہ غیبت ایک قسم کی روحانی بیماری ہے جو اعلی انسانی اقدار سے متصادم ہے اور اگر غیبت کا سلسلہ جاری رہے تو انسان کی انسانیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ ایک درندے کی شکل اختیار کر لیتا ہے. بحث کا یہ پہلو علم اخلاق سے مربوط ہے.
پہلی صورت میں غیبت کے منفی پہلو کی تلافی شاید اس شخص کو (جس کی غیبت کی گئی ہو) راضی کرنے کی صورت میں ہو سکے لیکن اسے راضی کر کے دوسرے پہلو کی اصلاح نہیں کی جا سکتی بلکہ یہاں ریاضت، عبادت، دعا اور استغفار کی ضرورت ہے تا کہ اس طرح دل کی

تاریکیاں اور غلاظتیں دور ہوں۔ علم فقہ میں فقط احکام بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے لیکن علم اخلاق میں گناہوں اور اخلاقی و روحانی بیماریوں کی روک تھام کے طریقے بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ قرآن نے غیبت کو اپنے مردہ دینی بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔ اور اس حقیقت پر بحث و تحقیق، علم اخلاق کا کام ہے۔ دوسرے الفاظ میں علم اخلاق اس بات سے بحث کرتا ہے کہ انسان اس قدر عظمت و منزلت کا حامل ہونے کے باوجود غیبت کرنے اور جھوٹ بولنے کی بناء پر اس حد تک زوال کا شکار کیوں ہوتا ہے کہ وہ ایک درندے اور مردہ خور حیوان (۱) کی صورت اختیار کرلے یا ایک بدبودار مردے کی؟ (۲)

فطری خصلتوں کے بے کراں افق

بے شک تمام انسانوں کے اندر جبلی اور طبعی قوتیں موجود ہیں۔ انسان کی تمام اندرونی و بیرونی حرکات اور سرگرمیوں کا سرچشمہ یہی جبلی قوتیں ہیں. ان میں سے چند اہم ترین جبلی خصائل یہ ہیں: انسان کے اندر موجود تجسس اور جستجو کا شوق، حق پرستی کا جذبہ، نیز عرفانی خداجوئی، تفوق طلبی، جمال پسندی، عدالت خواہی، فداکاری، سودجوئی، خود پسندی، حب نفس، حب بقاء، حب ذات، حب مال و ثروت، حب جاہ و مقام اور شہوت و غضب کے جذبات وغیرہ وغیرہ۔

ان فطری خصائل کے دو پہلو ہیں ایک مثبت اور دوسرا منفی مختلف ارادوں اور خواہشات نیز ان کی خوبی و قباحت کے پیچھے یہی عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔

---

(۱) اشارہ ہے قرآن کی آیت:- أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتاً -- (سورہ حجرات ۱۲) کی طرف

(۲) اشارہ ہے امیرالمومنین علیؑ کے فرمان " اَلْكَذّابُ وَ الْمَيِّتُ سَوَاءٌ -- (شرح غررالحکم ج ۲ ص ۱۳۹) کی طرف جس کا ترجمہ یہ ہے جھوٹا شخص اور مردہ ایک جیسے ہیں۔

ان غرائز کی پہچان اور دوسری چیزوں سے ان کی اثر پذیری کے دائرے سے آگاہی ان کو کنٹرول کرنے کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اچھے اور برے اسباب و عوامل کی پہچان نیز بلند اہداف اور پست مقاصد کے درمیان فرق کی شناخت کا دارومدار خودشناسی پر ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کمال کی طرف رواں دواں ہو جبکہ اسے اس راہ میں کام آنے والے آلات و اوزار سے آگاہی نہ ہو، یا وہ ان کو صحیح راستے میں استعمال کرنے پر قادر نہ ہو؟

اس میدان میں سالکان و طالبان راہ حق کے لئے علم اخلاق ایک بہترین رہنما ہے۔ علم اخلاق ہمیں اقدار اور خوبیوں سے روشناس کراتاہے اور راستے کی رکاوٹوں سے آگاہ کرتاہے۔ مثال کے طور پر انسان کی ایک جبلی خصلت "حب نفس" ہے۔ حب نفس کا جذبہ بہت ساری سرگرمیوں کا سرچشمہ ہے۔ چونکہ انسان زندگی سے محبت کرتاہے اور زندہ رہنے کا خواہاں ہے لہذا وہ اس مقصد کے حصول کے لئے حتی المقدور کوشش کرتاہے۔ حب نفس کا جذبہ ہی تو ہے جو دشمن کے مقابلے میں انسان کو اپنی تمام قوت کے ساتھ اپنا دفاع کرنے پر آمادہ کرتاہے۔ بنابرین انسان کے اندر ان جبلی خصلتوں کی موجودگی عمل اور تحرک کا پیش خیمہ ہے۔

نکتہ

انسانی اہداف و مقاصد کی تشکیل کے اصلی عوامل در حقیقت باطنی عوامل ہیں اور یہ واضح ہے کہ باطنی عوامل دو طرح کے ہیں فطری اور اکتسابی۔

طبیعی عوامل سے مراد وہ خداداد جبلی صلاحیتیں اور قوتیں ہیں جو فطری طور پر انسان کے اندر رکھی گئی ہیں. لیکن اکتسابی عوامل سے مراد انسان کی وہ روحانی اور معنوی صفات و ملکات ہیں جو انسان کے مسلسل اختیاری عمل کے نتیجے میں اس کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ انسان کی تمام سرگرمیاں ان عوامل سے متاثر رہتی ہیں۔ یہ عوامل انسانی افعال اور حرکات کا پیشہ خیمہ ہیں۔ انہی عوامل کی بنیاد پر انسانی صلاحتیں منصہ مشہود پر آتی ہیں۔

نفس کی شناخت اور فطری خصائل و غرائز کی پہچان اور تزکیہ نفس پر تاکید انسانی اعمال و کردار اور ان کی کیفیت پر ان عوامل کے اثرات کی وجہ سے ہے۔ چونکہ نتیجے میں انسان کے اعمال و کردار اس کی روحانی و معنوی عمارت کی ساخت میں دخیل ہوتے ہیں۔ شکم پرست اور شہوت پرست انسان کے سامنے کھانے پینے اور شہوت رانی کے علاوہ کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس تربیت یافتہ اور خداپرست انسان کے وجود پر اللہ سے قربت اور اس کے بندوں کی خدمت کا جذبہ سایہ فگن ہوتاہے۔ ڈرپوک اور بزدل آدمی دشمن کے مقابلے میں راہ فرار اختیار کرنے یا سر تسلیم خم کرنے کو راہ نجات تصور کرتاہے لیکن دلیر اور شجاع آدمی دفاع اور استقامت کو اپنا مطمع نظر قرار دیتاہے. اس کی وجہ صرف باطنی و روحانی عوامل اور جبلی اوصاف کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ان میں سے جو عامل غالب آئے انسان کی لگام اسی کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

پس ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان کو تربیت دی جائے یعنی اسے آپ اپنی ذات کا مالک بنایا جائے تاکہ وہ عالم پر حکمرانی کرے نہ یہ کہ عالم اس پر حکمرانی کرے۔

جبلی قوتوں میں توازن پیدا کرنا۔

گذشتہ ابحاث کی روشنی میں یہ معلوم ہوگیاکہ جس طرح انسانی بدن کا کوئی عضو بے کار اور بے مقصد خلق نہیں ہوا اسی طرح انسانی روح کے اندر رکھی گئی جبلی و فطری خصائل اور خواہشات کا کردار بھی بنیادی نوعیت کا حامل ہے۔ لیکن اگر ان قوتوں کو صحیح رخ نہ دیا گیا اور مناسب طریقے سے ان کو کنٹرول نہیں کیا گیا تو یہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوں گی۔ ہم یہاں بطور نمونہ چند ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

★ ا۔ جنسی میلانات

انسان کے اندر اس سرکش اور نافرمان خواہش کی موجودگی (خاص کر جوانی کے ایام میں جو جذباتی بحران کا دور محسوب ہوتاہے) ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کیونکہ سرکش

خواہشات اور حیوانی رجحانات اسے شہوانی لذتوں اور ہوس بازی کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر انسان عقل اور ایمان کی طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے اوپر قابو نہ پا سکے اور ان تباہ کن خواہشات کو لگام نہ دے سکے تو وہ روحانی اور معنوی طور پر اس قدر پستی میں گر جاتا ہے کہ حیوانات سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی مثال خدا کی دیگر مخلوقات یعنی فرشتوں اور حیوانات کی طرح نہیں۔

چنانچہ امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنّ اللّٰہ خَصَّ الْمَلَکَ بالعَقل دونَ الشَّھْوَۃِ وَ الْغَضَبِ وَ خَصَّ الْحَیوانَاتِ بِھمَا دونه وَشَرَّفَ الِانْسَانَ باعْطَاء الجمیع فَاِنْ انْقَادتْ شَھْوَتُهُ وَ غَضَبُه لِعقله صَارَ اَفْضَلَ مِنَ الْمَلائِکَۃِ لِوُصُولِه اِلیٰ هذه المرتَبَۃِ مَعَ وُجُودَ الْمنَازعَ وَ الْمَلائِکَۃُ لَیْس لَھم مزاحم

یعنی اللہ نے فرشتوں کو صرف عقل دی ہے اور شہوت و غضب سے عاری رکھا ہے۔ حیوانات کو شہوت و غضب دیا ہے اور عقل سے محروم رکھا ہے لیکن انسان کو ان تمام چیزوں سے سرافراز فرمایا ہے لہٰذا اگر اس کا جذبۂ شہوت و غضب عقل کا تابع رہے تو انسان ان رکاوٹوں کے باوجود اس مرتبے تک [1] پہنچے گا اور فرشتوں سے بھی افضل قرار پائے گا کیونکہ فرشتوں کو کسی رکاوٹ کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ لیکن اگر انسان کی عقل شہوت کے آگے مغلوب ہو تو وہ حیوانات سے بھی پست تر ہو جائے گا۔

---

(۱) جامع السعادہ ج۱ ص ۳۴۔

* ٢۔ دولت جمع کرنا

انسان کی ایک اور صفت (جس پر قابو پانا ضروری ہے) مال سے محبت اور زر اندوزی کی خصلت ہے۔ قرآن اور احادیث میں مال و دولت کی تعریف کی گئی ہے اور انسان بھی ذاتی طور پر مال و دولت کو چاہتا ہے۔ یہ چاہت ایک حد تک ضروری اور مطلوب بھی ہے لیکن توجہ رکھنی چاہئے کہ اگر انسان حد سے زیادہ زر اندوزی اور مال جمع کرنے کی فکر میں لگ جائے تو اس کے نقصان دہ نتایج نکلیں گے۔ یہاں ہم مال و دولت کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کریں گے۔

مثبت پہلو

قرآن کریم میں مال و ثروت کو چند ایک مقامات پر خیر کے نام سے یاد کیا گیا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيراً الوصية للوالدين والاقربين بالمعروف حقا على المتقين [١]

(مسلمانو) تم کو حکم دیا جاتاہے کہ جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو اگر وہ کوئی خیر(مال) چھوڑے جارہاہو تو ماں باپ اور قرابت داروں کے لئے اچھی وصیت کرے جو کہ اللہ سے ڈرنے والوں پر ایک حق ہے۔

مرحوم علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

والمراد بالخير المال [٢]

خیر سے مراد مال ہے۔

---

(١) البقرہ / ١٧٩۔

(٢) تفسیر المیزان ج ١ ص ٤٤٩۔

وہ قرآن کی آیت:

"وانّہ لحبّ الخیرِ لشدیدٌ"[1]

وہ خیر سے شدید محبت رکھتا ہے۔

کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "الخیر، مال" یعنی خیر سے مراد مال ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ مال کو دنیا کی زینت کے نام سے یوں یاد فرماتا ہے:

المالُ والبنونَ زینۃُ الحیاۃِ الدنیا[2]

مال اور اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔

ایک اور آیت میں اللہ نے مال کو زندگی کا سہارا قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

وَلاَ تؤتُوا السُّفَھاءَ اَموَالَکُم الَّتیِ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُم قِیَاما[3]

اور اپنے وہ مال جن پر اللہ نے تمہاری زندگی کی گذر بسر قرار دی ہے بے وقوفوں کو نہ دے بیٹھو۔

خلاصہ یہ کہ اگر مال راہ حلال سے ہاتھ آئے اور حلال طریقے سے بندگان خدا کی خدمت کے لئے خرچ ہو تو یہ اسلام کی نظر میں مستحسن اور قابل قدر ہے۔

بقول شاعر

مال را کز بہر دین باشی حمول — نعم مال صالح خواندش رسول

آب در کشتی ہلاک کشتی است — آب اندر زیر کشتی پشتی است

یعنی اگر آپ کا مال دین کی خاطر ہو تو رسولؐ اللہ نے اسے سب سے بہترین مال کہا ہے اگر پانی کشتی کے اندر آجائے تو یہ کشتی کی تباہی کا باعث ہے لیکن اگر پانی کشتی کے نیچے رہے تو یہ اس کے لئے سہارا ہے۔

---

(۱) سورہ عادیات / ۸۔

(۲) سورۂ کہف / ۴۶۔

(۳) سورۂ نساء / ۵۔

مال و دولت کا منفی پہلو

دوسری جانب اللہ تعالی مال و دولت کو یاد خدا سے غفلت کا باعث قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

یاَ یُّھا الَّذِ یْنَ آمَنُوا لاَ تلھکم اَ مْوَ الُکم وَ لاَ اَ ولادکُمْ عَنْ ذِ کْرِ اللّٰہ (۱)

اے ایمان لانے والو تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تم کو خدا کی یاد سے غافل نہ کردے۔

اللہ تعالی سورہ توبہ میں مال جمع کرنے والوں کو (جو مال و دولت جمع کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے) خبردار فرماتا ہے اور ان کی جمع کردہ دولت کو قیامت کے دن ان پر عذاب کا باعث قرار دیتا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ الَّذیـنَ یَکْنِزُوْ نَ الذَّ ھبَ وَ الفِضَّـۃَ وَ لاَ یُنْفِقُونَھا فِیْ سَبیـل اللّٰہ فَبَشِّرْھُم بِعَذَ ابٍ اَ لیم یَـوْ مَ یُحْمیٰ عَلَیْھـا فِیْ نَارِ جَھَنَّـمَ فتُکْویٰ بِھَا جِباھُـم وَ جُنُوبُہُم وَ ظُھُورُ ھُمْ ھذا مَا کَنَزْ تُم لِاَ نْفُسِکُم فَذُ وقُوا مَا کُنْتُمَ تَکْنِزُوْنَ (۲)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے جاتے ہیں اور اس راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے تو (اے رسول) ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔ جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں گرم (اور لال) کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا) یہ وہ ہے جسے تم نے (دنیا میں) اپنے لئے جمع کر رکھا تھا۔ تو (اب) جمع کردہ (مال) کا مزا چکھو۔

اسی طرح احادیث میں بھی مال و دولت کی مذمت ہوئی ہے۔

---

(۱) سورہَ منافقون/ ۹۰۱۔

(۲) سورہَ توبہ /۳۵،۳۴۔

چنانچہ امیرالمومنین علیؑ فرماتے ہیں:

اَلْمَالُ مَادَّةُ الشَّهَوَاتِ

مال و دولت تمام نفسانی خواہشات کا سرچشمہ ہے۔

آپؑ نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا ہے:

اَلْمَالُ دَاعِيَةُ التَّعبِ و مطية النَّصَبِ

مال غموں کو دعوت دیتا ہے اور پریشانیوں کی سواری ہے۔

★ ۲۔ آرزوؤں کا بحر بیکراں:

انسان کی تمنائیں اور آرزوئیں اس کی زندگی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں چنانچہ اگر انسان اپنے مستقبل کے بارے میں نا امید ہو تو زندگی کی گاڑی رک جائے گی۔ بنابرایں قرآن کی آیات اور احادیث معصومینؑ میں آرزوؤں کو انسانی کوششوں اور سرگرمیوں کا محرک اور زندگی کا لازمی حصہ قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تمناؤں کو رحمت قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَلْاَمَلُ رحمَةٌ لِاُمَّتِی ولولا الامل مَا رَضَعَتْ وَالِدة ولدها ولا غَرس غارس شَجَرًا [1]

یعنی امید اور آرزو میری امت کے لئے باعث رحمت ہے اگر امید نہ ہوتی تو نہ کوئی ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتی اور نہ کوئی شخص زمین میں کوئی پودا لگاتا۔

آرزوؤں کا منفی پہلو

بعض احادیث میں آرزوؤں کو انسان کا دشمن اور اس کی بدبختی و ہلاکت کا باعث قرار دیا گیا ہے اور بعض احادیث میں آرزوؤں کو سراب کہا گیا ہے۔

---

(۱) سفینۃ البحار ج ۱ ص ۳۰۔

امیر المومنین علی علیہ السلام سے مروی ہے:

اَلْاَمَلُ کَالسَّرَابِ یَغُرُّ مَنْ رَاٰهُ وَ یُخْلِفُ مَنْ رَجَاهُ (۱)

یعنی آرزوؤں کی مثال سراب کی طرح ہے جس کا ظاہر دلفریب ہوتا ہے لیکن اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

اگر آرزوؤں اور امیدوں کا دائرہ حد سے بڑھ جائے اور انسان ہوا و ہوس کے ہاتھوں اسیر ہوجائے تو امیر المومنین علیہ السلام کے بقول انسان اپنی خواہشات کا حلقہ بگوش غلام بن جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

عبدُ الشَّهوَةِ اَسِیرٌ لَا یَنْفَکُّ اَسْرُهُ (۲)

یعنی شہوت کا غلام آدمی ایسا اسیر ہے جو قید سے رہائی حاصل نہیں کرسکتا۔

خلاصہ بحث

خلاصہ یہ کہ انسان کے اندر مختلف قسم کے میلانات پائے جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک انسانی زندگی کی بقاء کے لئے ضروری ہے۔ البتہ اس نکتے پر توجہ کی ضرورت ہے کہ اگر یہ میلانات حد سے تجاوز کر جائیں اور انسان ان کا غلام بن جائے تو یہ ایک قسم کی بت پرستی ہے جو بت پرستی کی تمام اقسام سے زیادہ خطرناک ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْهِ وَکِیْلًا (۳)

کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود قرار دی؟ کیا تم اس کے ذمہ دار ہوسکتے ہو (کہ وہ گمراہ نہ ہو)؟

---

(۱) سفینۃ البحار ج ا ص ۳۰۔

(۲) فہرست غرر الحکم ص ۱۸۷ نمبر ۴۳۰۰۔

(۳) سورۃ الفرقان / ۴۳۔

سب سے زیادہ گمراہ انسان وہ ہے جو اپنی خواہشات کو تعلیمات خداوندی کا تابع نہ بنائے۔ ارشاد ہوتا ہے:

(۱)
وَ مَنْ اَضَلُّ ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ ....

اس شخص سے زیادہ گمراہ اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرف سے کسی قسم کی رہنمائی کے بغیر اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتا ہے؟

یاد رہے کہ نفسانی خواہشات کی اطاعت کا نتیجہ ضلالت و گمراہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ قرآن میں مذکور ہے:

وَ لاَ تَتَّبعِ الْھَوٰیٰ فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۲)

خواہشات نفسانی کی اطاعت نہ کرو ورنہ وہ تجھے راہ خدا سے منحرف کردیں گی۔

فطری میلانات میں توازن پیدا کرنے میں اخلاق کا کردار

جن فطری میلانات اور جبلی رجحانات کا ہم نے تذکرہ کیا وہ بطور نمونہ تھے۔ جیسا کہ ہم عرض کرچکے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو فطری میلانات اور قوتیں رکھی ہیں وہ بذات خود بری نہیں البتہ ان کو سرکشی کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوچکا کہ علم اخلاق وہ علم ہے جو انسان کے فطری میلانات کو کنٹرول کرنے اور ان کو صحیح سمت میں لے آنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ بطور مثال حب ذات کا جذبہ حیات انسانی کی بقاء کے لے ضروری ہے لیکن علم اخلاق کہتا ہے کہ حب ذات کی ایک حد ہونی چاہیئے۔

اگر یہ جذبہ حد سے تجاوز کر جائے تو انسان خود بینی اور غرور و تکبر کا شکار ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہر چیز کو صرف اس کا تابع اور خدمتگار ہونا چاہیئے۔ یہاں اس کا حب ذات سرکشی اور تکبر کی حد تک پہنچنے لگتا ہے جو شیاطین اور نافرمانوں کا وطیرہ ہے اسلام نے اس قسم کے حب ذات کی مذمت اور نفی کی ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ ریاضت اور عبادت کے ذریعے اس جذبے میں توازن پیدا کرے۔

---

(۱) سورہ قصص/۵۰۔ (۲) سورہ قصص/۲۶۔

علم اخلاق حقیقی اقدار اور اصولوں کو واضح اور زندہ کرتے ہوئے انسان کو اس بات سے روشناس کراتا ہے کہ مذکورہ جذبے سے کس طرح مثبت انداز میں کام لیا جائے نیز کس طرح فطری میلانات و خواہشات کو لگام دیتے ہوئے ان کو سرکشی سے روکا جائے اور ان کا رخ حقیقی ہدف کی طرف موڑا جائے۔

فطری خواہشات میں توازن ضروری ہے جبکہ انہیں دبانا غلط ہے

بعض ادیان ومذاہب کے پیروکاروں کا نظریہ ہے کہ منزل کمال تک پہنچنے کے لئے خواہشات کی مکمل بیخ کنی ہونی چاہیئے۔ لیکن اسلام کہتا ہے کہ فطری خواہشات کو ایک حد کے اندر رکھنا چاہیئے کیونکہ فطری میلانات و خواہشات خاص طور پر جنسی خواہشات کو مکمل ماردینا بہت سے خطرات اور نقصانات کے وجود میں آنے کا باعث بنتا ہے۔ اگر فطری خواہشات و میلانات کا مکمل خاتمہ اور ان کی سو فیصد مخالفت اچھی بات ہوتی تو خدائے حکیم ان کو خلق ہی نہ فرماتا ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی نے کائنات کی کوئی چیز بے مقصد خلق نہیں فرمائی۔ اگر ہم کسی چیز کی خلقت کے فلسفے سے آگاہ نہ ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ نے اسے بے مقصد خلق کیا ہے۔

بقول شاعر

درین پردہ یک رشتہ بیکار نیست — سر رشتہ بر ما پدیدار نیست
نہ زین رشتہ سر میتوان تافتن — نہ سر رشتہ را میتوان یافتن

مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی چیز بے ہدف اور بیکار نہیں اگر چہ ہم کائنات کے اسرار سے مکمل آگاہی نہیں رکھتے ہم نہ ان حقایق سے سر تابی کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو مکمل طور پر درک کر سکتے ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:

"الَّذِیٓ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ" (۱)

اللہ وہ ہے جس نے ہر چیز کو اچھے طریقے سے خلق فرمایا ہے۔

---

(۱) سورہ السجدہ/ ۷۔

بہر حال اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ نفس امارہ انسان کو برے کاموں کی ترغیب دیتا ہے چنانچہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کا یہ قول نقل کرتا ہے:

وَ مَا اُبَرِّیٔ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ .... (۱)

میں ہرگز اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا کیونکہ نفس برابر برائی کی طرف ابھارتا رہتا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم فرمائے (اور گناہ سے بچائے)۔

امیر المومنین علی علیہ السلام اس بارے میں یوں فرماتے ہیں:

"اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ وَ الْفَحْشَاءِ فَمَنْ ائْتَمَنَهَا خَانَتْهُ وَ مَنْ اسْتَنَامَ اِلَیْهَا اَهْلَكَتْهُ وَ مَنْ رَضِیَ عَنْهَا اَوْرَدَتْهُ شَرَّ الْمَوَارِدِ (۲)

بہ تحقیق نفس برائیوں پر بہت زیادہ ابھارتا ہے پس جو شخص نفس پر اعتماد کرے نفس اس کو دھوکہ دیتا ہے اور جو اس سے مطمئن ہوجائے اسے ہلاک کردیتا ہے اور جو شخص اس سے راضی ہو وہ اسے بدترین مقام (جہنم) تک پہنچاتا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود انسان کے عزم، ارادے اختیار اور انتخاب کی قوت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کیونکہ اگر قرآن ایک مقام پر نفس کو "اَمَّارَہ بِالسُّوْء" برائیوں پر زیادہ ابھارنے والے کے نام سے یاد کرتا ہے تو دوسرے مقام پر اسے "لَوَّامَة" (ملامت کرنے والا) کہتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ

قسم ہے روز قیامت کی اور قسم ہے نفس لوامہ (ملامت کرنے والے نفس) کی۔

ایک اور مقام پر اسے نفس مطمئنہ کے نام سے پکارتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (۳)

اے نفس مطمئنہ اپنے پروردگار کی طرف اس حالت میں پلٹ جاؤ کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے۔

---

(۱) سورہ یوسف/ ۵۳۔ (۲) فہرست غرر الحکم ص ۹۱ نمبر ۳۴۹۱۔ (۳) سورہ فجر، ۲۷-۲۸

یاد رہے کہ یہ مرحلہ (مرحلۂ اطمینان) وہ ہے جس میں انسان کے سرکش میلانات اس کے عزم و ارادے کے سامنے مغلوب و مقہور ہوجاتے ہیں۔ یہ بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ اگر انسان چاہے تو وہ اپنے نفس پر غلبہ پا سکتا ہے۔ اصولی طور پر دوسری مخلوقات پر انسان کی برتری کا راز اور اس کا طرۂ امتیاز ہی یہی ہے کہ وہ انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہے نیز انسان ثواب و عقاب یا تعریف و ملامت کا مستحق اسی لئے ٹھہرتا ہے کہ وہ اچھے کام انجام دینے پر بھی قادر ہے اور برے کام انجام دینے پر بھی اگر اچھے کاموں پر اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور برے کاموں پر اس کی ملامت تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ارادوں میں خود مختار اور آزاد ہے۔

نکتہ:

اب جب ہماری بحث کا سلسلہ یہاں تک پہنچ چکا تو یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انسان اپنا تزکیہ کیونکر کر سکتا ہے؟ اور اسے کہاں سے اس کام کی ابتداء کرنی چاہیئے؟ پہلے سوال کے جواب میں درج ذیل بنیادی نکات پر توجہ کی ضرورت ہے:

۱۔ جس طرح جسمانی صحت و سلامتی کے لئے ورزش اور مشق کی ضرورت ہے اسی طرح تزکیہ نفس اور خودسازی کے لئے بھی ریاضت اور نفس کے ساتھ مسلسل جہاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریاضت اور مسلسل مشق کے بغیر انسان کسی مقام تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا ہے دوسرے لفظوں میں راہ حقیقت کے سالک کو چاہیئے کہ وہ سختیوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے کمر ہمت کس کر باندھ لے کیونکہ مشکلات کا مقابلہ کئے بغیر عظیم مقاصد حاصل نہیں ہوسکتے۔ وہی شخص زندگی کا معرکہ سر کرسکتا ہے جو خوب محنت کرے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے:

اَلبَلاءُ لِلوَلاءِ

یعنی آزمایش دوستی کا خاصہ ہے۔

۲ ۔ جسطرح جسمانی ورزش کی ابتداء آسان ورزشوں سے ہوتی ہے اور بتدریج اس میں اضافہ ہوتا جاتاہے اسی طرح تزکیہ نفس کے لئے بھی آسان چیزوں سے ابتداء کرنی چاہیئے اور بتدریج اگلے مراحل کی طرف بڑھنا چاہیئے۔

۳ ۔ جس طرح جسمانی ورزش میں تسلسل اور تداوم ضروری ہے اسی طرح روحانی و معنوی ریاضت کے لئے بھی جہد مسلسل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ خداوند تبارک وتعالی فرماتاہے:

اِنَّ الّذین قالُوا ربُّنا اللّٰہ ثُـمَّ اَ سْتَقامُوا تَتَنزَّ لُ عَلَیہِـمُ المَلائِکَۃُ اَ لاَّ تَخافُـوا وَ لاَ تحزنُـوا ......(۱)

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر استقامت اختیار کرتے ہیں ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں۔ ڈرنے اور غم کھانے کی ضرورت نہیں۔

نیز ارشاد الہی ہے:

(۲) اِلاّ المُـصَلّیـنَ الَّذیـنَ هُـمْ عَلـیٰ صَلَاتَہِـمْ دَ ائمُـوْ ن ....

(لوگ حریص اور بے صبر ہیں) سوائے نماز پڑھنے والوں کے جو پابندی کے ساتھ ہمیشہ نماز بجا لاتے ہیں۔

امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے:

قَلیْـلُ مَـدوم عَلَیـہِ خَیْـرُ مِـنْ کَثیـر مَمْلـول مَنْـهُ (۳)

وہ تھوڑا کام جس پر مداومت کی جائے اس کام سے بہتر ہے جو زیادہ ہو لیکن آدمی اس سے اکتا جائے۔

بقول شاعر

"رہرو آن است کہ آہستہ و پیوستہ رود"

یعنی حقیقی رہرو وہ ہے جو آہستہ لیکن ہمیشہ چلتا رہے۔

---

(۱) سورہ فصلت / ۳۰۔

(۲) سورہ معارج / ۲۲۔ (۳) نہج البلاغہ صبحی صالح حکمت نمبر ۴۴۴۔

امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

وَ اقْتَصِدْ یا بُنَیَّ مَعِیْشَتِکَ وَ اقْتَصِدْ فِی عِبَادَتِکَ وَ عَلَیْکَ بِالْاَمْرِ الدَّائِمِ الَّذی تُطِیقُہ[1]

اے میرے بیٹے (حسنؑ) اپنی زندگی اور عبادت کے معاملے میں میانہ روی اختیار کرو اور اس کام کو انجام دو جسے تم مداومت کے ساتھ انجام دے سکو۔

ایک اور حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

اَحَبُّ الْاَعْمالِ اِلَی اللہ عَزَّوَجَلَّ مَا دَاوَمَ عَلَیْہِ الْعَبْدُ وَاِنْ قَلَّ[2]

اللہ کے نزدیک سب سے محبوب عمل وہ ہے جسے بندہ ہمیشہ بجالائے اگرچہ وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔

بعض احادیث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ "مداومت" کی کمترین مدت ایک سال ہے۔

امام صادق علیہ السلام کا فرمان ہے:

اِذَا کَانَ الرَّجُلُ عَلَی عَمَلٍ فَلْیَدُمْ عَلَیْہِ سَنَۃً[3]

جب انسان کسی کام کو شروع کرے تو ایک سال تک اس پر مداومت کرنی چاہیئے۔

۴۔ جس طرح جسمانی سلامتی کے لئے فعل اور ترک فعل (علاج اور پرہیز) دونوں کا ساتھ ہونا ضروری ہے اسی طرح روح کی سلامتی اور تزکیہ نفس کے لئے فعل اور ترک دونوں کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر واجبات کی بجا آوری اور ترک محرمات یا تولیٰ و تبریٰ یا مستحبات کی بجا آوری اور مکروہات کو ترک کرنا وغیرہ وغیرہ۔

---

(۱) بحار الانوار ج ۶۸ ص ۲۱۴۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۸۲ باب استواء العمل والمداومۃ علیہ۔

(۳) سابقہ ماخذ کی طرف رجوع ہو۔

بعض کاموں کو انجام دینا اور بعض امور کی انجام دہی سے احتراز کا سلسلہ تمام مراحل میں جاری و ساری رہنا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوگا جو لوگ اچھے برے اور صالح وطالح کو آپس میں ملالیتے ہیں وہ کسی مقام تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے چنانچہ ارشاد الھی ہے

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (۱)

اللہ فقط صاحبان تقوی کے اعمال کو قبول فرماتا ہے۔

۵۔ سب سے اہم چیز جس کی رعایت ہر حال اور ہر مرحلے میں ضروری ہے حضور قلب اور اخلاص ہے جس طرح جسمانی ورزشوں میں انسانی عزم و ارادے کا ارتکاز موثر ہے اسی طرح شرعی عبادات اور روحانی ریاضتوں میں بھی ارادے کا ارتکاز اور خلوص نیت بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالی قرآن کریم میں اس نکتے پر بار بار زور دیتا ہے کہ دین و عبادت کے لیے اخلاص ضروری ہے ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ .... (۱)

ان کو سوائے اس کے کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ کمال اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں۔

نتیجہ بحث

نیت اور ارادہ انسان کی شخصیت کا آئینہ دار اور دوسرے جانداروں کے مقابلے میں اس کا طرہ امتیاز ہے مقام حقیقت اور بلند مقصد تک رسائی کا واحد اور بہترین راستہ اخلاص ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (۲)

ہر چیز کی بازگشت تیرے پروردگار کی طرف ہے۔

ہر چیز خواہ ناخواہ اسی کی طرف رواں دواں ہے۔

---

(۱) سورہ بینہ/۵۔ (۲) سورہ نجم/۴۲۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

یاَیُّھَا الاِ نسَانُ اِ نَّکَ کَادِ حُ اِلیٰ رَبِّکَ کَدْ حاً فَمُلاَ قِیہ [1]

اے انسان تمہیں اپنے رب کی طرف جانا ہے اور اس سے ملاقات کرنا ہی پڑے گی۔

البتہ یہ ملاقات اس وقت مفید ہے جب اللہ کے ساتھ عشق اور اخلاص موجود ہو دوسرے لفظوں میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اللہ کی طرف سفر رضا اور رغبت کے ساتھ انجام پائے۔ قرآن کریم کی آیت "وَ مَا تَشاؤونَ اِ لاَّ انْ یَّشاء اللهُ ربُّ العالمین" [2] کے مطابق ہمیں چاہیئے کہ اللہ کی رضا کے علاوہ کسی چیز کی جستجو نہ کریں اور اس کی مشیت اور پسند سے ہٹ کر کسی چیز کا تصور ہی نہ کریں نیز اس سے ملاقات کے شوق میں ہی جدائی کے غم کو برداشت کرلیں۔ اگر ہم اس مرحلے میں ثابت قدم اور خطرات سے محفوظ رہیں تو ولایت و کرامت کی منزل تک رسائی ہوگی اس صورت میں یہ بات ممکن ہے کہ ہم ایسے امور کا مشاہدہ کریں اور ایسے کام انجام دیں جو بعض لوگوں کے لئے ناقابل قبول، بعض لوگوں کے لئے حیرت انگیز اور کچھ لوگوں کے لئے رہنمائی و بیداری کا باعث ہوں۔ اگر اس مرحلے میں اللہ کا لطف و کرم شامل حال ہوجائے تو حجاب اور پردے ایک ایک کرکے ہٹتے جائیں گے۔ اور انوار الھیہ سے سالک کے سامنے حقیقت کے راستے روشن ہوتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ وہ فنافی اللہ کے مرحلے میں داخل ہوجائے گا۔ یعنی وہ اللہ کے سوا ہر چیز سے دوری اختیار کرلیتا ہے اور آخر کار "محو و صحو" کے مقام تک رسائی حاصل کر لیتا ہے یعنی وہ جمال و جلال پروردگار میں محو ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتا یوں وہ بذات خود پروردگار کی صفات جمال و جلال کا مظہر بن جاتا ہے۔ اور اپنی روح کی گہرائیوں میں اللہ کے علاوہ کسی قسم کی ابتداء و انتہاء یا کسی ظاہر و باطن کا مشاہدہ نہیں کرتا۔

---

(۱) سورہ انشقاق/۶۔ (۲) سورہ تکویر/۲۹۔

دوسرے لفظوں میں قرآن کی آیت کریمہ "ھو الاول و الآخر والظاھر و الباطن" (۱) (اول و آخر اور ظاہر و باطن وہی ہے) کا مفہوم اس کے پورے وجود کو گھیر لیتا ہے اور وہ پورے عالم کو حق تعالیٰ کی صفات واسماء کا مظہر اور جولانگاہ دیکھتا ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

(۲)
...... فَاَینَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجهُ اللّٰہِ ....

تم جس طرف رخ کروگے وہاں وجہ اللہ ہے۔

باباطاہر ہمدانی کے بقول

به صحرا بنگرم صحرا ته وینم　　　به دریا بنگرم دریا ته وینم

به هر جا بنگرم کوه و در و دشت　　　نشان از قامت رعنای ته وینم

میں صحرا کو دیکھتا ہوں تو مجھے تو نظر آتا ہے اور جب سمندر کو دیکھتا ہوں تو بھی تیرا مشاہدہ ہوتا ہے۔ میں پہاڑ کو دیکھوں یا دشت و صحرا ہر جگہ تیری قامت رعنا کے نشانات نظر آتے ہیں۔

---

(۱) سورہ حدید / ۳۔

(۲) سورہ البقرہ / ۱۱۰۔

ابتدا کے نقطے:

اب ہماری بحث اس مرحلے میں پہنچ چکی ہے کہ ہم اپنی بحث کے دوسرے حصے (یعنی شروع کے مراحل) کا ذکر کریں۔ اس بحث کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ہم یہاں اہم نقاط کی فہرست کی طرف اشارہ کرتے چلیں گے۔

* ۱۔ معرفت نفس (خودشناسی اور خداشناسی)۔
* ۲۔ بیداری (خودآگاہی اور احساس ذمہ داری)۔
* ۳۔ تذکر (خدا کی یاد)۔
* ۴۔ تفکر و تدبر (نفس و آفاق کی سیر)۔
* ۵۔ الحب و البغض فی اللہ (تولی و تبری)۔
* ٦۔ شریعت اور احکام شریعت کا علم۔
* ۷۔ مخلص دوست کا انتخاب اور برے لوگوں سے اجتناب۔
* ۸۔ محرمات سے اجتناب (گناہوں سے دوری)۔
* ۹۔ توبہ و استغفار۔
* ۱۰۔ فرایض اور واجبات کو انجام دینا۔
* ۱۱۔ نوافل اور مستحبات کو انجام دینا اور مکروہات کو ترک کرنا۔
* ۱۲۔ مرابطہ، مراقبہ، محاسبہ اور معاتبہ۔
* ۱۳۔ نیّت و اخلاص، نیز شرک و ریا اور نفاق سے پرہیز۔
* ۱۴۔ ریاضت اور نفس کے ساتھ جہاد۔
* ۱۵۔ نظم و ضبط اور نظام الاوقات۔
* ۱٦۔ فرصتوں کو غنیمت سمجھنا۔
* ۱۷۔ بندگان خدا کی خدمت۔
* ۱۸۔ خدا پر توکل اور اعتماد۔

★ ۱۹۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک۔

★ ۲۰۔ زہد۔

★ ۲۱۔ قناعت۔

★۲۲۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں دینی آداب و رسوم کی پابندی

ان نقاط میں سے ہر ایک بذات خود کئی مراحل و مراتب کا حامل ہے۔ نیز مختلف افراد و اشخاص اور حالات کی مناسبت سے شدت و ضعف کے مختلف درجات پر مشتمل ہیں۔ لیکن اس بات تشریح کی یہاں ممکن نہیں۔

اجمالی طور پر یہ جان لینا ضروری ہے کہ واجبات محرمات، مکروہات، مستحبات اور مباحات کے مصادیق ہر کسی کے لئے یکساں نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک عمل کسی شخص کے لئے مستحب ہو لیکن دوسرے کے لئے واجب مثلاً نماز تہجد، اور شب بیداری عام لوگوں کے لئے مستحب موکد ہے جبکہ رسول اللہؐ کے لئے یہ امر واجب تھا۔

پہلا نکتہ

خودشناسی

اور خداشناسی

(معرفت نفس)

علم اخلاق کے ماہرین کے نزدیک اس علم کا اصلی ہدف اور مقصد تزکیہ نفس اور انسان کی خوش بختی و سعادت ہے اس ہدف تک رسائی خودشناسی کے بغیر ممکن نہیں۔ بنابرین ہم آپ کی توجہ اسلام کی نظر میں اس موضوع کی اہمیت کی جانب مبذول کراتے ہیں لیکن اصل گفتگو سے پہلے اس سوال کا جائزہ بھی لیتے ہیں کہ وہ کونسا نفس ہے جس کی شناخت، تزکیہ و اصلاح نفس کا پیش خیمہ اور خداوند متعال کی شناخت کا وسیلہ ہے؟

★ـ کیا اس سے مراد وہی نفخہ الھیہ (اشارہ ہے نفخت فیہ من روحی کی طرف) ہے جو فرشتوں پر انسان کی برتری کا باعث ہے۔ جسے روح اللہ کہتے ہیں؟

★ـ یا اس سے مراد وہ نفس ملھمہ (جس پر الہام ہو) ہے کہ جس کی اللہ نے قسم کھائی اور اسے الہام کے ذریعے فجور و تقوی سے آشنا کیا؟

★ـ یا اس سے مراد وہ نفس امارہ ہے جو انسان کو ہمیشہ بدی کی ترغیب دیتا ہے؟

★ ۔ یا اس سے مراد نفس لوامہ (ملامت کرنے والا نفس) ہے جو انسان کو برائی سے روکتا اور بدکردار انسان کی ملامت کرتا ہے ؟

★ ۔ یا اس سے مراد وہ نفس مطمئنہ ہے جسے اللہ نے " اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً "[1] کے خطاب سے نوازا ہے ؟

★ ۔ یا اس سے مراد نفس فانیہ ہے جو آخر کار موت سے ہمکنار ہوتا ہے ؟

یا اس سے مراد وہ فطرت خداوندی ہے جس پر اللہ نے انسان کو خلق فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ کون سا نفس ہے جس کی شناخت کا لازمہ اللہ کی شناخت ہے ؟

جواب

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نفس سے مراد یہ سب ہیں یعنی وہ مجموعہ جو انسان کی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے اور اسے عالم ناسوت و عالم ملکوت کا جامع نیز عالم غیب و عالم شہود کا حامل بنا دیتا ہے۔

انسان کا نفس اس کے ملکوتی پہلو کے پیش نظر نغمہَ خداوندی ہے جو اپنے ارتقائی سفر کے ذریعے نفس مطمئنہ ، نفس راضیہ اور نفس مرضیہ کے مرحلے تک جا پہنچتا ہے اور اس حد تک چلا جاتا ہے کہ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کی منزل کو چھو لیتا ہے۔

چنانچہ قرآن فرماتا ہے :

ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی[2]

پھر وہ نزدیک ہوا اور بہت ہی قریب یہاں تک کہ (بطور تمثیل) وہ دو کمانوں کے فاصلے کے برابر یا اس سے بھی زیادہ نزدیک جا پہنچا۔

---

(۱) سورۃ المائدہ/۲۷۔

(۲) سورہ نجم/۸۔۹۔

لیکن اپنی ناسوتی خصوصیت کی بناء پر اس حد تک گر جاتاہے کہ ارشاد ہوتاہے:

اولٰئِکَ کَالْاَنعَام بَلْ ھُمْ اَضَلّ (۱)

وہ چارپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی گمراہ تر ہیں۔

نیز وہ اس قدر تنزل کر جاتاہے کہ اللہ فرماتاہے:

ثُمَّ رَدَدْنَاہُ اَسْفَلَ سَافِلِینَ (۲)

پھر ہم نے اس سب سے نچلی منزل کی طرف لوٹا دیا۔

خلاصہ یہ کہ یہ مجموعہ وجود جو بظاہر چھوٹا ہے در حقیقت اس قدر عظیم اور وسیع ہے اس نے تمام کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیاہے۔

خودشناسی کے متعلق احادیث

جیسا کہ ہم آپ کے گوش گزار کر چکے ہیں خودشناسی اور معرفت نفس کی اہمیت کے بارے میں ائمہ معصومین علیہم السلام کے فرمودات میں قابل توجہ اور حیرت انگیز الفاظ اور جملے دیکھتے میں آتے ہیں۔

یہاں ہم ان میں سے بعض کو ذکر کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ سلم نے فرمایا:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہُ (۳)

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

---

(۱) سورہ الاعراف/ ۱۷۹۔

(۲) سورہ التین/ ۵۔

(۳) المحجۃ البیضاء ج ۱ ص ۶۸۔

امام علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

اَفْضَلُ الْمَعرِفَۃ مَعْرِفَۃُ الْاِنْسانِ نَفْسَہٗ (۲)

سب سے بہترین معرفت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو پہچان لے۔

اسی وجہ سے امیر المومنین علی علیہ السلام نے ان لوگوں کے انجام کو قطعی ہلاکت قرار دیا ہے جو اس وادی میں قدم رکھتے ہیں لیکن خودشناسی کی کوشش نہیں کرتے آپؑ نے فرمایا

هَلَکَ اِمْرُؤٌ لَمْ یَعْرِفْ قَدْرَہٗ

وہ شخص ہلاک ہوا جس نے اپنی قدر و قیمت نہیں پہچانی۔ (۳)

ایک اور مقام پر امام علی علیہ السلام خودشناسی کے مسئلے پر توجہ نہ دینے کو ضلالت اور گمراہی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

مَنْ لَم یَعْرِفْ نَفْسَہٗ بَعُدَ عَنْ سَبِیْلِ النَّجَاۃِ وَ خَبَطَ فِی الضَّلَالِ وَالجھالات (۴)

جو شخص اپنے آپ کو نہیں پہچانتا وہ نجات کے راستے سے دور اور گمراہی و جہالت کی وادی میں غرق ہوتا ہے۔

بنابراین جو شخص خودشناسی کی کوشش نہیں کرتا اور اس مسئلے پر کوئی توجہ نہیں دیتا گویا اسے اپنی قدر و قیمت کا کوئی علم نہیں۔ مولانا رومی کے بقول وہ اپنے آپ کو سستے داموں بیچ دیتا ہے وہ کہتے ہیں:

خویشتن نشناخت مسکین آدمی — از فزونی آمد و شد در کمی

خویشتن را آدمی ارزان فروخت — بود اطلس خویش بر دلقی بدوخت

بے چارے انسان نے اپنی حقیقت نہیں پہچانی وہ بلندی سے آیا تھا لیکن پستی کا شکار ہو گیا۔ انسان نے اپنے آپ کو سستے داموں فروخت کر دیا۔ اس کی مثال اس مخمل کی سی تھی جو ٹاٹ میں بطور پیوند لگ گیا۔

---

(۱) سورہ الفجر / ۳۰۔

(۲) فہرست غرر ص ۳۸۷۔

(۳) نہج البلاغہ صبحی صالح حکمت نمبر ۱۴۹۔

(۴) فہرست موضوعی غرر ص ۳۸۷۔

دوسرا نکتہ

خود آگاہی اور

احساس ذمہ داری

(بیداری)

سالک راہ حق کی دوسری اہم ذمہ داری بیداری ہے یعنی خواب غفلت سے بیداری اور اس ذمہ داری کا احساس کہ اس عظیم کائنات میں انسان کی تخلیق بے مقصد اور عبث نہیں جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے :

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (۱)

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے مقصد خلق کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف نہیں پلٹائے جاؤ گے ؟

بہت سارے لوگ مرتے دم تک خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتے۔

چنانچہ حدیث میں مذکور ہے :

النَّاسُ نِيَامٌ إِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوا (۲)

لوگ خواب غفلت میں غوطہ ور ہیں جب مریں گے تب بیدار ہوں گے۔

---

(۱) سورہ المومنون / ۱۱۵۔

(۲) لئالی الاخبار۔ ص۳۸۶۔

لیکن اس بیداری کا کیا فائدہ ؟ موت کے بعد والی بیداری صرف حسرت و ندامت کا موجب ہوگی . اللہ نے بھی انسان کو اس دن سے ڈرایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ هُمْ فِي غَفْلَةٍ .... (۱)

ان کو حسرت والے دن سے ڈراؤ جب پانی سر سے گزر چکا ہوگا اور وہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں .

ایک اور مقام پر ارشاد ہے :

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (۲)

ہلاکت ہو جھوٹے لوگوں پر جو غفلت و جہالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

نیز فرمایا :

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَا اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ (۳)

اے ایمان لانے والو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں یاد خدا سے غافل کردے اور جو ایسا کرے گا تو وہی گھاٹے میں رہے گا.

امیر المومنین علی علیہ السلام وعظ و نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

اَمَا مِنْ دَائِكَ بُلُولٌ اَمْ لَيْسَ مِنْ نَوْمِكَ يَقْظَةٌ ...... وَ كَيْفَ لَا يُوقِظُكَ خَوْفُ بَيَاتِ نِقْمَةٍ وَ قَدْ تَوَرَّطْتَ بِمَعَاصِيهِ مَدَارِجَ سَطَوَاتِهِ فَتَدَاوَ مِنْ دَاءِ الْفَتْرَةِ فِي قَلْبِكَ بِعَزِيمَةٍ وَ مِنْ كَرَى الْغَفْلَةِ فِي نَاظِرِكَ بِيَقْظَةٍ (۴)

---

(۱) سورہ مریم / ۳۹۔

(۲) سورہ الزاریات / ۱۰-۱۱۔

(۳) سورہ المنافقون ۹۔

(۴) نہج البلاغہ فیض الاسلام خطبہ ۲۱۴ (ترجمہ مفتی جعفر حسین خطبہ نمبر ۲۲۰)۔

کیا تیرے مرض کے لئے شفا اور تیرے خواب غفلت کے لئے بیداری نہیں ہے ؟ رات ہی کو عذاب الہی کے ڈیرے ڈالے رہنے کا خطرہ تجھے بیدار کیوں نہیں رکھتا ؟ حالانکہ تو اپنے گناہوں کی بدولت اس کے قہر و غضب کی راہ میں پڑا ہوا ہے۔ دل کی کوتاہیوں کے روگ کا چارہ عزم راسخ سے اور آنکھوں کے خواب غفلت کا مداوا بیداری سے کرو۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :

فَاسْتَصْبَحُوا بِنُورِ يَقْظَةٍ فِي الْاَبْصَارِ وَالْاَسْمَاعِ وَ الْاَفْئِدَةِ يَذْكُرُوْنَ بِاَيَّامِ اللّٰهِ (۱)

انہوں نے اپنی آنکھوں، کانوں اور دلوں میں بیداری کے نور سے ہدایت و بصیرت کے چراغ روشن کئے وہ مخصوص یاد رکھنے کے قابل دنوں کی یاد کرتے ہیں۔ (یعنی وہ سراپا بیداری اور ہوشیاری کی تصویر ہیں اور خدائی دنوں کو فراموش نہیں کرتے)۔

آپؑ نے یہ بھی فرمایا ہے :

اَلْيَقْظَةُ نُورٌ، اَلْيَقْظَةُ اسْتِبْصَارٌ التَّيَقُّظُ فِي الدِّينِ نِعْمَةٌ عَلَى مَنْ رَزَقَهُ (۲)

بیداری روشنی ہے۔ بیداری بینائی و بصیرت ہے دین کے بارے میں بیداری و آگاہی اس شخص کے لئے ایک نعمت ہے جسے یہ بیداری عطا ہوئی ہو۔

---

(۱) نہج البلاغہ فیض الاسلام خطبہ ۲۱۴ (ترجمہ مفتی جعفر حسین خطبہ نمبر ۲۲۰)۔
(۲) نہج البلاغہ فیض الاسلام خطبہ ۲۱۳ (ترجمہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۱۹)۔
(۳) فہرست موضوعی غرر ص ۴۳۱۔

تیسرا نکتہ

خدا کی یاد

(تذکر)

ذکر سے مراد یہ ہے کہ انسان ہمیشہ خدا کو یاد کرے، اسے پیش نظر رکھے اور اللہ کے سامنے اپنی بندگی اور بندوں والی ذمہ داری کو فراموش نہ کرے کیونکہ جو شخص بھی اللہ کو فراموش کرے وہ خود فراموشی میں مبتلا ہوتا ہے یعنی وہ اپنے وجود سے بیگانہ ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے:

وَ لاَ تَکُونُوا کَالَّذِینَ نَسُوااللهَ فَاَنسٰیهُم اَنفُسَهُم (۱)

اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا جس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو بھلا بیٹھے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان لِلّذکر لاَ هلاً اخذوهُ مِن الدنیَا بَدلاً فَلَمْ تَشْغَلْهُمْ تِجارة و لا بَیْع عَنْه (۲)

بہ تحقیق یاد خدا کے کچھ اہل افراد ہیں جنہوں نے دنیا کے بدلے اسے اختیار کیا ہے وہ کسی قسم کی تجارت یا خرید و فروش کے باعث خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے۔

آپؑ رسول اللہؐ کے پیروکاروں اور اہل بیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

...... اذا ذُکِرَ اللهُ هَمَلَتْ اَعْیُنُهُمْ حَتّٰی، تَبلَّ جُیُوبُهُمْ وَ مَادُوا کَما یُمِیدُ الشَّجَرُ یَومَ الْعَاصِفِ خَوْفاً مِنَ الْعِقَابِ وَ رجَآءً لِلثَّوَابِ (۱)

جب اللہ کا نام لیا جاتا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے یہاں تک کہ ان کے گریبان آنسوؤں سے تر ہو جاتے تھے۔ اور وہ اس طرح سے کانپتے اور لرزتے رہتے جس طرح بید کا درخت تند و تیز ہوا کے باعث لرزتا ہے۔ یہ سب کچھ عذاب کے خوف اور ثواب کی امید کے باعث تھا۔

---

(۱) سورہ حشر/۱۹۔ (۲) نہج البلاغۃ صبحی صالح خطبہ ۲۲۔ (۳) ایضا خطبہ ۹۷۔

چوتھا نکتہ

تذکر اور تفکر

(انفس و آفاق کی سیر)

تذکر اور تفکر کے مختلف مراحل ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں کبھی تذکر تفکر کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے اور گاہے تفکر، تذکر کی راہ ہموار کرتا ہے انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے گردو پیش کے حالات سے استفادہ کرے تا کہ وہ نئی اور زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکے دوسرے لفظوں میں اسے چاہیئے کہ اپنی فکر سے کام لے اور خاموشی اور سکوت کے دائرے سے نکل کر سرگرم عمل ہو۔ تفکر انسان کو محسوسات کے مرحلے سے نکال کر تعقل کے مرحلہ میں پہنچا دیتا ہے اور حیوانیت کے پست مرتبے سے اٹھاکر انسانیت کی اعلیٰ منزل پر فائز کر دیتا ہے تفکر انسان کی ماوراء الطبیعی روح کو بیدار اور محو پرواز کر دیتا ہے۔ خداوند متعال مومنوں کی توصیف میں فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا .... (۱)

جو حالتِ قیام، حالت قعود اور پہلوؤں کے بل اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ نیز آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار تو نے اس عالم کو عبث خلق نہیں کیا۔

---

(۱) سورہ آل عمران / ۱۹۱۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فکر کے بغیر ذکر اور ذکر کے بغیر فکر کارآمد نہیں جب یہ دونوں مل جائیں تو انسان کو حیوانیت و درندگی کی پستیوں سے نکال کر عرفان و خداجوئی کی بلندیوں تک پہنچاتے ہیں پس (اے برادر) ہمیشہ خدا کی یاد میں مگن رہنے کی کوشش کرو اس کے ساتھ ساتھ اپنی قوت تفکر سے کام لو اور اپنی روح کو بلندیوں میں پرواز کرنے کے لئے آمادہ رکھو۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

طُوبیٰ لِمَن شَغَلَہُ قَلبُہ، بِالفِکرِ وَ لِسانُہ بالذِّکر [1]

خوش نصیب ہے وہ شخص جس کا دل غور و فکر میں اور زبان ذکر خدا میں مشغول ہو۔

امام ہشتم علی بن موسی الرضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَیسَتِ العِبادَۃُ کَثرَۃُ الصَّلاۃِ وَ الصَّومِ اِنَّما العِبادَۃُ اَلتَّفَکُّرُ فِی اَمرِ اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ [2]

عبادت یہ نہیں ہے کہ انسان کثرت سے نماز پڑھے یا روزے رکھے بلکہ عبادت تو خداوند عزوجل کے امر میں غور و فکر کا نام ہے۔

اس حدیث سے بظاہر یہی مراد ہے کہ در حقیقت عبادت صرف اس بات میں غور و فکر کرنے کا نام ہے جو خدا اور اس کے امر و ارادے سے متعلق ہو بالفاظ دیگر عبادت یہ ہے کہ ہر چیز پر اس لحاظ سے غور و فکر کیا جائے کہ وہ خدا کا تخلیقی شاہکار، خدا کے ارادے کا مظہر اور اللہ کے اسماء و صفات کا جلوہ ہے۔ تاکہ عبادت میں روح اور جان پڑجائے خلاصہ یہ کہ امر خداوندی میں غور و فکر کرنا عبادت کے بدن میں روح پھونکنے کے مترادف ہے اور جو عبادت تفکر سے خالی ہو وہ اخلاص سے خالی عبادت کی طرح ایک بےجان اور حقیقت سے تہی ڈھانچہ ہے۔

---

(۱) فہرست موضوعی غرر ص ۳۱۰۔

(۲) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج ۶۸ ص ۳۲۲۔

پانچواں نکتہ

الحبّ للّٰہ والبغض للّٰہ

(تولیٰ و تبرا)

حب و بغض کو علم اخلاق کی اصطلاح میں شہوت و غضب کہا جاتاہے. یہ دونوں صفات حسنہ کے حصول اور صفات قبیحہ سے بچنے کے دو اہم ترین عوامل ہیں۔ جب تک انسان کو کسی چیز سے دلچسپی یا محبت نہ ہو وہ اس کی طرف نہیں بڑھتا اور جب تک اسے کسی چیز سے نفرت نہ ہو اس سے اجتناب نہیں کرتا۔ امام صادق علیہ السلام کا فرمان ہے:

مَنْ سَرَّتْهُ حَسَنَتُهُ وَ سَائَتْهُ سَيِّئَتُهُ فَهُوَ مُؤمِن (۱)

وہ شخص جو اپنے اچھے کام میں خوشی محسوس کرے اور برا کام اسے برا لگے وہ در حقیقت مومن ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسان کی پسند اور ناپسند، دوستی و دشمنی، اور خوشنودی و عدم خوشنودی سب کے سب انسان کی زندگی کے اہم حصے ہیں ان جذبات کی عدم موجودگی کی صورت میں زندگی بے ہدف اور بے لطف ہوکر رہ جاتی ہے انہی جذبات و احساسات سے انسان کی شخصیت وجود میں آتی ہے صدر المتالہین (ملا صدرا) کے بقول یہ ہر انسان کی امتیازی اور جداگانہ نوع کا باعث ہیں۔

---

(۱) اکمال الدین دیلمی ص ۱۱۰۔

قرآن کریم میں بھی اس نکتے کی طرف ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے:

قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (۱)

کہو کہ ہر کوئی اپنی باطنی ساخت کے مطابق عمل کرتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خوبیوں اور برائیوں کی صرف شناخت ہی انسانی ترقی اور تکامل کا باعث ہے اور اس کے برعکس جہالت و نادانی انسانوں کے زوال کی واحد علت ہے لیکن یہ نظریہ باطل ہے کیونکہ اگر چہ شناخت ضروری اور مفید ہے لیکن صرف شناخت کافی نہیں کیونکہ چاہت و ارادہ کے بغیر آمادگی حاصل نہیں ہوتی۔

کتنے ہی ایسے پڑھے لکھے لوگ ہیں جو نشہ آور اشیاء اور منشیات کے نقصانات کے بارے میں کتابیں لکھتے ہیں لیکن خود اس لعنت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بنابریں یہ قول بے جا نہیں کہ:

انَّ الحيَاةَ عَقِيدَةٌ وَ جِهَادٌ

بہ تحقیق زندگی عقیدہ اور جہاد سے عبارت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی عقیدہ کے بغیر اور عقیدہ عشق و محبت اور سوز و گداز کے بغیر بے معنیٰ ہے۔ بنابرین ایمان سے مراد ہے محبت اور محبت سے مراد ہے ایمان۔ جو شخص عشق و محبت کی چاشنی سے بے خبر ہو وہ ایمان کا مزہ نہیں چکھ سکتا۔ کسی شخص نے امام صادقؑ سے پوچھا کہ کیا حب و بغض ایمان کا حصہ ہے؟ امام نے جواب دیا۔

وَ هَلِ الاِيمَانُ اِلَّا الحُبُّ وَ البُغْضُ (۲)

یعنی ایمان، اللہ کی خاطر حب و بغض کے علاوہ کچھ نہیں۔

ایک اور حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

اَلدِّيْنُ هُوَ الحُبُّ وَ الحُبُّ هُوَ الدِّيْنُ (۳)

یعنی دین عین محبت ہے اور محبت عین دین ہے۔

---

(۱) سورہ الاسراء / ۸۴۔ (۲) اصول کافی ج ۲ ص ۱۲۵۔ (۳) تفسیر نور الثقلین ج ۵ ص ۸۴۔

اس بات میں شک کی گنجایش نہیں کہ انسان حسن وجمال اور کمال کا دلدادہ ہے [1] اور خدا کی ذات، عین کمال، عین جمال، عین رحمت بلکہ دوسرے لفظوں میں تمام صفات کمالیہ کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے ان صفات کو ہم صفات ثبوتیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں. بنابریں اللہ سے دوستی تمام خوبیوں سے دوستی کا سرچشمہ ہے. ہر وہ شخص جو جمال و کمال کا دلدادہ ہو ضرور اللہ سے محبت کرے گا اور جو شخص اللہ سے محبت کرے گا وہ یقیناً اس کے جمال و جلال کے مظاہر سے بھی محبت کرے گا۔

بقول شاعر

عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم ازوست

مجھے پوری کائنات سے محبت ہے کیونکہ پوری کائنات اس کی ہے۔

یہ جاذبیت ایک فطری امر ہے اور ہر کوئی (خواہ چاہے یا نہ چاہے) حقیقت مطلق اور ہستی مطلق کے سامنے نیز اس کے حسن و جمال کے آگے مجذوب اور اس کے علم و قدرت کے سامنے مغلوب و مقہور ہے. لیکن یاد رہے کہ یہ فطری اور غیر اختیاری و غیر شعوری مجذوبیت کافی نہیں ہے کیونکہ خودسازی اور تزکیہ کے میدان میں معرفت کے ساتھ ریاضت اور نفس کے ساتھ جہاد شرط ہے۔

اس مقصد کے لئے فطری صلاحیتوں سے کام لینا اور اپنی مرضی و انتخاب کے ساتھ دوست کی رضا کے آگے سر تسلیم خم ہونا ضروری ہے ظاہری، طبیعی اور کھوکھلی سرگرمیاں عروج انسانی اور سیرو سلوک کے راستے میں مفید واقع نہیں ہوتیں۔

---

(1) وہ حسن و جمال کو چاہتا ہے اور بدی و برائی سے بیزار ہے۔

جیسا کہ ارشاد ربانی ہوتا ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُونِی یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (۱)

کہو اگر تم لوگ اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ اللہ تمہیں دوست رکھے۔

اللہ کی محبت اس صورت میں فائدہ مند ہے جب مقام عمل میں اس کا مظاہرہ ہو۔ یعنی حقیقی دوست اور عاشق وہ ہے جو دوست کی پسند کو اپنی پسند پر مقدم رکھے وادی محبت میں سر تسلیم خم کرنے، عقل و شعور کے ساتھ علاوہ انتخاب کرنے کے ساتھ اطاعت و ریاضت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰیکُمْ (۲)

تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔

محبت نقطہ آغاز

مذکورہ عرائض کی روشنی میں بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ محبت وہ نقطہ آغاز ہے جہاں سے سالکان راہ حقیقت کا سفر شروع ہوتا ہے۔ قصہ مختصر جب تک محبت اور شوق نہ ہو منزل کی طرف بڑھنا ممکن نہیں۔ اگر آدمی اپنی بھلائی و خوبی کا طلبگار نہ ہو تو وہ کبھی بھی اپنی اصلاح کی کوشش نہیں کرے گا۔ سب سے پہلے یہ فکر اور جذبہ بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ انسان کو اپنے عیوب دور کرنے کے لئے چارہ اندیشی کی ضرورت ہے۔ اور اس ملکوتی پرندے کو قفس میں بند رکھنا باعث صد افسوس ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ اس قدر عظیم اور خداداد سرمائے کو ضایع کرنا مناسب نہیں۔

---

(۱) سورہ آل عمران / ۳۱۔

(۲) سورہ حجرات / ۱۳۔

جیسا کہ ہم عرض کرچکے اس وادی میں صرف "جاننا" کافی نہیں بلکہ یہاں ایک مخصوص سوز و گداز اور عشق و جنون کی ضرورت ہے جو انسان کو اصلاح و فلاح کی طرف لے جائے اور اسے ریاضت و مجاہدت کے لئے آمادہ کرے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ. (۱)

اس مسجد میں (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے تقوی کی بنیاد پر بنائی تھی) ایسے مرد پائے جاتے ہیں جو طہارت کو دوست رکھتے ہیں اور اللہ بھی پاکیزہ افراد سے محبت کرتا ہے۔

ایمان اور علم

اب جبکہ علم اور ایمان کا موضوع زیر بحث آیا ہے۔ یہ بات جان لینی چاہیئے کہ ایمان اور علم میں فرق ہے کیونکہ علم کا جو بھی مفہوم لیا جائے بہر حال تجربے اور استدلال کی پیدا وار ہے اور ان دونوں کا تعلق تصور و تفکر سے ہے۔ لیکن ایمان، فطرت الہیہ کے متعلق ایک قسم کی خود آگاہی، ماوراء الطبیعی عرفانی اطمینان اور اعتقاد کا نام ہے۔ دوسرے الفاظ میں علم کی مثال درآمد شدہ مال کی سی ہے یا علم ظاہری نمود و انعکاس کا حامل ہے جبکہ ایمان ایک ملکوتی درخشندگی اور ضمیر کی آواز کا جواب ہے۔

مختصر یہ کہ ایمان سب سے عظیم وجود کے بارے میں تقدیس و تکریم اور خضوع سے لبالب احساس اور جذبے کا نام ہے لیکن علم اس قسم کے جذبے سے عاری ہوسکتا ہے کیونکہ علم مجہولات کی پہچان کا ذریعہ ہے اگر چہ وہ اس عالم کے نزدیک مطلوب اور محبوب نہ بھی ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں ایمان بھی ہو۔ یعنی گاہے علم ہوتا ہے لیکن ایمان موجود نہیں ہوتا قرآن اس حقیقت کی یوں نشاندہی کرتا ہے۔

---

(۱) سورہ توبہ / ۱۰۸۔

وَ جَحَدُوا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْماً وَ عُلُوّاً (۱)

اور با وجودیکہ ان کے دلوں کو ان معجزات کا یقین تھا مگر پھر بھی ان لوگوں نے سرکشی اور تکبر سے ان کو نہ مانا۔

اسی لئے قرآن یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمنوا (اے ایمان لانے والو) کہہ کر پکارتا ہے نہ کہ یا ایھا الذینَ علموا (اے علم والو) کہہ کر دوسرا نکتہ یہ کہ ایمان ہمیشہ اطمینان و سکون کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے لیکن علم کے ہمراہ ممکن ہے کہ اضطراب و تزلزل بھی ہو۔

اللہ تعالی مومنین کے بارے میں فرماتا ہے :

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ الا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان قبول کیا ہے اور ان کے دل خدا کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں یاد رکھو کہ خدا ہی کی یاد سے دلوں کو تسلّی ہوا کرتی ہے۔

---

(۱) سورہ النمل / ۱۴۔

(۲) سورۃ الرعد / ۲۸۔

چھٹا نکتہ

شریعت اور احکام خداوندی کا علم

سالک راہ حق کو چاہیئے کہ کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے اسے پہچانے اور اس کے بارے میں حکم شریعت سے آگاہی حاصل کرے تا کہ اس کے اعمال و کردار شریعت کے مطابق ہوں۔ شرعی احکام و وظائف کی شناخت کے بغیر کوئی شخص اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کرسکتا اور دینی آداب پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا۔ بنابرین ہر شخص پر لازم ہے کہ ضرورت کے مطابق دینی احکام و تعلیمات کو اجتہاد یا تقلید کے ذریعے جان لے۔ کم از کم لوگوں کی ایک جماعت کو چاہیئے کہ علوم دینی کو مکمل طور پر سیکھنے کے لئے آگے بڑھے تا کہ وہ دوسروں کو ان کی دینی ذمہ داریوں سے آگاہ کرسکے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے:

...... فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (۱)

---

(۱) سورہ توبہ / ۱۲۲۔

ان میں سے ہر گروہ (قبیلہ) کی ایک جماعت اپنے گھروں سے کیوں نہیں نکلتی تا کہ علم دین حاصل کرے اور جب اپنی قوم کی طرف پلٹ کر آئے تو ان کو عذاب آخرت سے ڈرائے (یعنی ان کو دینی شرعی ذمہ داریوں سے آگاہ کرے) تا کہ وہ ڈریں (اور راہ راست پر آجائیں.

بندگی اور عبادت کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے یعنی محبت اور اطاعت کی. یاد رہے کہ اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک معبود کی پسند اور محبوب کی چاہت کا علم نہ ہو جو لوگ اپنی طرف سے کچھ باتیں تراش کر انہیں عبادت اور اطاعت کے نام سے انجام دیتے ہیں وہ خدا کے بندے نہیں بلکہ وہ خود اپنی بندگی کرتے ہیں۔

اللہ کا ارشاد ہے:

آللّٰہُ اَذِنَ لَکُمْ اَمْ عَلَی اللّٰہِ تَفْتَرُوْنَ؟

آیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہو؟

ساتواں نکتہ

مخلص دوست کا انتخاب

جسطرح دنیا کے مختلف حصوں میں سفر کے دوران اچھا دوست اور وفادار ساتھی سفر کی مشکلات کو دور کرنے میں مفید اور اہم کردار ادا کرتا ہے اسی طرح معنوی سیر و سلوک کے لئے بھی اچھے ساتھی کی موجودگی ضروری اور مفید ہے۔

جب حضرت موسی علیہ السلام بنی اسرائیل کی ہدایت اور ان کو فرعون کی چنگل سے نجات دینے کیلئے اللہ کی طرف سے نبوت پر مامور ہوئے تو انہوں نے بارگاہ خداوندی میں یوں دعا کی:

وَ اجْعَلْ لِي وَزِيراً مِنْ أَهْلِي هَارُونَ أَخِي اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي
وَ أَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيراً وَ نَذْكُرَكَ كَثِيرا (۱)

اور (خدایا) میرے کنبہ والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر اور بوجھ بٹانے والا بنادے۔ اس کے ذریعے میری پشت مضبوط کردے اور میرے کام میں اس کو میرا شریک بنا تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تیری یاد کریں۔

---

(۱) سورہ طہ / ۲۹،۳۴۔

امیر المومنین علی علیہ السلام اپنے فرزند کو یوں نصیحت فرماتے ہیں:

سَلْ عَنِ الرَّفِیقِ قَبْلَ الطَّرِیقِ وَ عَنِ الْجَارِ قَبْلَ الدَّار (۱)

یعنی سفر سے پہلے اپنے ہم سفر کی اخلاقی خصوصیات کے بارے میں تحقیق کرو. نیز گھر خریدنے سے پہلے ہمسائے کو پہچان لو.

بہترین دوست وہ ہیں جو خدا کی رحمت اور نعمت سے سرافراز ہوئے ہوں نیز خدا کے لطف و کرم کی بدولت صراط مستقیم کو پاچکے ہوں اور گناہوں سے محفوظ رہے ہوں. یہ چار قسم کے لوگ ہیں جن کی توصیف اس آیت میں ہوئی ہے

و مَن یُطِعِ اللہ والرَّسولَ فاولئکَ مع الذینَ انعم اللہ عَلَیْہِم مِنَ النّبییّنَ والصدیقینَ والشّھداء والصّالحینَ وحَسُنَ اولئکَ رفیقاً (۲)

اور جس شخص نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو ایسے لوگ ان بندوں کے ساتھ ہوں گے جنہیں خدا نے اپنی نعمتیں دی ہیں یعنی انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین اور یہ لوگ کتنے اچھے رفیق ہیں.

خلاصہ یہ کہ مذکورہ آیات و روایات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ راہ حق میں وفادار اور مخلص دوست کی ضرورت ہوتی ہے. تنہائی صرف حق تعالی کے لئے سزاوار ہے

اے برادر اگر تمہاری رسائی پیغمبر اور صدیقین تک نہیں ہے تو کم از کم شہیدوں اور صالحین کے ساتھی بنو اور ان سے ہرگز جدا نہ ہونا ورنہ گمراہ ہوجاؤ گے

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح مکتوب نمبر ۳۱۔

(۲) نساء / ۶۹۔

آٹھواں نکتہ

حرام سے پرہیز

ابتدائی نقطوں میں سے آٹھواں نقطہ، محرمات کو ترک کرنا ہے یعنی جس طرح جسم کی سلامتی اور بدن کی صحت کے لئے بعض کاموں اور اشیائے خورد و نوش سے پرہیز ضروری ہے اسی طرح تربیت و تزکیہ نفس کے لئے بھی بعض کاموں اور غذاؤں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ قطب راوندی امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

عَجَباً لِمَن یَحْتَمِی عَنِ الطَّعامَ مَحافَةَ الدّآء کَیفَ لایَحْتَمِی عَنِ المَعاصِی خَشْیَةَ النّارِ (۱)

تعجب ہے اس شخص پر جو بیماری کے خوف سے کھانوں میں احتیاط و پرہیز سے کام لیتاہے لیکن آتش جہنم کا خوف کھاتے ہوئے گناہوں سے پرہیز نہیں کرتا۔

البتہ یہ احتیاط اور پرہیز خواہشات نفس کے برخلاف ہے اور ابتداء میں کچھ مشکل نظر آتاہے لیکن ریاضت اور جہد مسلسل کے ذریعے کاموں میں آسانی پیدا ہوجاتی ہے اور راستے ہموار ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے:

غالبُوا انفسَکُم علی ترکِ المعاصی یَسْهلُ علیکم مقادَتُها الی الطّاعاتِ (۲)

ترک گناہ کے معاملے میں اپنے نفس کے ساتھ پنجہ آزمائی کرو تاکہ اسے طاعات وعبادات کی طرف لے جانا تمہارے لئے آسان ہو۔

---

(۱) جامع احادیث الشیعہ ج ۳ ص ۳۲۷۔

(۲) جامع احادیث الشیعہ ج ۳ ص ۳۲۶۔

خودسازی اور تزکیہ نفس کے سلسلے میں یہ جنگ و ستیز بنیادی اہمیت کی حامل ہے اسلام اسے تقویٰ کے نام سے یاد کرتا ہے یہ تمام اسلامی اصولوں اور انسانی اقدار کی بنیاد ہے، اور کوئی عمل یا کوشش اس کے بغیر سودمند نہیں، نہ ہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

انّما یَتقبّلُ اللهُ مِنَ المُتقین (۱)

اللہ تو بس متقین کے ہی عمل کو قبول فرماتاہے۔

مفضل بن عمر کا بیان ہے کہ امام صادقؑ کی خدمت میں اعمال کی بحث چھڑ گئی میں نے عرض کیا کہ میں عمل کے میدان میں سست اور کمزور ہوں۔ امامؑ نے فرمایا: تحمل سے کام لو اور اس سے طلب مغفرت کرو، یعنی اس قدر مایوس مت ہو۔ اس کے بعد فرمایا:

انَّ قَلِیلَ العَمَلَ مَعَ التَّقویٰ خَیر مِنْ کَثیرِ العَمَلَ بِلَا تَقویٰ ..... (۲)

بہ تحقیق تقویٰ کے ہمراہ انجام دیا جانے والا تھوڑا سا عمل تقوی کے بغیر انجام دیئے جانے والے زیادہ عمل سے بہتر ہے۔

مفضّل کہتا ہے: میں نے عرض کیا: یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص بغیر تقوی کے اس قدر عمل خیر انجام دے؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں یہ ممکن ہے مثلاً وہ افراد جو لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہمسایوں کے ساتھ مہربانی کرتے ہیں لوگوں کے لئے ان کے دروازے کھلے ہوتے ہیں لیکن جب گناہ کا سامنا ہو تو وہ پہلے ہی مرحلے میں ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور نافرمانی اور گناہ کے شکار ہوجاتے ہیں۔ لیکن کچھ افراد ایسے بھی ہیں جنہیں اس طرح کی خدمات اور نیکوکاری کا موقع نصیب نہیں ہوتا لیکن وہ گناہوں کے مقابلے میں احتیاط اور اجتناب کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو معصیت سے بچاتے ہیں۔

---

(۱) سورہ المائدہ/ ۲۷۔

(۲) اصول کافی ج/۲ ص۷۶۔

ارشاد خداوندی ہے:

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِہٖ (۱)

انسان کو چاہیئے کہ اپنے طعام کی طرف نگاہ کرے
(یعنی احتیاط اور عقل کی آنکھوں سے دیکھے)

امیر المومنین علی علیہ السلام نے عثمان بن حنیف کو لکھا:

فَمَا اشْتَبَہَ عَلَیْکَ فَالْفِظْہُ .... (۲)

یعنی جس چیز کے حلال ہونے میں تجھے شک ہو اسے اپنے منہ سے نکال پھینک دو۔

بنابرین وہ اہم ترین چیز جس پر مومن کو ابتدائے امر سے ہی نظر رکھنی چاہیئے وہ ہے شکم کو رزق حرام سے پاک رکھنا اور حرام (مثلاً زنا وغیرہ .....) سے اپنا دامن بچانا خاص کر عالم شباب میں جب جذبۂ شہوت کی سرکشی اور غلبے کے باعث گناہ کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ پس انسان کو محتاط رہنا چاہیئے تاکہ آنکھ اور دل پاک و صاف رہیں اور وہ پاکیزہ روح کے ساتھ بلندیوں میں پرواز کرنے لگے اور آخر کار خلوت گہ راز میں انبیاء، صدیقین، شہیدوں اور صالحین کا ہم نشین بن جائے۔

صاحبان تقوی ان چیزوں سے جو واضح طور پر حرام ہیں پرہیز کرنے کے علاوہ مشتبہ غذاؤں اور فتنہ انگیز نگاہوں سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔

بقول شاعر

"ہر آنچہ دیدہ بیند دل کند یاد"

یعنی آنکھ جس چیز کو دیکھتی ہے وہ صفحہ دل میں محفوظ ہو جاتی ہے۔

---

(۱) سورۂ عبس / ۲۴۔
(۲) نہج البلاغہ صبحی صالح مکتوب نمبر ۴۵۔

جو لوگ اس خطرناک وادی میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ ناجائز کاموں اور غلط افراد کی دوستی سے خود کو بچائیں اور جائز کاموں میں بھی تمام ضروری احکام کی رعایت کریں نیز ان اموال میں کہ جن پر سب کا حق ہو اور بیت المال کے مقابلے میں نہایت احتیاط سے کام لیں اگر وہ سرکاری ملازم اور ملت کے خدمت گار ہوں تو انہیں چاہیئے کہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں سستی نہ کریں یا لوگوں کی خدمت (خاص کر محروم اور مظلوم لوگوں کی خدمت) کے لئے اپنی پوری قوت صرف کریں اور بطور احتیاط مقررہ اوقات سے تھوڑا زیادہ کام کریں تا کہ اگر کہیں کوتاہی ہوئی ہو تو اس کا ازالہ ہوجائے۔

خاص طور پر بڑے بڑے اور کلیدی عہدوں پر کام کرنے والوں کو اپنی ذمہ داریوں کے تناسب سے زیادہ احتیاط برتنا چاہیئے۔ بہت افسوس کا مقام ہے کہ اس نکتے کی طرف ضروری توجہ نہیں دی جاتی اور ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دعوتوں میں نہایت پر جوش اور آگے آگے ہوتے ہیں لیکن مقام عمل میں غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں اور تقوی کے حدود کو پامال کرتے ہیں خاص کر پیٹ کے معاملے میں وہ اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ یہی لوگ دوسروں سے زیادہ خطرے کی زد میں ہوتے ہیں اور یہی حضرات اسلام اور انقلاب کے اہداف کو زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔

یاد رہے کہ اگر انسان کا پیٹ یا اس کا دامن گناہ سے آلودہ ہوجائے تو وہ دوسرے گناہوں میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اسی لئے معصومین علیہم السلام کے فرامین میں ان دونوں کو بچانے پر بہت زور دیا گیا ہے اور اسے سب سے بڑی عبادت اور سب سے بہتر ریاضت قرار دیا گیا ہے۔

ابو بصیر کہتے ہیں: ایک شخص نے امام محمد باقر علیہ السلام سے عرض کیا کہ میں عمل کے لحاظ سے کمزور اور ضعیف ہوں نیز مجھے مستحب روزے رکھنے کی توفیق کم نصیب ہوتی ہے لیکن مجھے اطمینان ہے کہ حلال کے علاوہ کچھ نہ کھاؤں گا۔

امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

اَیُّ الاِجْتِھَادِ اَفْضَلُ مِنْ عِفَّۃِ بَطْنٍ وَ فَرْجٍ (۱)

کونسی ریاضت شکم اور شرمگاہ کو گناہ سے بچانے سے زیادہ افضل ہے؟

ایک اور حدیث میں آپؑ ہی سے منقول ہے۔

مَا عُبِدَ اللّٰہُ بِشَیءٍ اَفْضَلَ مِنْ عِفَّۃِ بَطْنٍ وَ فَرْجٍ (۲)

یعنی اللہ کے نزدیک کوئی عبادت شکم اور شرمگاہ کو حرام سے محفوظ رکھنے سے زیادہ قیمتی نہیں۔

گناہان صغیرہ اور گناہان کبیرہ

اگر چہ ہر گناہ اللہ کے نافرمانی پر مشتمل ہونے کی بناء پر سخت اور سنگین ہے لیکن سارے گناہ ایک جیسے نہیں کیونکہ مختلف گناہوں کی خصوصیات اور ان کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔

گناہوں میں سے بعض بہت بڑے، بعض بہت چھوٹے اور کچھ متوسط ہوتے ہیں۔ واضح سی بات ہے کہ ایک انسان کو قتل کرنے کا گناہ اسے تھپڑ مارنے یا گالی گلوچ دینے سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ اسی طرح زنا کا گناہ نامحرم پر نظر ڈالنے سے زیادہ سخت ہے۔ اس نکتے کو قبول کرنے کی صورت میں یہاں دو سوال ابھرتے ہیں۔

پہلا سوال:-

جب گناہوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا جائے تو ان میں سے بعض گناہ دوسرے گناہوں کے مقابلے میں سنگین ہیں اور بعض خفیف۔ اس صورت میں کیا گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کی تقسیم نسبی (دوسرے گناہ کی بہ نسبت) ہے یا مطلق؟ (یعنی موازنے سے قطع نظر)۔

---

(۱) اصول کافی۔ ج ۲ ص ۷۹۔

(۲) ایضاً۔

دوسرا سوال:۔

اگر ہم فرض کریں کہ مذکورہ تقسیم (تقسیم مطلق) صحیح ہے تو اس صورت میں کسی گناہ کے کبیرہ ہونے یا صغیرہ ہونے کا معیار کیا ہے؟ اور ان دونوں میں فرق کی کسوٹی کیا ہے؟

جواب:۔

پہلے سوال کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اگر چہ کچھ گناہ دوسرے گناہوں کے مقابلے میں یا سنگین تر ہیں یا خفیف تر اور اس لحاظ سے صغیرہ و کبیرہ کی تقسیم نسبی ہے (یعنی ممکن ہے کہ ایک گناہ اپنے سے زیادہ بڑے گناہ کے مقابلے میں صغیرہ، اور چھوٹے گناہ کے مقابلے میں کبیرہ محسوب ہو)

لیکن جیسا کہ ہم قبلاً عرض کر چکے قرآنی آیات اور احادیث معصومین علیہم السلام میں گناہوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اس تقسیم کا ایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے اور ہر قسم کی ایک خاص حیثیت معین کی گئی ہے بنابرین کوئی گناہ صغیرہ، گناہ کبیرہ نہیں کہلا سکتا اور نہ ہی کوئی گناہ کبیرہ گناہ صغیرہ محسوب ہو سکتا ہے۔

البتہ یہ بات یاد رہے کہ گناہوں کو مزید دو زاویوں سے بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک:۔ یہ کہ چونکہ ہر گناہ حکم خداوندی کی مخالفت ہے بنابرین نہایت قبیح اور ناپسند امر ہے۔ اس لحاظ سے کوئی گناہ صغیرہ نہیں ہے اگر کوئی اللہ کی نافرمانی کو چھوٹا شمار کرے تو یہ بذات خود ایک سنگین تر گناہ ہے۔

چنانچہ فرمان معصومؑ ہے:

اَشَدُّ الذُّنُوبِ مَا اسْتَخَفَّ بِهِ صَاحِبُهُ (۱)

سب سے سنگین گناہ وہ ہے جسے گناہ کرنے والا سبک اور چھوٹا سمجھے۔

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح۔ حکمت ۴۷۷۔

نیز روایت ہے کہ:

اَلذُّنُوبُ کُلُّها شَدِیدَة وَاَشَدُّهَا مَا نَبَتَ عَلَیهِ اللَّحمُ وَ الدَّمُ لِاَنَّهُ اِمَّا مَرحُوم وَاِمَّا مُعَذَّب وَالجَنَّةُ لَا یَدخُلُهَا اِلَّا طَیِّب (۱)

سارے گناہ سنگین ہیں۔ ان میں سے بھی سنگین تر وہ ہے جس سے گوشت اور خون بڑھے کیونکہ گناہ کرنے والا یا بخشا جاتاہے یا عذاب کا شکار ہوتاہے اور جنت میں صرف پاک و پاکیزہ لوگ ہی جا سکتے ہیں) یعنی گناہ سے بنے ہوئے خون اور گوشت کے ہمراہ بہشت میں داخل نہیں ہوا جا سکتا۔

ب:۔ اگر چہ ایک جامع تقسیم کی رو سے گناہوں کو دو حصوں (صغیرہ اور کبیرہ) میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن یاد رہے کہ سارے گناہان کبیرہ برابر نہیں ہیں جیسا کہ گناہان صغیرہ بھی برابر اور یکساں نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک گناہ صغیرہ دوسرے گناہ صغیرہ کے مقابلے میں گناہ کبیرہ ہو اسی طرح ایک گناہ کبیرہ دوسرے گناہ کبیرہ کے مقابلے میں صغیرہ ہو یا اس کے برعکس ہو کیونکہ اس مشترکہ اور کلی ضابطے (جس کی رو سے گناہوں کو دو حصوں (کبیرہ و صغیرہ) میں تقسیم کیا گیا تھا) کے علاوہ دیگر زاویوں سے بھی ملاحظہ کی جا سکتاہے جو گناہوں کے بڑے یا چھوٹے ہونے میں دخیل ہیں۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۲۷۰۔

قبحِ فعلی اور قبحِ فاعلی

گناہ کے دونوں اقسام (صغیرہ، کبیرہ) میں شدت و ضعف کا دارومدار دو چیزوں پر ہے۔

۱۔ قبح فعلی (عمل کی قباحت)

۲۔ قبح فاعلی (فاعل کی قباحت)

قبح فعلی کا تعلق کسی عمل کے ذاتی مفاسد اور برائیوں سے ہے اس مرحلے میں گناہ انجام دینے والے کی باطنی خصوصیات یا اس کے حالات سے کوئی سرو کار نہیں ہوتا اس کے برعکس قبح فاعلی کا تعلق گناہ انجام دینے والے شخص کی ذہنی اور روحانی حالت سے ہے۔ (اس عمل کی ذاتی حیثیت سے قطع نظر)

گناہ گار کی ذہنی کیفیت اس کے اندر موجود نافرمانی، سرکشی، قانون شکنی نیز خدا اور بندگان خدا کے حقوق کو اہمیت نہ دینے کے جذبے سے عبارت ہے۔

یاد رہے کہ سارے گناہ قبح فاعلی کے اعتبار سے سنگین اور عظیم ہیں کیونکہ جان بوجھ کر خداوند بزرگ و مہربان کی نافرمانی نہایت قبیح اور ناپسندیدہ جرم ہے۔

قطب راوندی نقل کرتے ہیں:

اَوْحَی اللّٰہُ تَعَالیٰ اِلیٰ عُزَیْر عَلَیہِ السَّلَامُ یَا عُزَیْر اِذَا وَقَعتَ فِی مَعْصِیَۃ فَلا تَنْظُرْ اِلیٰ صِغَرِھا وَ لٰکِنْ اَنْظُر مَنْ عَصَیْتَ ......(۱)

یعنی اللہ تعالی نے عزیرؑ کو یہ وحی کی "اے عزیرؑ اگر تم کسی گناہ (صغیرہ) کے مرتکب ہو جاؤ تو اس گناہ کے چھوٹے ہونے کی طرف نہ دیکھو بلکہ اس ہستی کی طرف دیکھو جس کی تم نے نافرمانی کی ہے (یعنی خداوند متعال کی طرف)۔

---

(۱) جامع احادیث الشیعہ ج ۱۳ ص ۳۳۴۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ حالت (قبح فاعلی) بھی تمام گناہگاروں کے اندر یکساں نہیں ہوتی کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص جذبہ شہوت سے مغلوب ہوکر کوئی گناہ کر بیٹھے لیکن ایک اور شخص اسی گناہ کو فساد پھیلانے، خرابی پیدا کرنے اور بے دینی پھیلانے کے جذبے کے تحت انجام دے۔ یہاں اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ دوسرے شخص کا گناہ پہلے شخص کے گناہ کے مقابلے میں سنگین تر ہے کیونکہ دوسرے شخص کے دل میں گناہ کی انجام دہی کا مقصد معاشرے میں فساد پھیلانا ہے. اس قسم کا گناہ اس قدر سخت اور قبیح ہے کہ تکرار اور اصرار کی صورت میں اس کا انجام دینے والا مُفسد فِی الْاَرض بن کر قتل کی سزا کا مستحق قرار پاسکتاہے. اس کے مقابلے میں پہلا شخص اس حد تک سخت قباحت و تنبیہ کا سزاوار نہیں ہے۔

ان عرائض کی روسے قبح فعلی اور قبح فاعلی دونوں کے مختلف درجات ہیں۔ بعض درجات سنگین ہیں اور بعض ہلکے۔ مختلف درجات کے اندر موجود شدت و ضعف کے تناسب سے بعض گناہ دونوں زاویوں سے کبیرہ، اور گاہے دونوں لحاظ سے صغیرہ محسوب ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک گناہ قبح فعلی کی روسے کبیرہ اور قبح فاعلی کی روسے صغیرہ ہو یا گاہے اس کے برعکس ہو یعنی قبح فعلی کے لحاظ سے صغیرہ ہو اور قبح فاعلی کے لحاظ سے کبیرہ محسوب ہو۔

ان عرائض کی روشنی میں ہم بحث کو سمیٹتے ہوئے دو نتائج اخذ کرسکتے ہیں ایک نتیجہ یہ کہ گناہوں کی مثال ممنوعہ علاقوں کی طرح ہے۔ یعنی گناہ اللہ کے ممنوعہ علاقے ہیں۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس ممنوعہ خطے میں داخل نہ ہوں انہیں چاہیئے کہ وہ اس کے نزدیک جانے سے بھی احتراز کریں۔

چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ فَلاَ تَقْرَبُوْهَا (۱)

یہ اللہ کے حدود (ممنوعہ علاقے) ہیں پس ان کے نزدیک نہ جاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام سے بھی اسی مفہوم کی حامل احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا:

حَلال بَيِّن و حَرام بَيِّن وَ شُبُهَات بَيْنَ ذالِكَ. فَمَن تَرَكَ الشُّبُهاتِ نَجِىَ مِنَ المحرّماتِ وَ مَنْ اَخَذَ بِالشُّبِهاتِ ارْتَكَبَ المُحرماتِ وَ هَلَكَ مِنْ حَيْثُ لا يَعْلَمُ (۲)

یعنی کاموں کی تین قسمیں ہیں پہلی قسم وہ ہے کہ جس کا حلال ہونا واضح ہے دوسری وہ کہ جس کی حرمت واضح ہے اور تیسری قسم ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور پر مشتمل ہے پس جو شخص مشتبہ امور کو ترک کرے وہ یقینی طور پر محرمات سے محفوظ رہے گا۔ اور جو شخص مشتبہ و مشکوک کاموں میں پڑجائے وہ حرام میں مبتلا ہوجائے گا اور اس طرح سے ہلاکت کا شکار ہوگا کہ اسے علم ہی نہ ہو۔

یاد رہے کہ یہاں اس بحث کو چھیڑنے اور آیات و احادیث سے استدلال کرنے کا مقصد اخباریوں کے نظریے کی تائید نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حکم شرعی میں شک کی صورت میں احتیاط واجب ہے بلکہ ہمارا مقصد یہاں یہ ہے کہ اگر کوئی گناہوں سے محفوظ رہنے کا متمنی ہو اور چاہتا ہو کہ قطعی موارد میں گناہوں کا مرتکب نہ ہو تو اسے چاہیئے کہ مصداق

---

(۱) سورہ بقرہ / ۱۸۷۔

(۲) اصول کافی ج ۱ ص ۶۸۔

میں شک (کہ فلاں چیز حرام کا مصداق ہے یا نہیں) کی صورت میں احتیاط سے کام لے اور مشکوک امور سے بچے تا کہ شیطان وسوسے کے ذریعے اس پر غالب آکر اسے گناہ پر آمادہ نہ کرے۔ در حقیقت یہ ایک قسم کی ریاضت اور مشق ہے جس پر سالکان راہ حق کو خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی اس وادی میں قدم نہ رکھے تو مشکل ہے کہ اسے گناہوں سے بچنے میں مکمل کامیابی ہو۔

دوسرا نکتہ گناہوں پر اصرار نہ کرنا ہے یعنی یہ کہ گناہ اگر چہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو لیکن مومن کو چاہئے کہ اس سے دوری اختیار کرے۔ اگر گاہے فطری خواہشات سے مغلوب ہوکر یا گناہ کو معمولی سمجھتے ہوئے کسی گناہ کا مرتکب ہو تو فوری طور پر اللہ کو یاد کرے نیز اشک ندامت اور آب توبہ سے اپنے آپ کو پاک کرے۔

جیسا کہ اللہ تبارک و تعالی فرماتا ہے:

وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُ والله فَاسْتَغْفَرُ وا لِذُنُوبِهِم - وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلٰى مَا فَعَلُوا و هم يَعْلَمُونَ (۱)

اور وہ لوگ جب (اتفاقاً) کوئی بدکاری کر بیٹھتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیتے ہیں اور خدا کے سوا گناہوں کا بخشنے والا ہے ہی کون؟ نیز وہ علم و آگاہی کے ساتھ گناہ کا اصرار نہیں کرتے۔

---

(۱) سورہ آل عمران / ۱۳۵۔

گناہ پر جمے رہنے کا برا انجام

گناہوں کا تکرار اور ان پر جمے رہنا انسان کو کفر و الحاد کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَنْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَسْتَهْزِئُونَ (۱)

جو لوگ گناہوں پر اڑے رہتے ہیں ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ آیات خداوندی کی تکذیب کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

گناہ پر ڈٹے رہنے کا یہ انجام کیوں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ گناہوں پر ڈٹے رہنا اور گناہوں کا سلسلہ جاری رکھنا آدمی کے دل کو فاسد کر دیتا ہے۔ گناہ زہر ہلاہل کی طرح ہے اگر زہر کا علاج کرنے میں ایک گھنٹہ بھی تاخیر کی جائے تو وہ انسان کے اندرونی نظام کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ امام صادقؑ کا ارشاد ہے:

كَانَ أَبِي عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ: مَا مِنْ شَيْءٍ أَفْسَدَ لِلْقَلْبِ مِنْ خَطِيئَةٍ. إِنَّ الْقَلْبَ لَيُوَاقِعُ الْخَطِيئَةَ فَمَا تَزَالُ بِهِ حَتَّى تَغْلِبَ عَلَيْهِ فَيُصَيِّرَ أَعْلَاهُ أَسْفَلَهُ (۲)

میرے والد (امام باقرؑ) فرماتے تھے دل کے لئے کوئی چیز گناہ سے زیادہ مضر نہیں۔ بہ تحقیق دل گناہ سے پنجہ آزمائی کرتا ہے یہاں تک کہ گناہ دل پر غالب آتا ہے اور اسے سرنگون کر دیتا ہے۔

یعنی دل اپنی فطری طبیعت کی بناء پر ملکوتی خاصیت رکھتا ہے اور اس کا رخ اللہ کی طرف ہوتا ہے لیکن گناہوں کے اثرات کی وجہ سے اس کی صورت بدل جاتی ہے اور شیطانی شکل اختیار کرتی ہے۔

---

(۱) سورہ روم / ۱۰۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۲۶۸۔

گناہوں کے صیغرہ یا کبیرہ ہونے کا معیار

گزشتہ عرایض کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ گناہوں کی سنگینی یا سبکی کا دارومدار دو باتوں (قبح فعلی اور قبح فاعلی) پر ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تقسیم کی رو سے سارے گناہان کبیرہ اپنی سنگینی کی بناء پر مشترکہ اور ایک جیسے برے نتائج کے حامل ہیں۔ اسی طرح صغیرہ گناہوں کے درمیان بھی ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور چونکہ شرعی احکام کے موضوعات کے اندر پوشیدہ مصلحتوں، مفاسد اور ان کے حدود کا مکمل علم ہمیں نہیں ہوتا بنابرین کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی شناخت کے لئے ایک ضابطے اور معیار کی ضرورت ہے تاکہ اس معیار کی روشنی میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا جاسکے۔

علم فقہ، علم اخلاق، علم تفسیر اور علم کلام کے ماہرین نے اپنی وسعت علمی اور خصوصیات کی مناسبت سے اس سلسلے میں مفید نکات بیان کئے ہیں جو اپنے مقام پر قابل غور اور قابل تحقیق ہیں لیکن گناہان کبیرہ و صغیرہ کی شناخت کا بہترین معیار وہی ہے جس کا ذکر معصومین علیہم السلام کی احادیث میں ہوا ہے۔ ہر وہ گناہ جس سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہو اور اللہ تعالی یا رسول اللہؐ کے کلام میں اس گناہ پر آتش جہنم کا خوف دلایا ہو وہ کبیرہ ہے اور باقی صغیرہ ہیں۔

بعض احادیث میں اس معیار کے ذکر کے علاوہ بعض گناہوں کا نام ان کی خصوصیات و صفات کے ساتھ لیا گیا ہے اور کبیرہ گناہوں کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا گیا ہے بعض روایات میں سات گناہوں کا ذکر ہوا ہے اور ان کو " سَبعِ موبقات یا سَبعِ مُوجِبات " (سات تباہ کن گناہ) کا نام دیا گیا ہے۔

گناہان کبیرہ کی تعداد میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات ان کی تعداد سات بتاتے ہیں بعض ستر اور بعض سات سو بھی بتاتے ہیں۔

مرحوم شہید ثانی شرح لمعہ میں فرماتے ہیں کبیرہ گناہ وہ ہیں جن سے قرآن و سنت میں

خاص طور پر منع کیا گیا ہے اور ان کے ارتکاب پر عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: گناہان کبیرہ کی تعداد کا سات بیان ہونا حقیقت کے نزدیک تر ہے اس کے بعد وہ بعض کبیرہ گناہوں کا نام لیتے ہیں مثلاً قتل، زنا، لواط، زنا کے معاملے میں دلالی، شراب خوری، چوری، پاکدامن عورتوں پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگانا، جہاد سے فرار، جھوٹی گواہی، خاص کر خدا اور رسول پر جھوٹ باندھنا، شرعی جواز کے بغیر کسی مسلمان کی مارپیٹ، شہادت کا چھپانا، رشوت، ظالم حکمرانوں کے ہاں مسلمانوں کی چغلی، زکات نہ دینا، حج واجب ہونے کے بعد بغیر عذر کے تاخیر کرنا، سور اور خنزیر کا گوشت کھانا، راستوں میں بدامنی پھیلانا اور جادو کرنا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں: "جن گناہوں کا ہم نے ذکر کیا وہ ان گناہوں میں سے ہیں جن کے بارے میں شارع مقدس نے سختی سے تنبیہ کی ہے"۔

مجلسی مرحوم کہتے ہیں "میرے والد نے اپنی ایک کتاب میں بعض کبیرہ گناہوں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے مختلف احادیث سے اخذ کئے ہیں۔ یہ گناہ شرک، رحمت الٰہی سے ناامیدی، خدا کی چال سے بے خوف ہونا، انسان کا قتل، والدین کی نافرمانی، مومن پر جھوٹی تہمت لگانا، یتیم کا مال ناحق کھانا، جہاد سے فرار، سود خوری، جادو، کہانت، زنا، لواط، چوری (خاص کر جنگ میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کی چوری) جھوٹی قسم، شرک، واجبات (مثلاً نماز، زکات، اور ماہ مبارک کے روزہ) کا ترک کرنا اور حصول استطاعت کے بعد حج کی ادائیگی میں تاخیر، جھوٹی شہادت دینا، شہادت کو چھپانا، شراب خوری، بیعت شکنی، عہد شکنی (خواہ خدا کے ساتھ ہو یا بندوں کے ساتھ) قطع رحم، راہ خدا سے ہجرت کرنے کے بعد تعرب جاہلی صفات اختیار کرنا، خدا، رسول اور اماموں پر جھوٹ باندھنا، غیبت اور تہمت سے عبارت ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ تمام مستحبات اور مسنون امور کا ترک کرنا، راہ چلنے والوں کو اضافی پانی سے محروم رکھنا، جب ان کے لیے ضروری نہ ہو، پیشاب کے چھینٹوں سے اجتناب نہ کرنا، ایسے حالات پیدا کرنا کہ دوسرے لوگ اپنے والدین کو گالی

دینے کی ہمت کریں، دوسروں کی وصیت میں نقصان پہنچانا، قضائے الٰہی پر راضی نہ ہونا اور قدر الٰہی پر اعتراض کرنا (بعض علماء کی نظر میں) تکبر، حسد، مومنین سے عداوت، مکہ و مدینہ میں الحاد، سخن چینی، چغل خوری، شرعی جواز کے بغیر کسی مؤمن کے اعضاء کو کاٹنا، مردار کا گوشت اور دیگر نجاستوں کا کھانا، زنا و غیرہ کے لئے واسطہ بننا، صغیرہ گناہوں کا سلسلہ جاری رکھنا، منکر کا حکم دینا اور معروف سے روکنا، جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، خیانت کرنا، مومنوں پر لعن کرنا ان کو گالی دینا اور آزار پہنچانا، نوکروں پر ضرورت سے زیادہ سختی کرنا، ضرور تمندوں کو حلال پانی سے روکنا، شارع عام کو بند کرنا، گھر والوں اور بیوی کے حقوق کو پامال کرنا، بے جا تعصب برتنا، ظلم کرنا، بے وفائی، دغا بازی، نفاق اور دو روئی، مومنوں کی تحقیر، مومنین کے عیوب نکالنے کی کوشش، انکی ملامت اور ان کی سرزنش کرنا اور ان پر بہتان باندھنا، ان سے بدگمانی، مومن کو ڈرانا، کم تولنا، امر بالمعروف اور نہی من المنکر نہ کرنا، فاسقوں اور فاجروں کی محفل میں شرکت، بدون جبر و اکراہ شراب نوشی، دین میں بدعت نکالنا، اہل بدعت کی ہم نشینی اختیار کرنا، گناہوں کو معمولی سمجھنا، جوا کھیلنا اور حرام چیزوں کا کھانا، اس کے بعد کہتے ہیں "امر بہ منکر" سے لیکر آخر تک جتنے گناہوں کو ہم نے شمار کیا ہے ان کا گناہ کبیرہ ہونا یقینی نہیں محتمل ہے۔ واللّٰہ یعلم۔

بہر حال گناہان کبیرہ کی تعداد مکمل طور پر واضح نہیں۔ شاید اس امر کو مبہم رکھنے کی وجہ یہ ہو کہ لوگ ہر قسم کے گناہ سے خوف کھائیں اور انہیں انجام دینے کی جرات نہ کریں۔ جس طرح شب قدر کے مبہم ہونے کی وجہ سے مسلمان رمضان المبارک کی دیگر راتوں میں بھی عبادت اور شب بیداری کرتے ہیں تاکہ شب قدر کا ثواب حاصل ہو (واللّٰہ العالم)۔ (۱)

---

(۱) مرآت العقول ج ۱۰ ص ۶۴ ۔

زبان کی آفتیں

علم اخلاق کے اہم موضوعات میں سے ایک زبا ن کی آفات اور اس سے مربوط گناہوں کا بیان ہے۔ بات کرنے اور زبان کی نعمت اگر چہ مفید اور گرانقدر ہے لیکن زبان کے گناہ اور اس کے نقصانات کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے ۔ جسطرح اللہ کے نزدیک کوئی عبادت حق گوئی سے زیادہ اہم نہیں اسی طرح کوئی گناہ سخن باطل سے زیادہ سنگین نہیں ۔

آسمانی تعلیمات اور حکماء کے بیانات میں زبان کے نقصانات کے بارے میں نہایت قیمتی اور دلچسپ نکات موجود ہیں ان تمام نکات کا جائزہ لینے کی اس کتاب میں گنجایش نہیں ۔ لیکن ہم ممکنہ حد تک ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے ۔

زبان کے مثبت اور منفی پہلو

جیسا کہ عرض ہوچکا زبان اور بیان کی نعمت خاص اہمیت کی حامل ہے لیکن اس نکتے سے بھی غفلت نہ کی جائے کہ زبان جیسے مثبت پہلو رکھتی ہے ایسے ہی منفی پہلو کی بھی حامل ہے ۔ لہذا یہ کہنا درست نہیں کہ زبان چونکہ خدا کی ایک عظیم نعمت ہے پس اسے زیادہ سے زیادہ استعمال میں لانا چاہیئے اور بغیر سوچے سمجھے ہر قسم کی بات کو زبان پر جاری کرنا چاہیئے یہ طریقہ درست نہیں بلکہ زبان کو صرف ضروری اور مفید امور کے لئے استعمال میں لانا چاہیئے۔

اصولی طور پر صاحب عقل انسان کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ بے جا گفتگو نہیں کرتا کیونکہ زبان سے انسان کی عقل کا اندازہ ہوتا ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

تَکَلَّمُوا تُعْرَفُوا فَاِنَّ الْمَرْءَ مَخْبُوءٌ تَحْتَ لِسَانِهِ (۱)

یعنی بات کرو تا کہ (تمھاری باتوں کے ذریعے) تمھاری شناخت ہو سکے کیونکہ انسان اپنی زبان کے نیچے پنہاں ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا ہے :

اَلْمَرْءُ مَخْبُوءٌ تَحْتَ لِسَانِهِ (۲)

آدمی اپنی زبان کے نیچے پنہاں ہوتا ہے۔

بقول شاعر

تا مرد سخن نگفته باشد — عیب و هنرش نهفته باشد

جب تک آدمی بات نہ کرے اس کی خامیوں اور خوبیوں کا پتہ نہیں چلتا۔

بہر حال عاقل اور دور اندیش انسان پہلے تولتا ہے پھر بولتا ہے۔

ایک مقام پر ارشاد ہے :

وَاِنَّ لِسَانَ الْمُؤْمِنِ مِنْ وَرَاءِ قَلْبِهِ وَاِنَّ قَلْبَ الْمُنَافِقِ مِنْ وَرَاءِ لِسَانِهِ لِاَنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَتَكَلَّمَ بِكَلَامٍ تَدَبَّرَهُ ، فِي نَفْسِهِ فَاِنْ كَانَ خَيْراً اَبْدَاهُ وَاِنْ كَانَ شَرّاً وَارَاهُ وَاِنَّ الْمُنَافِقَ يَتَكَلَّمُ بِمَا اَتَى عَلَى لِسَانِهِ لَا يَدْرِيْ مَا ذَا لَهُ وَ مَاذَا عَلَيْهِ وَلَقَدْ قَالَ رَسُولُ اللهِ صلّی اللہ علیہ و آلہ لَا يَسْتَقِيمُ اِيمَانُ عَبْدٍ حَتّٰى يَسْتَقِيمَ قَلْبُهُ وَلَا يَسْتَقِيمُ قَلْبُهُ حَتّٰى يَسْتَقِيمَ لِسَانُهُ..... (۳)

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح حکمت نمبر ۳۹۲۔

(۲) نہج البلاغہ فیض الاسلام حکمت ۱۴۰۔

(۳) نہج البلاغہ فیض الاسلام خطبہ ۱۷۵۔

به تحقیق مومن کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہوتی ہے اور منافق کا دل اس کی زبان کے پیچھے ہوتاہے۔ یعنی مومن جب کوئی بات کرنا چاہتاہے تو پہلے غور کرتاہے پھر اگر اس بات میں کوئی بھلائی ہو تو اسے کہتاہے اور اگر وہ بات بری ہو تو اسے زبان پر نہیں لاتا اور به تحقیق منافق جو کچھ زبان پر آئے کہہ ڈالتاہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ کونسی بات اس کے فائدے میں ہے اور کونسی بات اس کے لئے نقصان دہ ہے۔ (اس کے بعد فرمایا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ نے فرمایا ہے۔ کسی بندے کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کا دل صحیح نہ ہو اور اس کا دل اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو۔

مختصر یہ کہ انسان کو بات کرتے وقت احتیاط اور غور و فکر سے کام لینے اور فضول باتوں سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اگر بات کرتے وقت وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے تو اس پر برے اور نقصان دہ اثرات مرتب ہوں گے۔

سعدی شیرازی کہتے ہیں

اول اندیشه وانگهی گفتار	پای بست آمده ست پس دیوار

اسی طرح پہلے تولو پھر بولو جس طرح پہلے بنیاد رکھی جاتی ہے پھر اس پر دیوار چُنی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بات کرنے کے بعد ندامت و پشیمانی کا شکار ہوتے ہیں لیکن سکوت اور خاموشی کے باعث کسی کو ندامت یا پشیمانی سے روبرو ہونا نہیں پڑتا۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا:

يَا بُنَيَّ قَدْ نَدِمْتُ عَلَى الْكَلَامِ وَ لَمْ أَنْدَمْ عَلَى السُّكُوتِ (۱)

اے میرے بیٹے مجھے بات کرنے کے نتیجے میں تو ندامت ضرور اٹھانی پڑی ہے لیکن خاموشی کے باعث ندامت اٹھانی نہیں پڑی۔

---

(۱) بیہقی کتاب المحاسن والمساوی ج ۱ ص ۱۲۶۔

بعض روایات میں مذکور ہے کہ خاموشی اور سکوت بات کرنے سے بہتر ہے۔

۱۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:

نَجَاۃُ الْمُؤْمِنِ فِی حِفْظِ لِسَانِہٖ (۱)

مومن کی نجات زبان کی حفاظت میں ہے۔

۲۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

مَنْ صَمَتَ نَجیٰ (۲)

جو خاموش رہا وہ کامیاب ہوا۔

۳۔ امام جعفر الصادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

قَالَ لُقمانُ لِابْنِہٖ یَا بُنَیَّ اِنْ زَعَمْتَ اَنَّ الْکَلَامَ مِنْ فِضَّۃٍ فَاِنَّ السُّکُوتَ مِنْ ذَھَب (۳)

لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا، عزیز بیٹے! اگر تمہارا خیال ہے کہ بات کرنا چاندی کے برابر ہے تو جان لو خاموش رہنا سونے کے برابر ہے۔

۴۔ رسول اللہؐ نے فرمایا:

مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَسْلَمَ فَلْیَلْزِمِ الصَّمْتَ (۴)

جو شخص اپنی سلامتی کا خواہاں ہو اسے خاموشی کو اپنا شیوہ بنانا چاہیئے۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۱۱۴۔

(۲) الحقایق فی محاسن الاخلاق ص ۶۵۔

(۳) اصول کافی ج ۲ ص ۱۱۴۔

(۴) محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۱۹۳۔

اہل تحقیق کا شیوہ

امام صادقؑ نے خاموشی کے فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: خاموشی اور سکوت اہل تحقیق کا شیوہ اور ان لوگوں کا وتیرہ ہے جو بصیرت کی آنکھوں سے کائنات کی ٹھوس اور اٹل حقیقتوں کا مطالعہ کرتے ہیں وہ سابقہ حقائق اور ماضی کے لمحات میں غور و فکر کرتے ہیں اور ایسے حقائق بیان کرتے ہیں جن کا ذکر قلم اور کتابوں کے ذریعے نہیں ہوا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: خاموشی کے ایسے فوائد و آثار ہیں جن کی طرف اشارہ کیا جاتا:

۱۔ خاموشی دنیا و آخرت کی ہر آسایش کی چابی ہے۔

۲۔ اللہ کی خوشنودی کا باعث ہے۔

۳۔ قیامت کے دن حساب میں آسانی کا باعث ہے۔

۴۔ خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہے۔

۵۔ جاہل کے لئے پردہ اور ساتر ہے نیز عالم کے واسطے باعث زینت ہے۔

۶۔ نفسانی خواہشات کو روکنے کا سبب ہے۔

۷۔ نفس کے لئے ریاضت کا وسیلہ ہے۔

۸۔ عبادت اور اللہ کے ساتھ راز و نیاز کی لذت و حلاوت کو درک کرنے کا ذریعہ ہے۔

۹۔ دل کی قساوت اور سختی کو ختم کرتی ہے۔

۱۰۔ حیاء اور پرہیزگاری کے حصول کا ذریعہ ہے۔

۱۱۔ تدبّر، تعقّل، مروّت اور مردانگی میں اضافے کا باعث ہے۔

۱۲۔ فہم، دانائی اور عقل کی موجب ہے۔

اس کے بعد امام صادقؑ نے فرمایا: اب جبکہ تم زیادہ باتیں کرنے کے نقصانات اور عیوب سے آگاہ ہوچکے ہو تو تمہیں چاہیئے جب تک (بات کرنے پر) مجبور نہ ہوجاؤ اپنی زبان مت کھولو خاص کر اگر کسی ایسے شخص کو نہ پاؤ جس کے ساتھ خدا کی خاطر اور خدا کی راہ میں بات کرسکو۔

اس کے بعد فرمایا: لوگوں کی ہلاکت اور نجات بات کرنے اور خاموش رہنے میں ہے۔ پس خوش نصیب ہے وہ شخص جسے اچھی اور بری باتوں کی شناخت کی توفیق حاصل ہو اور جسے کم بولنے اور سکوت کے فوائد و آثار کا پتہ چل جائے، کیونکہ خاموشی انبیائے الٰہی کے اخلاق کا حصہ اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کا وتیرہ ہے۔ اگر کوئی گفتگو کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو تو وہ سکوت کو اپنا شیوہ بنائے گا، اور جو شخص سکوت کی لطافت سے آگاہ اور واقف ہوجائے۔ وہ خاموشی اور سکوت کو اپنے دل کے خزانوں اور اسرار کا امین بنائے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اس کی گفتگو اور خاموشی دونوں ہی عبادت کا درجہ حاصل کریں گی نیز وہ خدا کی خاطر اور اسی کی راہ میں گفتگو کرے گا۔ ایسی عبادت و بندگی سے سوائے خدا کے کوئی آگاہ نہیں ہے[1]

ایک ضروری وضاحت اور قابل غور نکتہ

البتہ اس بات کی یاد دہانی ضروری ہے کہ خاموشی سے متعلق احادیث کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ہمیشہ اور ہر حالت میں اپنی زبان بند رکھے اور کوئی بات نہ کرے یہاں تک کہ اپنے دوست و احباب کے حق کو ثابت کرنے یا اپنا دفاع کرنے کے لئے بھی بات نہ کرے، بلکہ ان احادیث کا مقصد بے فائدہ اور فضول باتوں سے روکنا ہے کیونکہ اگر ہم خاموشی سے متعلق احادیث کا یہ مطلب لیں کہ انسان کو ہر حالت میں خاموشی اختیار کرنی چاہیئے، یہاں تک کہ ظالموں کے ظلم اور مفسدوں کی فساد انگیزی کے سامنے بھی خاموش رہنا چاہیئے تو یہ نظریہ یقیناً شریعت اسلامیہ کے مسلمہ اصولوں کے برخلاف ہوگا۔

---

(۱) مصباح الشریعہ باب ۲۷۔

اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا شمار اہم ترین واجبات میں سے کیا ہے۔ اور ظلم کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرنے کو عظیم گناہ قرار دیا ہے۔ اگر مفاسد اور مظالم کے آگے خاموشی اچھی بات فرض کی جائے تو اسلام کا وجود خطرے میں پڑجائے گا۔ اس قسم کے موقعوں پر اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ مہر سکوت کو توڑ کر آواز بلند کی جائے اور لوگوں کو بھی ظلم و ستم اور برائیوں کے خلاف قیام پر آمادہ کیا جائے کیونکہ

اگر بینی کہ نابینا و چاہ است　　　　اگر خاموش بنشینی گناہ است

یعنی اگر تم دیکھ رہے کہ اندھا آدمی جارہاہے اور سامنے کنواں ہے تو اس وقت خاموش بیٹھے رہنا گناہ ہے۔

جن احادیث میں خاموشی کی فضیلت اور تعریف بیان کی گئی ہے ان کا مقصد ان باتوں سے روکنا ہے جو فضول اور بے جا ہوں یا غیبت، تہمت، جھوٹ اور افتراء وغیرہ پر مشتمل ہوں۔ ایسے موقعوں پر یقیناً انسان کو اپنے اوپر کنٹرول برقرار رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنی چاہیئے۔

اَلصَّمْتُ اَلْیَقُ بالفتیٰ مِنْ مَنْطِقٍ فِیْ غَیْرِ حِیْنِہٖ (۱)

یعنی بے موقع گفتگو کرنے سے بہتر ہے کہ خاموش رہا جائے۔

بعض احادیث میں ایسی گفتگو کو جو نقصان دہ نہ ہو اور انسان کے ایمان کو اس سے کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، خاموشی پر ترجیح دی گئی ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

رَحِمَ اللّٰہُ عَبْداً قالَ خَیْراً فَغَنِمَ اَوْ سَکَتَ عَنْ سُوْءٍ فَسَلِمَ (۲)

اللہ کی رحمت ہو اس بندے پر جو اچھی بات کرکے فائدہ حاصل کرے یا بری بات کرنے سے پرہیز کرے اور سلامت رہے۔

---

(۱) الذریعہ الی مکارم الشریعہ ص ۹۶۔

(۲) مشکوۃ الانوار ص ۱۷۵۔

گفتگو کا نتیجہ

گزشتہ عرایض کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ لیتے ہیں کہ گفتگو کی نعمت اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود دو مثبت اور منفی پہلوؤں کی حامل ہے. خودسازی کے ابتدائی مرحلے میں اس کے مثبت پہلو کی نسبت منفی پہلو پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ جب انسان اس مرحلے کو کسی حد تک طے کرے اور اپنی زبان پر قابو پالے اس کے بعد " سکوت " کے بجائے صَمت پر بحث کی جاتی ہے کیونکہ ہر قسم کے سکوت کو صمت نہیں کہا جاتا۔ صمت سے مراد با مقصد اور سوچی سمجھی خاموشی ہے یعنی معقول اور بجا خاموشی ۔ یاد رہے کہ ہر قسم کا سکوت مطلوب اور مرغوب نہیں ہے لیکن معقول اور بجا خاموشی مطلوب ہے. کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کرچکے بہت سے موقعوں پر زبان سے عقیدہ کا اظہار اور امر و نہی واجب ہے۔ ایسے موقعوں پر خاموشی حرام ہے۔ (تامل فرمائیں)۔

غیبت

زبان کے تباہ کن نقصانات میں سے ایک غیبت ہے جس کا شمار گناہان کبیرہ میں ہوتا ہے غیبَتٌ (غین کے کسرہ کے ساتھ) جو زِینَتٌ کا ہم وزن ہے، سے مراد ہے دوسروں کی عدم موجودگی میں ان کی بدگوئی کرنا اور انکے بارے میں غیر پسندیدہ بات کرنا۔

یہ تعریف غیبت کی مختلف قسموں یعنی بہتان ، تہمت ، افک [1] ، گالی اور عیوب کے ذکر تک کو شامل ہے حالانکہ ان میں سے ہر ایک کی اصطلاحی تعریف دوسرے کی تعریف سے مختلف ہے اور ہر ایک قسم شرعی نقطہ نظر سے مخصوص احکام کی حامل ہے۔ یہ سب غیبت

---

(۱) بہتان اور تہمت سے مراد یہ ہے کہ حقیقت کے خلاف کسی شخص کے ساتھ کوئی چیز منسوب کی جائے۔ لیکن افک سے مراد سنگین اور سخت قسم کا جھوٹ ہے۔ شرعی اصطلاح میں خدا اور رسول سے جھوٹی بات منسوب کرنے کو افک کہا جاتا ہے۔

کی اصطلاحی تعریف میں شامل نہیں ہیں۔ بنابریں غیبت کا لغوی مفہوم اس کے اصطلاحی مفہوم سے وسیع تر ہے۔ بعض احادیث میں بھی غیبت سے مراد یہی (وسیع تر مفہوم) مراد لیا گیا ہے۔

فقہا کی نظر میں غیبت کی شرائط

پہلی شرط ۔ پہلی شرط یہ ہے کہ غیبت سے کسی کا راز فاش ہو اور پوشیدہ عیوب آشکار ہوں ۔ بنابریں ان عیوب اور گناہوں کو بیان کرنا غیبت میں شامل نہیں جو ظاہر اور عیاں ہوں اس عمل سے غیبت کا گناہ لازم نہیں آئے گا۔ ممکن ہے کہ یہ عمل دوسروں کی توہین و تحقیر یا ترویج گناہ کے باعث حرام اور ممنوع ہو ۔ لیکن اس کا عقاب غیبت کے عقاب کے برابر نہیں ۔

دوسری شرط ۔ یہ ہے کہ عیب کا تذکرہ جھوٹ پر مبنی نہ ہو یعنی جس شخص کی غیبت کی جائے اس کے اندر یہ عیب موجود ہو ۔ پس اگر مذکورہ عیب اس کے اندر موجود نہ ہو اور نسبت جھوٹی ہو تو یہ غیبت نہیں تہمت ہے اور تہمت لگانے والا افتراء کے جرم میں سزا کا مستحق ہوگا۔ تہمت کا گناہ غیبت کے گناہ سے زیادہ شدید ہے ۔

تیسری شرط ۔ یہ ہے کہ عیب جوئی کی نیت کارفرما ہو ۔ بنابریں اگر دوسروں کے عیوب کا ذکر ان کے مفادات کی حفاظت کے لئے ہو تو شرعی طور پر کوئی حرج نہیں اگر چہ جس شخص کی غیبت کی جائے وہ راضی نہ ہو ۔ ڈاکٹر کے پاس بیمار کے عیوب کا تذکرہ اسی مسئلے کی ایک مثال ہے بشرطیکہ بیمار کا فائدہ اس عیب کے بیان کرنے میں ہو اگر چہ ممکن ہے کہ بیمار ابتدائے امر میں اس عیب کے اظہار سے ناراض ہوجائے ۔

اس طرح لوگوں کی خوبیوں کو تعریف کے طور پر بیان کرنا بھی غیبت کے زمرے میں نہیں آتا اگر چہ وہ اپنی خوبیوں کے بیان سے ناراض ہوتے ہوں۔ البتہ اگر کسی کی خوبیوں کو بیان کرنا اس کے لئے باعث اذیت و آزار ہو تو یہ عمل اچھا نہیں لیکن یہ غیبت ہونے کی بناپر نہیں بلکہ مؤمن کو ایذا پہنچانے کی وجہ سے قبیح ہے جو الگ حکم کا حامل ہے۔

چوتھی شرط۔ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی جائے وہ مجہول نہ ہو بلکہ اس کے نام کے ذکر کی بناء پر یا اشارہ و کنایہ کے ذریعے سننے والے کو اس کی شناخت ہو جائے۔ بنابریں اگر غیبت کرنے والا اس شخص کو مجہول و مبہم رکھے یا سننے والا اسے نہ پہچانتا ہو تو یہ عمل غیبت محسوب نہیں ہوگا۔

پانچویں شرط۔ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی جارہی ہو وہ مومن اور دینی بھائی ہو۔ بنابریں کافروں، مشرکوں اور ملحدوں کی غیبت جائز ہے۔

چھٹی شرط۔ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی جائے وہ اعلانیہ گناہ کا مرتکب نہ ہوتا ہو۔ پس اگر کوئی کھلم کھلا گناہ کرتا ہو تو اس کی غیبت جائز ہے کیونکہ ایسے شخص کو گناہ کرنے اور گناہگار ہونے کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی اور اسے اس بات کا کوئی خوف نہیں ہوتا کہ لوگ اس کے غلط کاموں سے آگاہ ہوں۔

یہ تھیں وہ شرائط جو فقہائے دین اور علم اخلاق کے ماہرین بلکہ بعض اہل لغت کی تحریروں میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ انہوں نے شرعی شرائط کے طور پر ان کا ذکر کیا ہے۔ اگر چہ ان میں سے بعض شرائط کا لغوی معنی سے کوئی سروکار نہیں لیکن احادیث اور فقہی مآخذ میں ذکر شدہ شرائط کے پیش نظر شرعی احکام کے لاگو ہونے میں دخیل واقع ہو سکتے ہیں۔

اب ہم آپ کی توجہ اس سلسلے میں موجود قرآن کی آیات اور معصومین ؑ سے مروی احادیث کی طرف مبذول کرتے ہیں۔

غیبت قرآن کی نظر میں

اس بات میں کیا شک ہے کہ غیبت کا شمار گناہان کبیرہ میں ہوتا ہے اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا جہنم کا مستحق ہے:

جیسا کہ امام جعفر الصادق علیہ السلام نے قرآن کی اس آیت:

اِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُدْخَلاً كَرِيماً (۱)

اگر تم گناہان کبیرہ سے بچتے رہو تو ہم تمہارے (صغیرہ) گناہوں سے بھی درگذر کریں گے اور تمہیں بہت اچھی عزت کی جگہ پہنچا دیں گے۔

کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"اَلْكَبَائِرُ الَّتِي اَوْجَبَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهَا النَّارَ (۲)

گناہان کبیرہ سے مراد وہ گناہ ہیں جن پر خدائے عزوجل نے جہنم کی سزا مقرر فرمائی ہے۔

قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر غیبت کی زبردست مذمت کی گئی ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔

مثلاً ارشاد ربانی ہے:

وَيْلٌ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُمَزَةٍ (۳)

ھلاکت ہے ہر عیب جوئی کرنے والے چغل خور کی۔

---

(۱) سورہ النساء / ۳۱۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۲۷۶ کی طرف رجوع ہو۔

(۳) سورہ ہمزہ / ۱۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

وَ لَا یَغْتَب بَّعْضُکُمْ بَعْضاً اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّأْکُلَ لَحْمَ اَخِیهِ مَیْتاً فَکَرِهْتُمُوهُ۔(۱)

یعنی تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ (یقیناً) تم سب اس بات کو ناپسند کرتے ہو پس جان لو کہ غیبت اپنے دینی بھائی کے مردہ بدن کا گوشت کھانے کے مانند ہے لہذا اس سے سخت پرہیز کرنا چاہیئے؟

ان دونوں آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غیبت تب ہوگی جب عیب جوئی کا ارادہ ہو، کیونکہ پہلی آیت میں عیب جوئی اور چغل خوری پر مشتمل ہونے کی بنا پر غیبت کی مذمت ہوئی ہے، اور دوسری آیت میں غیبت کو برادر دینی کے مردہ بدن کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ غیبت دوسروں کی شخصیت کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ گویا غیبت کرنے والا غیبت کے ذریعے لوگوں کی شخصیت کو کچل کر پاش پاش اور کی حیثیت کو ختم کردیتا ہے۔ غیبت کرنے والا غیبت کے ذریعے دو کام انجام دیتا ہے، ایک یہ کہ وہ دوسرے کی بے عزتی کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ وہ اس طریقے سے اپنے آپ کو آبرومند بنانے کی کوشش کرتا ہے یعنی وہ دوسروں کی شخصیت کشی کو اپنی آبرومندی کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔

دوسرا نکتہ جو اس آیت سے حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ صرف مسلمانوں کی غیبت حرام ہے کیونکہ آیت میں "بَعْضُکُمْ بَعْضاً" اور "لحم اخیه" کے الفاظ صرف مومنین کو شامل ہیں اور مومنین کے علاوہ دوسروں کو شامل نہیں۔

---

(۱) سورۂ حجرات / ۱۲۔

اس آیت سے ایک تیسرا نکتہ بھی سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ کہ غیبت اس وقت غیبت کہلائے گی جب وہ شخص (جس کی غیبت کی جارہی ہو) سامنے موجود نہ ہو کیونکہ ایک تو غیبت کا لغوی معنی دوسرے کا موجود نہ ہونا ہے اور پھر "میتاً" کا لفظ بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے یاد رہے کہ آیت میں مغتاب (جس کی غیبت کی جائے) کو مردے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ گویا جس طرح مردہ آدمی سامنے نہیں ہوتا اور اپنی صفائی پیش نہیں کر سکتا اسی طرح وہ بھی موجود نہ ہونے کی وجہ سے اپنی آبرو اور حیثیت کا دفاع کرنے پر قادر نہیں ہے۔

مذکورہ آیت سے چوتھا نکتہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح مردہ زندہ نہیں ہوتا اسی طرح جب انسان کی آبرو ایک دفعہ چلی جائے تو وہ بھی واپس نہیں آسکتی (واللہ اعلم) کتنے ہی مغتاب (جس کی غیبت کی گئی ہو) ایسے ہیں جو اس دنیا سے آزردہ خاطر چلے گئے ہیں اور ان کے ساتھ آخرت میں بھی ملاقات ہوگی وہ خداوند متعال کے پاس اپنا دعوی دائر کرتے ہوئے اللہ سے فیصلہ چاہیں گے۔

نعوذ باللہ من شر الشیطان و من غضب الرحمان

ہم شر شیطان اور غضب پروردگار سے اللہ کے حضور پناہ مانگتے ہیں۔

احادیث میں غیبت کا تذکرہ

احادیث میں بھی سختی کے ساتھ غیبت سے منع کیا گیا ہے اور اس عمل شنیع کے برے نتائج کی نشاندہی کی گئی ہے۔

جناب شہید ثانی فرماتے ہیں:

اکثر لوگ نماز، روزہ اور بہت سی دیگر عبادات نیز خدا سے قریب کرنے والے اعمال کی بجا آوری کا سلسلہ جاری رکھنے میں کوشاں رہتے ہیں اور بہت سارے حرام امور مثلاً

، زنا، شراب نوشی ــــ سے اجتناب کرتے ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ اپنے اوقات کا اکثر حصہ لہو و لعب عیاشی اور فضول باتوں وغیرہ ــــ میں ضایع کرتے ہیں اپنے دینی بھائیوں کی آبرو پامال کرتے ہیں اور اس کام کو گناہ بھی شمار نہیں کرتے۔ گویا انہیں اس بات کا کوئی خوف نہیں ہوتا کہ اللہ تعالی اس قسم کے اعمال پر ان کا مواخذہ فرمائے گا۔

خلاصہ یہ کہ بہت سے لوگ غیبت کے مرتکب ہوتے ہیں گویا اسے حرام ہی نہیں سمجھتے اور اس نکتے سے غافل ہیں کہ وہ ایک غیبت کے ذریعے اپنے تمام نیک اعمال اور حسنات کو تباہ کررہے ہیں۔

مسلمان کی آبروریزی سودخوری سے بھی سنگین ہے

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

انَّ الدرهَمَ يُصِيبُهُ الرجُلُ مِن الربا اعْظَمُ عِندَاللهِ فِى الخَطِيئَة مِنْ سِتٍ وَ ثَلاثِينَ زَنيَةٍ يَزْنِيهَا الرَّجُلُ وَ اَربى الربَا عِرضُ الرَّجُلِ المُسْلِم (۱)

بہ تحقیق ایک درہم جو انسان سود کے ذریعے کماتاہے اس کا گناہ اللہ کے نزدیک چھتیس (۳۶) بار زنا کرنے سے زیادہ سنگین ہے اور سب سے سخت ربا (سود) مسلمانوں کی آبرو سے کھیلنا ہے۔

---

(۱) محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۵۳۔

غیبت زنا سے بری ہے

جابر بن عبداللہ اور ابو سعید خدری رسول اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

اِیَّاکُمْ وَ الْغِیبَۃَ فَاِنَّ الْغِیبَۃَ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا۔ اِنَّ الرَّجُلَ قَدْ یَزْنی فَیَتُوبُ، فَیَتُوبُ اللہُ عَلَیْہِ وَاِنَّ صَاحِبَ الْغِیبَۃِ لاَ یُغْفَرُ لَہ حَتّیٰ یَغْفِرَ لَہُ صَاحِبُہ [1]

غیبت سے اجتناب کرو، کیونکہ غیبت زنا سے بدتر ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص زنا کرنے کے بعد توبہ کرے اور اللہ اس کی توبہ قبول کرے لیکن غیبت کرنے والا نہیں بخشا جائے گا جب تک مقابل (جس کی غیبت کی گئی ہو) اس کو نہ بخشے۔

قرآن مجید اور احادیث میں غیبت کو مردہ انسان کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے یہ اس گناہ کی سنگینی کی دلیل ہے۔ اس قسم کی تعبیر صرف غیبت کے بارے میں آئی ہے۔

جب کسی کی غیبت کی جائے وہ اپنی عدم موجودگی کی بناء پر اپنی صفائی پیش نہیں کر سکتا نتیجۃً اس کی آبرو چلی جاتی ہے اور لوگوں کے درمیان اس کی شخصیت کا آبگینہ چکنا چور ہوجاتا ہے لہذا اسے مردے سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ جب کسی کی آبرو اور حیثیت لوگوں کے درمیان ختم ہوکر رہ جائے تو اس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں ہوتی اور وہ لوگوں کے درمیان ہمیشہ کے لئے جھکا رہ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے غیبت کرنے والے کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو اپنے مردہ مسلمان بھائی کا گوشت کھاتا ہے تاکہ اس طرح سے اپنی حیثیت اور آبرو بحال کرے۔

---

(۱) کشف الریبہ ص ۶۔

غیبت کے بارے میں قرآن کی اس تشبیہ (جس کی مثال نہیں ملتی) اور احادیث میں موجود تاکیدی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کام (جو دینی بھائی کے ساتھ بدترین قسم کا ظلم ہے) کس قدر قبیح ہے۔

نیک اعمال کا ضیاع

غیبت کے باعث انسان کے نیک اعمال تباہ و برباد ہوجاتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

اَلْغِیبَۃُ حَرام عَلیٰ کُلّ مسلمٍ وَ اِنَّھا لَتَاْکُلُ الْحسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النّارُ اَلْحَطَبَ ۔ (۲)

ہر مسلمان پر غیبت حرام ہے۔ بہ تحقیق غیبت نیکیوں کو اسی طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔

گاہے انسان غیبت کرتا ہے اور اس کے سارے نیک اعمال ختم ہوکر رہ جاتے ہیں۔ یہ نیک اعمال اس شخص کے نامہ اعمال میں درج کئے جاتے ہیں جس کی اس نے غیبت کی ہو۔

ہم اس بارے میں ایک حدیث کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں:

رسول اللہؐ نے فرمایا:

یُؤتیٰ اَحَدُکُمْ یَوْمَ الْقِیامَۃِ فَیُوقَفُ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ تَعَالیٰ وَ یُدْفَعُ اِلَیْہِ کِتَابُہُ فَلَا یَریٰ حَسَنَاتِہِ فَیَقُولُ اِلٰھِی لیس ھذا کِتَابِی فَاِنّی لاَ اَریٰ فِیْہِ طَاعَتِی فَیَقُولُ لَہُ اِنَّ رَبَّکَ لَا یَضِلُّ وَلاَ یَنْسیٰ وَ ذَھَبَ عَمَلُکَ

---

(۱) محجۃ البیضاء ج/۵ ص ۲۵۵۔

بِاغْتِيَابِ النَّاسِ ثُمَّ يُؤتیٰ بِآخَرَ وَ يُدْفَعُ اِلَيْهِ كِتَابُهُ فَيَرَىٰ فِيْهِ طَاعَاتٍ كَثِيْرَةً فَيَقُولُ اِلٰهِي مَا هٰذا كِتَابِي فَاِنِّي مَا عَمِلْتُ هٰذِهِ الطَّاعَاتِ فَيُقُوْلُ لَهُ اِنَّ فَلَانًا اِغْتَابَكَ فَدُفِعَتْ حَسَنَاتُهُ اِلَيْكَ (۱)

قیامت کے دن تم میں سے کسی کو (حساب کے واسطے) لایا جائے گا پس اسے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کھڑا کیا جائے گا اور اس کا نامہ اعمال اس کے حوالے کیا جائے گا۔ وہ (اس میں) اپنی نیکیاں نہیں پائے گا تو کہے گا خدایا یہ میرا نامہ اعمال نہیں ہے کیونکہ میں اس میں اپنے اعمال کو نہیں دیکھتا کیونکہ جو میں نے نیک اعمال انجام دیے اس میں موجود نہیں۔ تب اللہ اس سے کہے گا بہ تحقیق تمہارا رب خطا و نسیان سے منزہ ہے (یہ تمہارا ہی نامہ اعمال ہے) لیکن تمہارے اعمال ضایع ہو گئے ہیں کیونکہ تم لوگوں کی غیبت کرتے تھے۔ اس کے بعد ایک اور شخص کو حاضر کیا جائے گا اور اس کا نامہ اعمال اسے دیا جائے گا تو وہ اس میں بہت ساری عبادات و طاعات کا مشاہدہ کرے گا تب وہ کہےگا خدایا یہ میرا نامہ عمل نہیں کیونکہ یہ طاعتیں میں نے انجام نہیں دیں۔ پس اللہ اس سے فرمائے گا فلاں آدمی نے تمہاری غیبت کی لھذا اس کی نیکیاں تجھے دی گئیں۔

---

(۱) جامع السعادات ج ۲ ص ۳۰۶۔

غیبت کی سزا

جو شخص کسی دوسرے کی غیبت کرے وہ یقیناً قیامت کے دن سخت عذاب میں مبتلا ہوگا۔

مَنْ اَکَلَ لَحْمَ اَخِیْهِ فِی الدُّنیا قُرِّبَ اِلَیْهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَیُقَالُ لَهُ کُلْهُ مَیْتاً کَمَا اَکَلْتَهُ حَیاً فَیَاکُلُهُ وَ یَکْلَحُ وَ یَضِجُّ۔ (۱)

جو شخص دنیا میں اپنے بھائی کا گوشت کھائے (اسکی غیبت کرے) قیامت کے دن اس اس شخص (جس کی غیبت کی گئی تھی) کے پاس لے جایا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا جسطرح تم (دنیا میں) زندہ حالت میں اس کا گوشت کھاتا تھا اسی طرح اب جبکہ وہ مرا ہوا ہے اس کا گوشت کھاؤ۔ پس وہ اس کا گوشت کھائے گا پھر تکلیف کے مارے تیوری چڑھائے گا اور نالہ و فریاد کرے گا۔

غیبت کرنے والا حلال زادہ نہیں

بعض احادیث میں مذکور ہے کہ جو شخص دوسروں کی عدم موجودگی میں ان کی برائی بیان کرے، ان کی آبرو پامال کرے اور ان کی شخصیت کو گھٹائے وہ حلال زادہ نہیں کیونکہ اگر حلال طریقے سے کوئی نطفہ ٹھہر جائے تو وہ کبھی گناہ میں مبتلا نہیں ہوتا۔

رسول اللہؐ سے مروی ہے:

کَذِبَ مَنْ زَعَمَ اَنَّهُ وُلِدَ مِنْ حَلَالٍ وَ هُوَ یَاکُلُ لُحُومَ النَّاسِ بِالغیبَةِ فَاِنَّهَا اِدَامُ کِلَابِ النَّارِ (۲)

وہ شخص جھوٹا ہے جو غیبت کے ذریعے لوگوں کا گوشت کھاتاہے اور پھر یہ خیال کرتاہے کہ وہ حلال زادہ ہے کیونکہ غیبت جہنم کے کتوں کی غذا ہے۔

---

(۱) الترغیب والترهیب ج ۳ ص ۵۰۸۔

(۲) بحارالانوار ج ۷۲ ص ۲۵۸۔

شاید اس حدیث میں حلال زادہ نہ ہونے سے مراد رزق حرام کا استعمال اور رزق حرام سے بنے ہوئے نطفے سے متولد ہونا ہو نہ کہ زنا و غیرہ سے متولد ہونا خاص کر اس بات کے پیش نظر کہ غیبت کی تشبیہ مردار کا گوشت کھانے سے دی گئی ہے گویا یہ حرام خوری انعقاد نطفہ کے دوران حرام خوری کا نتیجہ ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

غیبت کرنے والا مومن نہیں

ایک اور حدیث میں مذکور ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی عدم موجودگی میں اس کی بدگوئی کرے وہ بے ایمان ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِقَلْبِهِ لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِينَ وَلَا تَتَبَّعُوا عَوْرَاتِهِمْ فَإِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَةَ أَخِيهِ تَتَبَّعَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ وَمَنْ تَتَبَّعَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ يَفْضَحْهُ وَلَوْ فِي جَوْفِ بَيْتِهِ (۱)

اے زبان سے ایمان لانے والو جو دل سے ایمان نہیں لے آئے! مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور ان کے پوشیدہ عیوب کی جستجو نہ کرو کیونکہ جو شخص اپنے دینی بھائی کے عیوب کی جستجو کرے اللہ تعالی اس کے عیوب کو فاش کردیتا ہے اور اللہ جس کے عیوب کو فاش کردے اسے رسوا کردیتا ہے خواہ وہ اپنے گھر کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔

غیبت کی اقسام

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ غیبت کا تعلق صرف زبان سے ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ جس طریقے سے بھی دوسرے شخص کے عیوب و نقائص کی طرف اشارہ کیا جائے وہ غیبت

---

(۱) احیاء علوم الدین، مطبوعہ بیروت ج/۳ ص ۱۴۲، کشف الریبۃ، ص ۷، تفسیر قرطبی، ج/۱۶، ص ۳۳۳، تفسیر برہان، ص ۲۰۹۔ (مختصر سے فرق کے ساتھ)

میں شامل ہے بنابرین زبان، قلم، اشارے، کنایے، رمز اور نقل اتارنے (مثل چلنے کی نقل اتارنا) وغیرہ کے ذریعے کسی کے عیوب و نقائص کی طرف اشارہ ہو تو یہ سارے امور غیبت میں شامل اور حرام ہیں۔ احادیث میں اس مسئلے کو صریحاً بیان کیا گیا ہے۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں:

دَخَلَتْ عَلَيْنَا امْرَأَةٌ فَلَمَّا وَلَّتْ أَوْمَأْتُ بِيَدِي أَنَّهَا قَصِيرَةٌ قَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ قَدِ اغْتَبْتِهَا

ایک عورت ہمارے ہاں آئی پھر جب وہ واپس چلی تو میں نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس کا قد چھوٹا ہے پس رسول اللہؐ نے فرمایا: بہ تحقیق تو نے اس کی غیبت کی ہے۔

بہر حال اگر کوئی شخص کسی خاص آدمی کا نام تو نہ لے لیکن اس طرح سے بات کرے کہ سننے والوں کو قرآئن سے اندازہ ہوجائے کہ بولنے والے کا مقصود کون ہے تو یہ بھی غیبت ہے۔

غیبت سننا بھی حرام ہے

جس طرح غیبت کرنا حرام ہے اسی طرح غیبت سننا بھی حرام اور باعث گناہ ہے۔ اس مسئلے میں علمائے اخلاق اور فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

صاحب جواہرؒ اور شیخ انصاریؒ مرحوم اور امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

يحرم استماع الغيبة بلا خلاف[1]

غیبت سننا حرام ہے اور اس حرمت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔

---

(۱) جواھر الکلام ج ۲۲ ص ۷۱۔

کتاب مفتاح الکرامہ میں مذکور ہے "غیبت سننے کی حرمت اس قدر واضح ہے کہ اکثر فقہاء نے اس کے واضح ہونے پر اکتفا کرتے ہوئے اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے"۔

غیبت سننے کی حرمت احادیث کی روشنی میں

اس سلسلے میں چند احادیث سے استدلال کیا گیا ہے جن میں بعض کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔ جناب صدوق حدیث مناہی میں رسول اللہؐ سے نقل کرتے ہیں:

وَ نَهىٰ عَنِ الغيبَةِ وَ الاِستِماعِ اِلَيها (۱)

رسول اللہؐ نے غیبت کرنے اور غیبت سننے سے منع فرمایا۔

آپؐ نے فرمایا:

اَلسّامِعُ لِلغِيبَةِ اَحَدُ المُغتابَينِ (۲)

غیبت سننے والا غیبت کرنے والے میں سے ایک ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ:

اَلغِيبَةُ كُفرٌ وَ المُستَمِعُ لَهَا وَالرّاضِيُ بِهَا مُشرِكٌ (۳)

غیبت کرنا کفر ہے نیز اس کو سننے اور اس سے راضی ہونے والا مشرک ہے۔

کان کی ذمہ داریاں

قرآن کریم انسان کی ذمہ داریوں کو زبان اور گفتگو کی حد تک محدود نہیں رکھتا بلکہ آنکھوں، کانوں اور دل کو بھی انسانی ذمہ داریوں میں اس کا شریک قرار دیتا ہے۔

---

(۱) من لا یحضرہ الفقیہ ج/ ۴ ص ۴۔

(۲) مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۱۰۸۔

(۳) مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۱۰۸ کی طرف۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولاً (۱)

جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ چلو بہ تحقیق کان آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہوگا۔

امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَ أَمَّا حَقُّ السَّمْعِ فتنزيهه عَنْ ان تَجْعَلَه طريقاً إِلىٰ قَلْبِكَ إِلاّ لِفُوهَةٍ كريمةٍ تُحدِثُ قَلْبَكَ خيراً أَوْ تَكسِبُ خُلقاً كريماً فانّه بَابُ الكَلَامِ إِلى القَلْبِ يُؤَدّي إِلَيْه ضُرُوبَ المَعَانِي عَلى ما فيها مِنْ خَيْرٍ او شَرٍ وَلا قُوَّةَ إِلّا بِالله (۲)

رہا کان کا حق تو وہ یہ ہے کہ تو اسے باہر کی دنیا اور اپنے دل کے درمیان ارتباط کا ذریعہ قرار نہ دو مگر اس وقت جب تم ایسی اچھی اور حکیمانہ باتوں کو منتقل کرنا چاہو جو تیرے دل میں اچھے خیالات پیدا کریں یا تجھے کسی اچھی خصلت سے سرافراز کرے کیونکہ کان دل کا دروازہ ہے جہاں سے قسم قسم کے مفاہیم اپنی خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ دل کو منتقل ہوتے ہیں اور خدا کے بغیر کسی کو کوئی قوت حاصل نہیں۔

---

(۱) سورہ الاسراء / ۳۶۔

(۲) تحف العقول ص ۱۸۴۔

غیبت کو رد کرنا اور برادر دینی کا دفاع

غیبت کا مسئلہ چار احکام کا حامل ہے۔

۱) غیبت کرنے کی حرمت۔

۲) غیبت سننے کی حرمت۔

۳) نہی عن المنکر۔

۴) اپنے دینی بھائی کی حیثیت اور آبرو کی حفاظت۔

یعنی غیبت کے مسئلے میں نہی عن المنکر کے وجوب کے علاوہ غیبت کی تردید اور دینی بھائی کی آبرو کی حفاظت بھی واجب ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر چہ غیبت کو نہ سننا اور غیبت کرنے والے کی گفتگو سے بے اعتنائی نہی عن المنکر کی رو سے واجب ہے لیکن صرف اتنا کافی نہیں بلکہ ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے برادر دینی کی صفائی پیش کرے اور اس کی عزت بچانے کی کوشش کرے۔ دوسرے لفظوں میں ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اس کے برادر دینی پر جو اعتراضات کئے جائیں یا اس کے جو عیوب بیان کئے جائیں انہیں صحیح طریقے سے اس طرح رفع کیا جائے جس سے اللہ راضی ہو اور اس طرح غلط افواہیں پھیلانے اور برائیوں کی ترویج کے لئے فضا سازگار ہونے نہ دے تاکہ کسی کو پھر یہ جرات نہ ہو کہ آنکھیں بند کرکے مومنوں کے بارے میں غلط باتیں پھیلائے اور ان کی عزت و حیثیت کو تہمت، بہتان اور غیبت کے ذریعے پامال کرے کیونکہ خدائے عزیز و کریم مومنوں کی عزت، عظمت اور سربلندی کا خواہاں ہے اور ان عوامل و اسباب کو ناپسند فرماتا ہے جو ان اقدار کے لئے ہوں۔ اس لئے اللہ نے حکم دیا ہے کہ صاحب ایمان مسلمان اس طرح کے تخریبی عوامل کے مقابلے میں خاموش نہ رہیں اور کسی کو اس بات کی اجازت نہ دیں کہ وہ افواہوں، باطل کی ترویج اور غیبت کے ذریعہ معاشرے کی فضا کو مسموم اور مسلمانوں کی عزت و حیثیت کو داغدار اور بے بنیاد پروپیگنڈوں کے ذریعے

لوگوں کے باہمی اعتماد کے جذبے کو متزلزل کرے۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غیبت کی تردید سے مراد وہی نہی عن المنکر ہے جو گناہ کے وقوع یا اس کے تکرار کو روکنے کے معاملے میں سب پر واجب ہے لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا غیبت کی تردید کا مسئلہ نہی عن المنکر سے ہٹ کر کوئی اور چیز ہے۔ یہاں صرف اتنا کافی نہیں کہ غیبت کرنے سے منع کیا جائے یا اس کی روک تھام کی جائے بلکہ اس کے علاوہ ایسے اقدام کی ضرورت ہے جس کے باعث اس شخص کی حیثیت اور آبرو بحال ہو جس کی غیبت کی گئی ہو۔

کتاب مکاسب محرمہ میں جناب شیخ انصاری ؒ فرماتے ہیں:

وَ الظَّاهِرُ اَنَّ الرَّدَّ غَيرَ النَّهيَ عَنِ الغِيبَةِ وَ المُرادُ بِه الاِنتِصارُ لِلغَائِبِ بِما يُنَاسِبُ تِلكَ الغِيبَةِ فَاِن كَانَ عَيباً دُنيَوِياً اُنتُصِرَ لَهُ بِاَنَّ العَيبَ لَيسَ اِلاَّ مَا عَابَ اللهُ بِهِ مِنَ المَعَاصِي الَّتِي مِنْ اَكبَرِهَا ذِكرُكَ اَخَاكَ بِمَا لَمْ يَعِبهُ اللهُ بِهِ وَ اِنْ كَانَ عَيباً دِينِياً وَجَّهَه بِمَحَامِلَ تُخرِجُه عَنِ المَعصِيَةِ

یعنی بظاہر غیبت کی تردید کا مسئلہ غیبت سے روکنے کے علاوہ ہے غیبت کی تردید سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کی غیبت ہو رہی ہو اس کی حمایت اس طرح سے کی جائے جو اس غیبت کے متناسب ہو پس اگر غیبت دنیوی عیوب کے بارے میں ہوئی ہے تو اس کی صفائی یوں پیش کی جائے کہ (یہ کوئی عیب نہیں بلکہ) در حقیقت عیب تو وہ گناہ ہے جس سے اللہ نے منع کیا ہے اور ان گناہوں میں سے ایک سنگین ترین گناہ یہی ہے کہ تو اپنے بھائی کا ذکر ایسی چیز کے ساتھ کرے جسے اللہ نے عیب قرار نہیں دیا۔ یعنی غیبت کرنے والے سے کہا جائے کہ تیرا غیبت کرنا (بجائے خود عیب ہے۔) اور اگر کسی ایسی صفت کے بارے میں غیبت ہو جو دینی نقطہ نظر سے عیب ہو (مثلاً غیبت کرنے والا کہے کہ فلاں آدمی فلاں گناہ کا مرتکب ہوا ہے) تو اس کی ایسی

تاویل کی جائے جس کے باعث وہ عمل گناہ کے دائرے سے خارج ہوجائے۔ (مثلاً اگر اس نے نامحرم پر نظر کی تھی تو اس طرح سے صفائی پیش کی جائے کہ شاید اس نے اپنا محرم سمجھ کر اس پر نگاہ کی تھی یا اگر اس نے نماز ترک کی تھی تو کہا جائے کہ شاید اس نے بھول کر نماز نہ پڑھی ہو یا کسی اور مقام پر کسی اور وقت میں نماز پڑھی ہو۔

خلاصہ یہ کہ اس قسم کی درست تاویلات سے کام لیا جائے۔

اسی لئے شیخ انصاری اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَاِنْ لَمْ یَقْبَلِ التَّوجِیْہَ انتَصَرَ لہ بِاَنَّ المُؤمِنَ قَدْ یُبْتَلیٰ بالمَعْصِیَۃِ فَیَنْبَغِی اَنْ یُسْتَغْفَرَ لَہُ وَیَہتمّ لہ لاَ اَنْ تُعَیِّرَ عَلَیْہِ وَاَنَّ تَعْیِیْرَکَ اِیّاہُ لَعَلّہ اَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰہِ مِنْ مَعْصِیَتِہ وَ نَحْوِ ذَالِکَ (۱)

اگر اسی عیب کی تاویل اور اسے کسی جائز امر کی طرف پلٹانا ممکن نہ ہو تو اس (جس کی غیبت ہوئی ہو) کی حمایت یہ کہہ کر کی جائے کہ مومن گاہے گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ پس مناسب یہ ہے کہ اس کے لئے طلب مغفرت کی جائے اور اس کے ساتھ ہمدردی کی جائے نہ یہ کہ اس کی سرزنش کی جائے (اور اسے رسوا کیا جائے) کیونکہ ممکن ہے کہ شاید تمہاری طرف سے اس کی مذمت اور سرزنش اللّٰہ کے نزدیک اس کے گناہ سے زیادہ سنگین ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

---

(۱) شیخ انصاری کی کتاب مکاسب محرمہ ص ۴۶ و ص ۴۷۔

بہر حال انسان کے اوپر لازم ہے کہ وہ اپنے دینی بھائی کے بارے میں ہونے والی غیبت کی ممکنہ حد تک تردید کرے اور اس کی حمایت سے دریغ نہ کرے۔

غیبت کی تردید کے مثبت اثرات

۱۔ دنیا و آخرت میں اللہ کی مدد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا ارشاد ہے:

مَنْ اُغْتِيْبَ عِنْدَہ اَخُوہُ الْمُؤمِنُ وَ هُوَ يَسْتَطِيْعُ نَصْرَہ فَنَصَرَہ نَصَرَہُ اللّٰہُ تعالیٰ فِی الدُّنیَا وَ الآخِرَۃِ ۔ (۱)

جس شخص کے پاس اس کے برادر دینی کی غیبت کی جائے اور وہ اس کی مدد پر قادر ہو چنانچہ وہ اس کی مدد کرے تو اللہ تعالی دنیا و آخرت میں اس کی مدد فرمائے گا۔

۲۔ بلاؤں سے نجات

رسول اللہؐ سے منقول ہے:

مَنْ رَدَّ عَنْ اَخِيْہِ غِيْبَۃً سَمِعَھا فِیْ مَجْلِسٍ رَدَّ اللّٰہُ عَنْہُ اَلْفَ بَابٍ مِنَ الشَّرِ فِی الدّنیا وَ الآخِرَۃِ (۲)

جو شخص کسی محفل میں اپنے (دینی) بھائی کی غیبت سنے اور اس کی تردید کرے۔ اللہ تعالی دنیا و آخرت میں ایک ہزار قسم کی برائیوں کو اس سے دور کرے گا۔

---

(۱) ثواب الاعمال ص ۱۷۸۔

(۲) شیخ انصاری کی کتاب المکاسب المحرمہ ص ۴۶۔

۲ ۔ جنت کا حصول

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

مَنْ رَدَّ عَنْ عِرْضِ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ اَلْبَتَّةَ (۱)

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی آبرو کی حفاظت کرے۔ بہ تحقیق جنّت اس کے لئے واجب ہو جائے گی۔

غیبت کی تردید نہ کرنے کے نقصانات

(۱) دنیا و آخرت میں ذلت و خواری

رسول اکرمؐ کی ایک حدیث میں مذکور ہے:

... وَ مَنْ خَذَلَهُ وَ هُوَ يَسْتَطِيعُ نَصْرَهُ خَذَلَهُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ (۲)

جس شخص کے پاس اس کے دینی بھائی کی غیبت کی جائے اور وہ اس کی حمایت پر قادر ہونے کے باوجود اس کی حمایت نہ کرے تو اللہ تعالی دنیا و آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا۔

(۲) ستر بار غیبت کرنے کا گناہ

مرحوم شیخ صدوق ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

فَاِنْ هُوَ لَمْ يَرُدَّهَا وَ هُوَ قَادِرٌ عَلٰى رَدِّهَا كَانَ عَلَيْهِ كَوِزْرِ مَنِ اغْتَابَهُ سَبْعِيْنَ مَرَّةً۔ (۳)

پس اگر وہ اپنے برادر دینی کی غیبت کو رد کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اس کی تردید نہ کرے تو اس کا گناہ غیبت کرنے والے کے گناہ کا ستر گناہ ہو گا۔

---

(۱) بحارالانوار مطبوعہ بیروت ج ۷۲ ص ۲۶۱۔

(۲) مکاسب محرمہ ص ۴۶۔

(۳) من لا یحضرہ الفقیہ ج ۴ ص ۹۔

غیبت کا سرچشمہ

اب جبکہ ہم آیات قرآنی اور احادیث کی روشنی میں اس گناہ کی سنگینی اور قباحت سے آگاہ ہوچکے اور اس کے منحوس اور مکروہ آثار و نتائج کو جان چکے مناسب ہے کہ اس بیماری کے اسباب و عوامل کی جستجو کریں تاکہ ہم اس کا علاج کرنے کے لئے کوئی بنیادی اقدام کرسکیں۔

بدگمانی اور تجسس

قرآن مجید سے یہ سبق ملتاہے کہ اس گناہ کا ایک اہم ترین سبب لوگوں کے بارے میں بدگمانی اور ان کے اسرار اور حالات کے بارے میں تجسّس کا جذبہ ہے۔

جو شخص دوسروں سے بدظن اور ہمیشہ دوسروں کے اسرار کی ٹوہ میں رہتاہو وہ غیبت کی بیماری میں مبتلا ہوجاتاہے۔

تجسس کیا ہے؟

ابن اثیر کا بیان ہے:

اَلتَّجَسُّسُ بِالْجِیمِ اَلتَّفْتِیشُ عَنْ بَوَاطِنِ الاُمُورِ وَ اَکْثَرُ مَا یُقَالُ فِی الشَّرِ وَ الجَاسُوسُ صَاحِبُ سِرِ الشَّر

یعنی تجسّس (جیم کے ساتھ) سے مراد پوشیدہ امور کی جستجو ہے۔ یہ لفظ زیادہ تر پوشیدہ برائیوں کی جستجو کے لئے استعمال ہوتاہے۔ اور جاسوس سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کی پوشیدہ برائیوں کا کھوج لگاتاہے۔

جب انسان کسی سے بدگمان ہو اور اسے عملی شکل دینا چاہے تو یہ تجسّس کی شکل اختیار کرلیتاہے۔

پس اگر ہماری خواہش یہ ہو کہ اس عظیم بلا (تجسّس) کے شر سے محفوظ رہیں تو ہمیں وہ راستہ اپنانا چاہیئے جو اللہ نے ہمیں دکھایا ہے اور فرمایا ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيْراً مِنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْم وَ لاَ تَجَسَّسُوا وَ لاَ يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً (۱)

اے ایمان لانے والو، بہت زیادہ گمان (بد) سے بچے رہو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے اور ایک دوسرے کے حال کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو۔

پس اگر آپ غیبت سے بچنا چاہتے ہیں، تو بدگمانی سے نجات ضروری ہے اور اگر آپ بدگمانی سے محفوظ رہنے کے خواہاں ہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے امور کی جستجو نہ کریں کیونکہ بدگمانی اور تجسّس ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گاہے تجسّس بدگمانی کا باعث بنتا ہے اور گاہے بدگمانی تجسّس کو جنم دیتی ہے۔ بنابریں ان دونوں سے اجتناب ضروری ہے۔ احادیث میں بھی تجسس سے منع کیا گیا ہے۔

یہاں بطور نمونہ ایک حدیث پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں مذکور ہے:

وَ لا تجسَّسوا وَ لا تَحَسَّسوا وَ لاَ تَناجَشوا وَ لاَ تحاسَدُوا وَ لاَ تباغَضوا وَ لاَ تَدَابرُوا وَ كُونُوا عِبَادَ اللهِ اِخْوَاناً (۲)

ای اللہ کے بندو! ایک دوسرے کے رازوں کا کھوج نہ لگاؤ نہ پوشیدہ باتوں کی جستجو کرو، نہ عیوب کو ظاہر کرو، نہ حسد نہ کرو، نہ بغض رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ موڑو بلکہ تم سب آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

---

(۱) سورہ حجرات / ۱۲۔

(۲) تفسیر قرطبی ج ۱۶ ص ۳۳۱۔

چند توضیحات

چونکہ بدگمانی کا موضوع زیر بحث آیا ہے لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ابہامات کا ازالہ کرنے کے لئے چند ایک وضاحتیں کی جائیں:

(الف) :- یقیناً ہر قسم کے گمان کو بغیر کسی قیدو شرط کے گناہ اور حرام نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ انسان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات و حوادث کے نتیجے میں مختلف قسم کے جلدی گذرنے والے خیالات، تصورات اور یادوں کا ذہن میں آنا ایک طبعی اور فطری بات ہے جو انسان کے اختیار سے خارج ہے۔

اس طرح کے خیالات اور یادیں کسی طرح سے بھی شرعی اور اخلاقی نقطہ نظر سے حسن و قبح تکلیفی کے تابع نہیں یعنی ان کے بارے میں امر یا نہی نہیں ہو سکتی ہے مگر یہ کہ ان کے پیدا ہونے میں انسانی ارادہ دخیل ہو اور انسان اپنے ارادہ و اختیار کے ذریعے ان خیالات کا راستہ ہموار کرے یا یہ کہ وہ اپنے گمان کے مطابق غلط رویہ اختیار کرے مثلاً دوسروں کے اسرار کی جستجو کے ذریعے بدگمانی کی پیدائش کا راستہ ہموار کرے یا فقط بدگمانی کی بنیاد پر دوسروں پر تہمت لگانا شروع کرے۔ ان صورتوں میں بدگمانی اختیاری عمل کے دائرے میں شامل ہوگی کیونکہ پہلی مثال میں بدگمانی کے اسباب اختیاری تھے جبکہ دوسری مثال میں بدگمانی کی بنیاد پر غلط رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے بدگمانی ایک اختیاری عمل محسوب ہوگی اور اسے ایک غیر اختیاری اور طبعی عمل کہنا درست نہ ہوگا چنانچہ عقلی علوم نے یہ ثابت کیا ہے۔

" الامتناعُ بِالاختیَار لاَ یُنَافِی الاختِیار " یعنی اگر اختیار کے سلب ہونے کے اسباب اختیاری تھے تو یہ بے اختیاری بھی اختیاری عمل محسوب ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی بلند مقام سے اپنے آپ کو نیچے گرا دے اور نتیجۃً گر کر مرجائے تو وہ خودکشی کا مرتکب سمجھا جائے گا اگر چہ وہ گرتے وقت اپنے عمل سے پشیمان ہوجائے چونکہ اس نے

اپنے ارادے سے خود کو گرایا تھا لہذا عقلاء کے نزدیک وہ فاعل مختار اور گناہگار ہوگا لیکن لیکن اگر ابتداء میں یہ عمل اختیاری نہ ہو مثلاً اگر کسی کی نگاہ بے اختیار کسی نامحرم پر پڑجائے تو وہ گناہگار نہیں ہے ہاں اگر وہ اپنی نگاہ کا سلسلہ عمداً جاری رکھے تو وہ گناہگار ہے کیونکہ نگاہ کا جاری رکھنا اس کے اختیار کا نتیجہ ہے اسی لئے امام صادقؑ نے فرمایا ہے :

اَوّلُ النّظَرِ لَکَ وَ الثّانیۃُ عَلَیکَ وَ لاَ لَکَ وَ الثّالِثۃُ فیھا الھلاکُ (۱)

یعنی پہلی نظر تیرے فائدے میں ہے اور دوسری نگاہ تیرے لئے نقصان دہ ہے مفید نہیں اور تیسری نگاہ ہلاکت ہے۔

بنابریں بدگمانی کے اسباب مثلاً دوسروں کی پوشیدہ باتوں کا کھوج لگانے اور غلط افواہوں کو سننے سے اجتناب کرنا چاہیئے نیز بدگمانی کے آثار ظاہر ہونے کی صورت میں اسے فراموش کردینا چاہیئے اور اس کا سلسلہ جاری رکھنے یا اس کے مطابق غلط رویہ اختیار کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

(ب) :۔ دوسرا نکتہ جس کی یاد آوری مفید معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ بدگمانی کی بنیاد پر اثرات مرتب کرنے کے دو طریقے ہوسکتے ہیں :

۱. باطنی اور قلبی اثرات مرتب کرنا۔ اسے علمائے اخلاق نے "عقد القلب" یعنی دل کی گرہ کا نام دیا ہے۔

۲۔ ظاہری اور عملی اثرات مرتب کرنا۔ مثلاً تہمت لگانا ، غیبت کرنا اور دوسروں کے حقوق کو پامال کرنا۔

---

(۱) سفینۃ البحار ج ۲ ص ۵۹۷۔

قلبی و باطنی اثرات مرتب کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی بدگمانیوں کو (جو ابتداء میں سادہ تصورات اور جلدی ختم ہونے والی یادوں کے علاوہ کچھ نہیں) ذھن کے حوالے کردے پھراس کی پرورش کرتا رہے اور اسے اپنے دل میں بسالے یہاں تک کہ وہ خود بھی اشتباہ کا شکار ہوجائے اور ظن و گمان کو یقین سمجھنے لگے اور اس پر یقین کے اثرات مرتب کرنا شروع کرے ۔ اس صورت میں انسان اپنے دوست سے بدگمان ہوتاہے اور اس کا جذبہ اعتماد ختم ہوجاتاہے ۔ یہ ایک قسم کی روحانی اور اخلاقی بیماری ہے جس کا دائرہ وسیع اور عام ہونے کی صورت میں زندگی کی بنیادیں متزلزل ہوجاتی ہیں اور معاشرہ فاسد اور تباہ ہوجاتاہے ۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا :

اِذَا ظَنَنْتَ فَلا تُحَقِّقِ (۱)

جب تمہارے اندر کسی کے بارے میں بدگمانی پیدا ہو تو اس کی تصدیق نہ کرو یعنی صرف ظن و گمان کی بنیاد پر کسی چیز کو حقیقت نہ سمجھ بیٹھو ۔

عملی اثر مرتب کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے گمان کو ایک مسلمہ حقیقت کا روپ دے اور اس پر حقیقی امور کے اثرات مرتب کرنے لگے ۔ مثال کے طور پر وہ ظن و گمان کی بنیاد پر کسی بات کو ایک مسلمہ خبر کے طور پر دوسروں کو بتائے اور فقط ظن و گمان کی بنیاد پر کسی پر الزام لگائے یا اس کی مذمت کرے ۔

واضح ہے کہ اس قسم کے اقدام کا نتیجہ تہمت، غیبت ، ہتک حرمت، اور دوسروں کے حقوق کی پامالی کی صورت میں ہی ظاہر ہوگا ۔ بہت سے لوگوں کی عزت و آبرو اور ان کی

---

(۱) تفسیر قرطبی ج/ ۱۶ ص ۳۳۲ ۔

صلاحیتیں ایک معمولی اور بے بنیاد بدگمانی کے نتیجے میں تباہ ہوجاتی ہیں اور اس طرح معاشرہ اس قدر عظیم اور خداداد انسانی سرمایوں سے محروم ہوجاتا ہے ، حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی آبرو اور حیثیت کا احترام ضروری ہے ۔ کتنے ہی قطعی اور یقینی امور (جو مسلمانوں کی آبرو کی پامالی کا باعث ہوں) ایسے ہیں جنہیں کسی شرعی جواز کے بغیر ظاہر نہیں کیا جا سکتا، چہ جائے کہ کسی قسم کے شرعی یا عقلی جواز کے بغیر ظن و گمان اور بے بنیاد اندازوں کی بنیاد پر عملی اثرات مرتب کئے جائیں ۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے :

اِنّ اللہ حَرَّمَ مِنَ المُسلمِ دَمَہ وَ مَالَہ وَ عِرْضَہ وَ اَنْ یُظَنَّ بہ ظَنَّ السَّوء[1]

اللہ نے مسلمان کے خون ، مال اور اس کی آبرو کے احترام کو ضروری اور اس کے بارے میں بدگمانی کو حرام قرار دیا ہے ۔

قاعدہ صحّت

بدگمانی معاشرے کے اندر موجود جذبہ اعتماد کو ختم کردیتی ہے اور دلوں کو نفرت سے بھر دیتی ہے بنابریں اسلام نے اس خطرے کا خاتمہ کرنے کے لئے بطور علاج ایک اصول وضع کیا ہے جسے اصالۃ الصحہ کا نام دیا گیا ہے ۔ اس اصول کو زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کرنا ضروری ہے ۔

یعنی انسان کو چاہیئے کہ مومنوں کے افعال کو صحیح سمجھے اور حتی المقدور ان کے کاموں کی اچھی تاویل اور توجیہ کرے مگر یہ کہ توجیہ اور تاویل کی ساری راہیں مسدود ہوجائیں ۔

---

(۱) محجۃ البیضاء ص ۲۶۸ ۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ضَعْ اَمْرَ اَخِیکَ عَلیٰ اَحْسَنِہِ حَتّٰی یَاْتِیکَ مَا یَغْلِبُکَ مِنْہُ وَلاَ تَظُنَّنَّ بِکَلِمَۃٍ خَرَجَتْ مِنْ اَخِیکَ سُوءً وَاَنْتَ تَجِدُ لَھَا فِی الْخَیْرِ مَحْمِلاً[1]

اپنے (دینی) بھائی کے اعمال کی بہترین تاویل کرو مگر یہ کہ کوئی ایسی دلیل تیرے ھاتھ لگ جائے جو تاویل و توجیہ کا راستہ بند کردے جب تک اپنے برادر (دینی) کی بات کو اچھائی پر محمول کرنا تیرے لئے ممکن ہو اس کے بارے میں ہرگز بدگمانی مت کرو"

اس حدیث کو علم اصول الفقہ میں " اصالۃ الصحۃ " کی ایک دلیل کے طور پر ذکر کیا جاتاہے یعنی اگر دو آدمی آپس میں کوئی معاہدہ کریں تو انہیں چاہیئے کہ ایک دوسرے کے افعال کو " قاعدہ صحت " کے مطابق پرکھیں کیونکہ اگر وہ قاعدہ صحت (اصالۃ الصحۃ) کی بنیاد پر عمل نہ کریں اور اس اصول کو باہمی روابط ، معاملات اور معاہدوں میں معتبر نہ سمجھیں تو کوئی معاملہ یا معاہدہ قابل اعتماد نہ رہےگا ، سارے امور کی بنیادیں متزلزل ہوجائیں گی اور معاشرے کا شیرازہ بکھر جائے گا کیونکہ ہر ایک شک کرنے لگے گا کہ فلان مؤمن نے جو معاہدہ کیا تھا وہ صحیح ہے یا نہیں نیز فلان شخص نے فلان معاملہ صحیح طور پر انجام دیا تھا یا نہیں۔ اس قسم کے شکوک و شبہات باہمی معاملات اور معاہدوں کی حیثیت کو مشکوک بناکر رکھدیں گے اور ان شکوک کی موجودگی میں باہمی معاملات، لین دین اور باقی روابط کو صحیح اور قابل عمل سمجھنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہےگی اور کوئی چیز قابل قبول نہیں رہے گی۔

---

(۱) وسائل الشیعہ ج ۸ ص ۶۱۴ ۔

بنابریں اسلام حکم دیتا ہے کہ اپنے مومن بھائی کے کاموں کو صحیح فرض کیا جائے۔ قاعدہ صحت بھی بدگمانی کے ساتھ مقابلے کا ایک راستہ ہے۔ اس اصول کے ذریعے بدگمانی کی روک تھام کرنی چاہیئے۔

بدگمانی کرنے والا آدمی نہ صرف یہ کہ خود خراب ہوتا ہے بلکہ وہ معاشرے کو بھی خرابی اور تباہی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ بدگمانی کرنے والا اپنے برے گمان کو دوسروں تک بھی منتقل کرتا ہے اور بتدریج ایک ایسی چیز جو فقط افواہ اور غلط فہمی پر مبنی ہوتی ہے کو ایک قطعی اور مسلمہ امر کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان پھیلاتا ہے۔ جب ایسے شخص سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے کس لئے اور کس دلیل کی بناء پر اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں بدگمانی کی اور اس کی آبرو پامال کی، اس کی حیثیت کو داغدار کیا یا اس کی زندگی کو تباہ کردیا تو وہ جو ابا کہتا ہے میں نے فلان آدمی سے ایسا سنا تھا جب اس دوسرے شخص سے سوال ہوتا ہے تو وہ بھی یہی کہتا ہے میں نے فلاں سے سنا تھا۔ یوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور تحقیق و جستجو کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بدگمانی کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔

بدگمانی کے انفرادی نقصانات

۱) گوشہ نشینی :-

جو شخص دوسروں سے بدگمان رہتا ہے وہ لوگوں پر عدم اعتماد کی بناء پر ہمیشہ باطنی رنج و تکلیف کا شکار رہتا ہے اور کسی ایسے فرد کو نہیں پاتا جو اس کے ساتھ زندگی گزارے کیونکہ بدگمان افراد لوگوں سے خوف محسوس کرتے ہیں اور ان پر اعتماد نہیں کرتے۔ یوں گوشہ نشینی کے علاوہ کوئی راستہ ان کے سامنے موجود نہیں ہوتا اور وہ مکمل طور پر لوگوں سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔

امام علیؑ کا اس سلسلے میں ارشاد ہے:

مَنْ لَمْ یُحْسِنْ ظَنَّہ اِسْتَوْحَشَ مِنْ کُلِّ اَحَدٍ (۱)

جو شخص حسن ظن سے کام نہیں لیتا وہ ہرایک سے وحشت محسوس کرتاہے۔

۲) بدگمانی دلی غیبت ہے:-

بدگمانی کا دوسرا انفرادی نقصان یہ ہے کہ بدگمانی بجائے خود ایک قسم کی باطنی اور قلبی غیبت ہے۔ علمائے اخلاق بدگمانی کو غیبت قلبی کے مصادیق میں سے ایک مصداق قرار دیتے ہیں یعنی اگر کوئی شخص اپنے دل اور ضمیر کے اندر اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں بدگمانی پیدا کرے تو گویا اس کے دل نے اس مسلمان کی غیبت کی ہے اور جیسا کہ ہم گناہ اور اس کے برے نتائج کے بارے میں بیان کرچکے ہیں دین مقدس اسلام کی نظر میں علاوہ اس کے کہ گناہ کا عمل ممنوع ہے گناہ کے بارے میں سوچنا بھی غیر پسندیدہ امر ہے۔

امیر المومنین علیؑ نے فرمایا:

مَنْ کَثُرَ فِکْرُہُ فِی الْمَعَاصِی دَعَتْہُ اِلَیْھَا (۲)

یعنی جو شخص گناہوں کے بارے میں زیادہ سوچے، گناہ اس کو اپنی طرف کھینچیں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہوں کے بارے میں سوچنا روح کی پاکیزگی کے خاتمے کا باعث بنتاہے۔ بدگمانی کا بھی یہی حال ہے کیونکہ اگر کوئی اپنے برادر دینی سے بدگمان ہوجائے اور اس بدگمانی کے مطابق اثر مرتب کرے (یعنی اس کو اپنے دل میں پروان چڑھائے) تو یہ بدگمانی غیبت قلبی پر منتہی ہوتی ہے جسے علمائے اخلاق نے "عقد القلب" کا نام دیا ہے۔

---

(۱) فہرست موضوعی غرر الحکم ص ۲۲۸۔

(۲) فہرست موضوعی غرر الحکم ص ۲۲۷۔

یہ عقد القلب زبان سے غیبت کرنے، تہمت لگانے ، بدگوئی کرنے، چغلی کھانے اور بہت سے دیگر گناہوں کا پیش خیمہ بنتا ہے۔

بدگمانی کے سماجی نقصانات

بدگمانی کے شدید ترین نقصانات میں سے ایک یہ ہے کہ بدگمانی لوگوں کی باہمی الفت کو ختم کر کے اسے افتراق اور جدائی میں بدل دیتی ہے۔

امام علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

مَنْ غَلَبَ عَلَیهِ سُوءُ الظَّنِّ لَمْ یَتْرُکْ بَیْنَہ و بَیْنَ خَلِیلٍ صُلْحاً (۲)

جس شخص پر بدگمانی کا غلبہ ہوجائے اس کے دوستوں اور اس کے درمیان کسی قسم کی صلح و آشتی باقی نہیں رہتی۔

معنوی نقصانات:

عبادتوں کا ضیاع .... بدگمانی کا ایک نقصان یہ ہے کہ وہ عبادتوں کو فاسد اور تباہ کر کے رکھ دیتی ہے چنانچہ امیر المومنین علی علیہ السلام لوگوں کو اس لعنت کے انجام سے آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اِیَّاکَ اَنْ تُسِیءَ الظَّنَّ فَاِنَّ سُوءَ الظَّنِّ یُفْسِدُ الْعِبَادَةَ وَ یُعَظِّمُ الْوِزْرَ (۳)

بدگمانی سے اجتناب کرو کیونکہ بدگمانی عبادت کو ضائع کردیتی ہے اور گناہ کو سنگین بناتی ہے۔

---

(۱) فہرست موضوعی الغرر ص ۲۲۸۔

(۲) ایضاً فہرست موضوعی الغرر ص ۲۲۸۔

نیز آپؑ نے فرمایا:

لَا اِیمَانَ مَعَ سُوءِ ظَنٍّ (۱)

ایمان اور بدگمانی اکٹھا نہیں ہو سکتے۔

سب سے برا گناہ اور سب سے بڑا ظلم

امیرالمومنین علی علیہ السلام ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

سوءُ الظَّنِّ بالمُحسِنِ شَرُّ الاثمِ وَ اَقبَحُ الظُّلمِ (۲)

نیک انسان کے بارے میں بدگمانی بدترین گناہ اور قبیح ترین ظلم ہے۔

خلاصہ یہ کہ بدگمانی کے بہت سارے برے عواقب ہیں اسی لئے قرآن مجید اور ائمہ معصومینؑ نے اس سے منع کیا ہے جیسا کہ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے:

اِطرَحُوا سُوءَ الظَّنِّ بَینَکُم فانَّ اللہ عَزَّوجَلَّ نَهیٰ عَن ذٰلِکَ (۳)

ایک دوسرے سے بدگمان نہ رہو کیونکہ اللہ عزوجل نے اس سے منع فرمایا ہے۔

ایک بہت اہم نکتہ یہ ہے کہ جس معاشرے کے اکثر افراد خراب ہوں یعنی ان کی برائیاں اچھائیوں پر غالب ہوں اس معاشرے میں حسن ظن اور لوگوں کے افعال کو صحیح فرض کرنا معقول نہیں ہے۔ اس طرح کے معاشروں میں لوگوں سے بدگمان رہنا چاہیے۔ پس اگر ہم کسی معقول اور معتبر دلیل کے بغیر لوگوں کے کاموں کو صحیح قرار دیتے جائیں تو یہ خود ہمارے ساتھ دھوکہ ہوگا۔

---

(۱) ایضاً ص ۲۲۸۔

(۲) فہرست موضوعی غرر ص ۲۲۷۔

(۳) بحارالانوار ج ۷۲ ص ۱۹۴۔

اس سلسلے میں ہم امیر المومنین اور امام ہادی علیہما السلام کے فرمودات کا تذکرہ کریں گے

امام علی علیہ السلام فرمایا:

إِذَا اسْتَوْلَى الصَّلَاحُ عَلَى الزَّمَانِ وَأَهْلِهِ ثُمَّ أَسَاءَ رَجُلٌ الظَّنَّ بِرَجُلٍ لَمْ تَظْهَرْ مِنْهُ حَوْبَةٌ فَقَدْ ظَلَمَ وَإِذَا اسْتَوْلَى الْفَسَادُ عَلَى الزَّمَانِ وَأَهْلِهِ فَأَحْسَنَ رَجُلٌ الظَّنَّ بِرَجُلٍ فَقَدْ غَرَّرَ (۱)

جب زمانہ اور اہل زمانہ پر نیکی اور اچھائی کا غلبہ ہو تو اس حالت میں اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص سے بدگمانی رکھے جس سے کوئی گناہ ظاہر نہ ہوا ہو تو یہ اس کے اوپر ظلم ہے لیکن جب زمانے اور زمانہ والوں پر برائی کا غلبہ ہو اور اس حالت میں کوئی شخص کسی سے حسن ظن رکھے تو یقیناً اس نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے۔

امام ہادی علیہ السلام سے بھی منقول ہے:

اذا كَانَ زَمَانُ الْعَدْلُ فِيهِ أَغْلَبَ مِنَ الْجَوْرِ فَحَرام أَنْ تَظُنَّ بِأَحَدٍ سُوءً حَتَّى يُعْلَمَ ذَالِكَ مِنْهُ وَاذا كَانَ زَمَانُ الْجَوْرُ فِيهِ أَغْلَبَ مِنَ الْعَدْلِ فَلَيْسَ لِأَحَدٍ أَنْ يَظُنَّ بِأَحَدٍ خَيراً حَتَّى يَبْدُوَ ذَالِكَ مِنْهُ (۲)

جس دور میں ظلم پر عدل کا غلبہ ہو اس دوران کسی سے بدگمان ہونا حرام ہے مگر یہ کہ اس کی برائی کا علم حاصل ہوجائے اور (اس کے برعکس) جس دور میں عدل پر ظلم کا غلبہ ہو اس دوران کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کے بارے میں حسن ظن رکھے مگر یہ کہ اس کی اچھائی ظاہر اور آشکار ہو۔

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح حکمت ۱۱۴۔

(۲) بحار الانوار ج ۷۲، ص ۱۹۷۔

اہم امور میں احتیاط اور تحقیق ضروری ہے

اہم امور مثلاً کلیدی عہدوں کے لئے افراد کا انتخاب کرتے وقت احتیاط ضروری ہے۔ واضح ہو کہ معاشرے میں اچھائی کے غلبے کی صورت میں ایک دوسرے پر اعتماد اور حسن ظن کا مطلب یہ نہیں کہ اہم اور بنیادی کاموں کو کسی قسم کی تحقیق اور احتیاطی تدابیر کے بغیر شروع کیا جائے اور (حسن ظن کے نام پر) کلیدی عہدے ہر کسی کے حوالے کردئے جائیں۔ اصالۃ صحت یا ایک دوسرے سے حسن ظن صرف انفرادی اور جزئی معاملات میں درست ہے۔ اجتماعی، بنیادی اور کلیدی معاملات میں اگر چہ بدگمانی جائز نہیں لیکن صرف حسن ظن کی بنیاد پر بھی فیصلے نہیں کئے جا سکتے۔ اس قسم کے امور میں کسی کی حیثیت کو ٹھیس پہنچائے بغیر تحقیق و احتیاط سے کام لینا یقیناً ضروری ہے اور مکمل اطمینان حاصل کرنے کے بعد مناسب اقدام کرنا چاہیئے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام کا ارشاد گہر بار ہے:

ثُمَّ انْظُرْ اُمُورَ عُمَّالِکَ فَاسْتَعْمِلْهُمْ اِخْتِیَاراً وَ لَا تُوَلِّهِمْ مُحَابَاةً وَ اَثَرَةً فَاِنَّهُمَا مِنْ شُعَبِ الْجَوْرِ وَ الْخِیَانَةِ وَ تَوَخَّ مِنْهُمْ اَهْلَ التَّجْرِبَةِ وَالْحَیَاءِ مِنْ اَهْلِ الْبُیُوتَاتِ الصَّالِحَةِ وَالْقَدَمِ فِی الْاِسْلَامِ الْمُتَقَدِّمَةِ فَاِنَّهُمْ اَکْرَمُ اَخْلَاقاً وَ اَصَحُّ اَعْرَاضاً وَ اَقَلُّ فِی الْمَطَامِعِ اِشْرَاقاً وَ اَبْلَغُ فِی عَوَاقِبِ الْاُمُوْرِ نَظَراً ...... ثُمَّ تَفَقَّدْ اَعْمَالَهُمْ وَ ابْعَثِ الْعُیُونَ مِنْ اَهْلِ الصِّدْقِ وَالْوَفَاءِ عَلَیْهِمْ .... (1)

پھر اپنے عہدیداروں کے بارے میں نظر رکھنا ان کو خوب آزمایش کے بعد منصب دینا کبھی بھی صرف رعایت اور جانبداری کی بنا پر انہیں منصب عطا نہ کرنا

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح مکتوب نمبر ۵۳ ص ۴۳۵۔

اس لئے کہ یہ دونوں باتیں نا انصافی اور بے ایمانی کا سرچشمہ ہیں اور ایسے لوگوں کو منتخب کرنا جو آزمودہ اور غیرت مند ہوں، ایسے خاندانوں میں سے ہوں جو اچھے ہیں اور جن کی خدمات اسلام کے سلسلے میں پہلے سے ہوں۔ ان سے انتخاب کرنا کیونکہ ایسے لوگ بلند اخلاق اور بے داغ عزّت والے ہوتے ہیں، حرص و طمع کی طرف کم جھکتے ہیں اور عواقب و نتائج پر زیادہ نظر رکھتے ہیں ...... پھر ان کے اعمال کا خیال رکھنا اور سچے وفادار مخبروں کو ان پر چھوڑ دینا ....

سرکاری منشیوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

ثُمَّ لاَ یَکُنْ اِخْتِیَارُکَ اِیَّاهُمْ عَلٰی فِرَاسَتِکَ وَ اسْتِنَامَتِکَ وَ حُسْنِ الظَّنِّ مِنْکَ فَاِنَّ الرِّجَالَ یَتَعَرَّضُوْنَ لِفِرَاسَاتِ الْوُلاَةِ بِتَصَنُّعِهِمْ وَ حُسْنِ خِدْمَتِهِمْ (۱)

پھر تمہیں اپنی ذاتی فراست، خوش اعتمادی اور حسن ظن کی بناء پر ان کا انتخاب نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ لوگ تصنّع اور حُسنِ خدمت کے ذریعے حکمرانوں کی نظروں میں سماکر اپنے مفاد کی راہیں نکال لیا کرتے ہیں۔

بہر حال بدگمانی اور حسن ظن دونوں کے مواقع مختلف ہوتے ہیں بنابریں انسان کو باریک بینی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیئے اور جاننا چاہیئے کہ وہ کس دور میں زندگی گزار رہا ہے، کیونکہ اگر وہ اپنے زمانے کے حالات سے مطلع نہ ہو تو ممکن ہے کہ اسے ناگوار نتائج اور حوادث سے دوچار ہونا پڑے۔

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح۔ مکتوب نمبر ۵۳ ص ۴۳۷۔

اسی لئے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ:

وَ الْعَالِمُ بِزَمَانِهِ لَا تَهْجُمُ عَلَيْهِ اللَّوَابِسُ [1]

جو شخص اپنے زمانے (کے حالات اور تقاضوں) سے آگاہ ہو وہ مشتبہ امور کے حملوں کا شکار نہیں ہوتا۔

غیبت کا علاج

ہر بیماری کے علاج کے لئے تین بنیادی عناصر کی ضرورت ہوتی ہے:

۱۔ درد اور بے چینی کا احساس۔

۲۔ بیماری کے اسباب و عوامل کی شناخت۔

۳۔ علاج کے طریقہ کار سے آگاہی۔

اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ غیبت گناہ کبیرہ اور ایک خطرناک اخلاقی بیماری ہے سب سے پہلے اس بیماری کے اسباب و عوامل کو پہچاننے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ علت کا خاتمہ کرکے معلول سے جان چھڑائی جائے۔ واضح ہے کہ معلول کو ختم کرنے کی بہترین راہ علت کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ غیبت کے بہت سارے اسباب و عوامل ہیں۔ علم اخلاق کی کتابوں میں اس سلسلے میں بہت سے مفید اور تفصیلی نکات ملتے ہیں۔

یہاں ہم ان نکات میں سے چند ایک کا ذکر بعض کی تشریح و توضیح کے ہمراہ کریں گے۔ ہم اصلی موضوع کو شروع کرنے سے پہلے تین اہم امور کی طرف اشارہ کریں گے۔ یہ امور در حقیقت آئندہ صفحات میں ذکر ہونے والے مباحث کو عملی شکل دینے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

---

(۱) تحف العقول ص ۲۶۴۔

الف :- اعتقادی اور ایمانی سہارا

معنوی اور روحانی بیماریوں کے اسباب کا مقابلہ کرنے کے لئے سب سے موثر اور کاری عنصر ایمان ہے یعنی خدا اور روز قیامت پر ایمان۔ اگر کوئی شخص حقیقتاً اللہ اور روز قیامت پر اعتقاد اور ایمان رکھے تو وہ گناہان کبیرہ خاص کر تہمت اور غیبت جیسے گناہوں کا بہت کم ہی مرتکب ہوگا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص اخروی حساب کتاب اور جزاء و سزا پر ایمان و یقین رکھتاہو لیکن اس کے باوجود اسے گناہوں کے ارتکاب کی کوئی پروا بھی نہ ہو ؟ اس بات کی توقع صرف ان لوگوں سے ہوسکتی ہے جو زبان سے ایمان کا دعوی کرتے ہیں لیکن دل سے مؤمن نہ ہوں۔ چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے :

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ (۱)

وہ اپنی زبان سے ایسی بات کرتے ہیں جن پر ان کا ایمان نہیں ہوتا۔

ب :- یاد خدا :

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے : اگر اپنی سلامتی کے خواہاں ہو تو بجائے مخلوقات کی یاد کے اپنے خالق کو یاد رکھو کیونکہ اس کی یاد تمہارے لئے باعث عبرت اور غیبت کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوجائے گی۔ یوں تجھے گناہ کی بجائے ثواب نصیب ہوگا۔

امیرالمومنین علیؑ فرماتے ہیں :

ذِكْرُ اللهِ دَوَاءُ أَعلَالِ النُّفُوسِ (۲)

اللہ کی یاد روحانی بیماریوں کی دوا ہے۔

---

(۱) سورہ آل عمران / ۱۶۷۔

(۲) فہرست موضوعی غرر ص ۱۲۴۔

ج :- خود آگاہی تنقید برداشت کرنا اور اپنا احتساب

جو شخص اپنی خامیوں سے آگاہ اور ان کا معترف ہو وہ دوسروں کی عیب جوئی ہرگز نہیں کرے گا۔ انسان خودپسندی اور خود بینی کے باعث غرور کا شکار ہوکر دوسروں کے عیوب تلاش کرتا ہے۔ لیکن جو انسان اپنے آپ کو عیوب و نقایص کا مجسمہ دیکھتا ہو وہ اس بات سے حیا محسوس کرتا ہے کہ انہی عیوب کی بناء پر دوسروں کی سرزنش کرے۔

چنانچہ رسول اللہؐ فرماتے ہیں:

طُوبٰی لِمَنْ شَغَلَه عَیْبُهُ عَنْ عُیُوبَ النَّاسِ (۱)

خوش بخت ہے وہ شخص جو اپنے عیوب پر توجہ کے باعث دوسروں کے عیوب کی طرف توجہ نہ دے۔

امیر المومنینؑ سے مروی ہے:

اَکْبَرُ الْعَیْبِ اَنْ تَعِیْبَ مَا فِیکَ مِثْله (۲)

سب سے بڑا عیب اس چیز کو عیب سمجھنا ہے جو خود تمہارے اندر موجود ہے۔

بقول شاعر

چشم فرو بستہ ای از عیب خویش — عیب کسانت شدہ آئینہ پیش

دیدہ زعیب دگران کن فراز — صورت خود بین و دران عیب ساز

در ہمہ چیز ہنر و عیب ہست — عیب مبین تا ہنر آری بہ دست

عیب کسان منگر و احسان خویش

دیدہ فرو کن بہ گریبان خویش

---

(۱) محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۶۴۔

(۲) نہج البلاغہ فیض الاسلام حکمت نمبر ۳۴۵۔

یعنی اپنے عیوب سے آنکھیں چراتے ہو اور دوسروں کے عیوب کو مد نظر رکھتے ہو۔ دوسروں کے عیوب سے چشم پوشی کرو اور اپنے چہرہ کو سامنے رکھ کر اس کے عیوب گنو۔ ہر چیز میں عیب و ہنر کے دو پہلو ہوتے ہیں پس عیب کی طرف نظر نہ کرو تا کہ ہنر حاصل کر سکو۔ دوسروں کے عیوب اور اپنی نیکیاں مت گنو بلکہ اپنے گریبان میں جھانکنے کی کوشش کرو۔

امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے:

شَرُّ النَّاسِ مَنْ كَانَ مُتَتَبِّعاً لِعُيُوبِ النَّاسِ عَمِيّاً لِمَعَايِبِهِ (۱)

بدترین آدمی وہ ہے جو دوسروں کے عیوب کے پیچھے لگا رہے لیکن اپنے عیوب کو نہ دیکھے۔

بہر حال اگر کوئی شخص غیبت کے بارے میں قرآنی آیات اور احادیث میں غور و فکر کرے اور اس گناہ کے منحوس نتائج کے بارے میں سوچے اور اس کے دنیوی و اخروی مفاسد کو مد نظر رکھے تو وہ ہرگز اس گناہ کا مرتکب نہیں ہوگا۔

امیر المومنینؑ نے غیبت سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے:

يَا عَبْدَ اللّٰهِ لَا تَعْجَلْ فِي عَيْبِ اَحَدٍ بِذَنْبِهِ فَلَعَلَّهُ مَغْفُورٌ لَهُ وَ لَا تَأْمَنْ عَلَىٰ نَفْسِكَ صَغِيرَ مَعْصِيَةٍ فَلَعَلَّكَ مُعَذَّبٌ عَلَيْهِ فَلْيَكْفُفْ مَنْ عَلِمَ مِنْكُمْ عَيْبَ غَيْرِهِ لِمَا يَعْلَمُ مِنْ عَيْبِ نَفْسِهِ وَ لْيَكُنِ الشُّكْرُ شَاغِلاً لَهُ عَلَىٰ مُعَافَاتِهِ مِمَّا ابْتُلِيَ بِهِ غَيْرُهُ (۲)

اے بندہ خدا! کسی شخص کے گناہ پر اس کی سرزنش کرنے میں جلدی نہ کرو شاید اللہ نے اسے بخش دیا ہو اور اپنے صغیرہ گناہ سے بے فکر مت ہو جاؤ شاید تمہیں اس کی

---

(۱) فہرست موضوعی غرر ص ۲۸۷۔

(۲) نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ نمبر ۱۴۰۔

سزا دی جائے۔ تم میں سے جو شخص دوسروں کے عیب سے آگاہ ہے وہ اپنے اس عیب کے پیش نظر جسے وہ بخوبی جانتاہے دوسروں کی عیب جوئی نہ کرے۔ اسے چاہیئے کہ دوسروں کی عیب جوئی کی بجائے اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرے کہ دوسروں میں موجود عیوب سے وہ مبرّا ہے۔

آئیے اب ہم ان اسباب و عوامل پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن کے باعث انسان غیبت جیسی بیماری میں مبتلا ہوجاتاہے۔ یہ اسباب درج ذیل ہیں:

۱۔ دوستوں کی ہاں میں ہاں ملانا:

غیبت کے اسباب میں سے ایک دوستوں اور ساتھیوں کی ہاں میں ہاں ملاناہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حسن معاشرت اور اچھے اخلاق کا تقاضا ہے کہ کسی کو آزردہ خاطر نہ کیا جائے حالانکہ یہ ایک قسم کی منافقت اور غیر ذمہ دارانہ طریقہ ہے۔ جو لوگ اس طرح سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں کہ سارے لوگ ان سے راضی ہوں اور پوری زندگی میں ان کا ایک بھی مخالف نہ ہو اس قسم کے افراد کے کئی چہرے ہوتے ہیں ان کا انسانی اور اخلاقی معیاروں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور وہ ایمان و اخلاق کی لذت سے ناآشنا ہوتے ہیں دوسرے الفاظ میں ان لوگوں کی مثال کی سی ہے جس طرف ہوا چلتی ہے یہ اسی طرف رخ کرتے ہیں اور اپنے زعم میں یہ خیال کرتے ہیں کہ۔

بقول شاعر

چنان با نیک و بد خو کن کہ بعد از مردنت عرفی

مسلمانت بہ زمزم شوید و ہندو بسوزاند

یعنی ہر اچھے برے آدمی کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرو کہ تیرے مرنے کے بعد مسلمان تجھے آب زمزم سے غسل دیں اور ہندو اپنے عقیدے کے مطابق تیری چتا جلائیں۔

فیض کاشانی مرحوم ؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

اے وہ انسان جو دوسروں کو خوش کرنے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے غیبت کرتا ہے۔ جان لو کہ اگر تم مخلوق کی خوشنودی کے طلبکار ہو (دوسروں کی غیبت کے ذریعے) تو اللہ تجھ سے غضبناک ہوگا ۔ تم کیونکر اس بات سے راضی ہوتے ہو کہ دوسروں کا تو احترام کرو اور ان کی خوشنودی حاصل کرو ، لیکن اپنے اللہ اور پروردگار کی تحقیر کرو اور لوگوں کی خوشنودی کے لئے اس کی خوشنودی کو قربان کردو اس کے حکم سے چشم پوشی کرو ؟ ممکن ہے کہ تم یہ دعوی کرو کہ تمہاری یہ ناراضگی اللہ کی رضا کے لئے ہے لیکن (اگر بالفرض ایسا ہو) تب بھی یہ اس بات کا باعث نہیں بن سکتا کہ جس شخص سے تم ناراض ہو اس کی بدگوئی کرتے پھرو بلکہ تمہیں چاہیئے کہ غیبت کرنے والوں سے ناراض ہوجاؤ کیونکہ یہ لوگ قبیح ترین اور بدترین گناہ (یعنی غیبت) کے ذریعے اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور اللہ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں [۱]

پس انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی عنان اختیار دوسروں کے حوالے نہ کرے، نیز بغیر کسی قید و شرط کے لوگوں کی متابعت کرنے سے اجتناب کرے اور خود کو ان کے رنگ میں رنگ لے۔

قرآن کی یہ آیت اسی بات کی طرف اشارہ کررہی ہے:

فِی جَنّٰتٍ یَتَسَآئَلُونَ عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ مَا سَلَکَکُمْ فِی سَقَرَ قَالُوا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ وَ لَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ وَ کُنَّا نَخُوضُ مَعَ الخائضین۔ [۲]

---

(۱) المحجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۶۵، ۲۶۶۔

(۲) سورۂ مدثر / ۴۰، ۴۵۔

(مومنین) بہشت کے باغوں میں گناہگاروں سے پوچھ رہے ہوں گے کہ آخر تمہیں دوزخ میں کون سی چیز (گھسیٹ) لائی ؟ وہ لوگ کہیں گے کہ ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے نہ محتاجوں کو کھانا کھلاتے تھے اور اہل باطل کے ساتھ ہم بھی برے کام میں گھس پڑتے تھے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔

بنابریں جو لوگ ہر قسم کی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں اور بڑی بے پروائی سے جو منہ میں آئے کہہ دیتے ہیں وہ آتش جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوں گے، جو لوگ آتش جہنم سے نجات کے خواہاں ہیں انہیں چاہیئے کہ برے اور فسادی لوگوں کے ساتھ (جو ہمیشہ مومنین کی غیبت کرتے رہتے ہیں یعنی در حقیقت آیات و احکام خداوندی کو اہمیت نہیں دیتے اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں) میل جول نہ رکھیں کیونکہ قرآن مجید کا ارشاد ہے :

وَ اِذَا مَرُّوا بِاللَّغوِ مَرُّوا كِرَاماً [1]

اور وہ لوگ (اللہ کے نیک بندے) جب کسی بیہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔

۲۔ اپنی صفائی پیش کرنا :

غیبت کا ایک اور عامل اپنی صفائی پیش کرنے کا جذبہ ہے۔ یعنی انسان گاہے کسی معاملے میں اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے دوسروں کو ملوث کرتا ہے۔ اس مقصد کے تحت وہ گاہے گناہ کو مکمل طور پر کسی دوسرے کی گردن پر ڈال دیتا ہے اور گاہے اسے اپنا شریک جرم قرار دیتا ہے۔

---

(۱) سورۂ فرقان / ۷۲۔

بہر حال وہ کسی الزام سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کے لئے دوسروں کو بھی ملوث کرتا ہے اور ان کو مکمل طور پر شریک جرم کی حیثیت سے گنہگار ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ یہ گناہ فلاں آدمی نے کیا ہے یا کہتا ہے کہ یہ گناہ صرف میں نے نہیں کیا بلکہ فلاں فلاں افراد بھی اس کے مرتکب ہوئے ہیں۔

فیض کاشانی مرحوم فرماتے ہیں " جو لوگ اس مقصد کے تحت غیبت کرتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ اللہ کو ناراض کر رہے ہیں اور جو لوگ اللہ کو ناراض کرتے ہیں ان کا گناہ بندوں کو ناراض کرنے والوں کی نسبت کہیں زیادہ سخت اور سنگین ہے۔ غیبت کرنے والے یقیناً اللہ کی ناراضگی کے اسباب فراہم کرتے ہیں اور اس کے باوجود یہ نہیں جانتے کہ لوگ ان سے خوش ہیں یا نہیں۔ نتیجۃً وہ اس زعم باطل میں مبتلا ہوکر کہ لوگ ان سے راضی ہوں گناہ کا الزام اپنی گردن سے اتار کر کسی اور کی گردن میں ڈال دیتے ہیں اور بظاہر دنیوی نقطہ نظر سے اپنی گلو خلاصی کا سامان فراہم کرتے ہیں لیکن آخرت میں وہ اپنے آپ کو ابدی خسارت سے دوچار کرتے ہیں۔ اور یہ جہل و نادانی کی انتہا ہے۔ کتنا بدبخت ہے وہ آدمی جو دوستوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی آخرت کو تباہ کر دیتا ہے"

اس کے بعد جناب فیض کاشانی کہتے ہیں یہ عذر (بہانہ) کیسے معقول ہو سکتا ہے کہ کوئی کہے۔ صرف میں نے مال حرام نہیں کھایا بلکہ فلان نے بھی کھایا ہے صرف میں نے ظالم حکمرانوں سے انعام نہیں لیا بلکہ فلان نے بھی انعام حاصل کیا ہے وغیرہ۔ یہ ایک غیر معقول بات ہے کیوں کہ دوسرے لوگوں کا عمل کسی انسان کے لئے حجت اور دلیل نہیں بن سکتا۔ مذکورہ لوگوں کی مثال بھیڑوں کی طرح ہے کہ اگر ان میں سے ایک کسی بلندی سے نیچے چھلانگ لگادے تو دوسری بھیڑیں بھی اس کی متابعت میں چھلانگ لگا دیتی ہیں (اور نتیجۃً ہلاک ہوجاتی ہیں) (۱)

---

(۱) محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۶۶ الفاظ میں مختصر تفاوت (کے ساتھ)۔

۲۔ فخر و مباہات

کچھ لوگ فخر و مباہات کی بناء پر غیبت کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں یعنی وہ اپنے پرچار اور اپنے فضل و کمال کی تشہیر کے لیے دوسروں کی تحقیر کرتے اور ان کی برائی بیان کرتے ہیں۔ وہ اس قسم کے جملوں کے ذریعے کہ فلاں کچھ بھی نہیں جانتا اور وہ ایسا ویسا ہے دوسروں کی عیب جوئی کرتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو اس سے بہتر ظاہر کریں۔ لیکن وہ اس بات سے غافل ہیں کہ اس قسم کی حرکت کو نہ صرف یہ کہ لوگ پسند نہیں کرتے بلکہ ممکن ہے کہ یہ بات ان کے بارے میں دوسروں کی عقیدت کو بھی متزلزل بنا دے۔

یہ بیماری (خودستائی اور فخر و مباہات) بہت سے گناہان کبیرہ کا سبب بن سکتی ہے جن میں سے ایک غیبت ہے۔ اسی لئے قرآن کریم اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے اس کی شدید مذمت کی ہے یہاں ہم اختصار کے ساتھ بعض نمونوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

خودستائی قرآن کی روشنی میں

قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ انسان کبھی بھی اپنے آپ کو خطا ثابت کرنے اور دوسروں کی بدگوئی کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ دوسروں کے باطن سے کوئی بھی آگاہ نہیں۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

فَلاَ تُزَكُّوا اَنْفُسَكُمْ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (۱)

اپنے نفس کی پاکیزگی بتایا کرو کیونکہ وہ تقویٰ اختیار کرنے والے کو بہتر جانتا ہے۔

سورۂ نساء میں یوں فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىْ مَنْ يَّشَآءُ وَ لاَ يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلاً (۲)

---

(۱) سورۂ نجم / ۳۲۔ (۲) سورہ نساء / ۴۹۔

(اے رسول) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے تمہیں بڑے مقدس بنتے ہیں؟ مگر اس سے کیا ہوتا ہے) اللہ جس چاہیئے مقدس بنادیتا ہے اور ان پر بال برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔

خودستائی احادیث کی روشنی میں

احادیث میں بھی خودستائی کی شدید مذمت ہوئی ہے۔ بعض نمونوں کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام متقین کی یوں تعریف فرماتے ہیں:

لاَ یَرْضَوْنَ مِنْ اَعْمالِهِمُ الْقَلیلِ وَ لاَ یَسْتَکْثِرونَ الْکَثیرَ فَهُمْ لاَ نْفُسِهِمْ مُتَّهِمونَ وَ مِنْ اَعْمالِهِم مُشْفِقونَ اذا زُکِّیَ اَحَدٌ مِنْهُمْ خافَ مِمَّا یُقالُ لَه فَیَقُولُ اَنَا اَعْلَمُ بِنَفْسی مِنْ غَیْری وَ رَبّی اَعْلَمُ بی مِنّی بِنَفْسی اَللّٰهُمَّ لاَ تُواخِذْنی بِمَا یَقولُونَ واجعَلْنی افْضَلَ مِمَّا یَظُنُّونَ وَ اغْفِرْلی مَا لاَ یَعْلَمُونَ۔ (۱)

یعنی وہ اپنے اعمال کی کم مقدار سے مطمئن نہیں ہوتے اور زیادہ کو زیادہ نہیں سمجھتے وہ اپنے ہی نفسوں پر کوتاہیوں کا الزام لگاتے ہیں اور اپنے اعمال سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ جب ان میں سے کسی ایک کو (صلاح و تقویٰ کی بناء پر) سراہا جاتا ہے تو وہ اپنی تعریف سے لرز اٹھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں دوسروں سے زیادہ اپنے نفس سے آگاہ ہوں اور میرا پروردگار مجھ سے بھی زیادہ میرے نفس کو جانتا ہے۔ خدایا ان کی باتوں پر میری گرفت نہ فرما اور میرے متعلق یہ لوگ جو حسن ظن رکھتے مجھے اس سے بہتر قرار دے اور میرے ان گناہوں کو بخش دے جو ان کے علم میں نہیں۔

---

(۱) نہج البلاغہ صحیح صالح خطبہ ۱۹۳ (ترجمہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۱۹۱)۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

اَقْبَحُ الصِّدْقِ ثَنَاءُ الرَّجُلِ عَلٰی نَفْسِہٖ (۱)

سچی باتوں میں سب سے زیادہ قبیح بات یہ ہے کہ آدمی اپنی تعریف آپ کرے۔

بہر حال انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھے بلکہ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی بہ نسبت بہتر تصور کرے۔

خلاصہ یہ کہ انسان کو چاہیئے کہ خودستائی کی خاطر دوسروں کی بدگوئی نہ کرے۔ (یاد رہے کہ خودستائی بجائے خود اسلام کی نظر میں مذموم ہے)۔ ظاہر یہ ہے کہ جو لوگ فخر و مباہات کے ذریعے دوسروں کی تحقیر کرتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کی غیبت کے باعث ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس (جس کی غیبت کی گئی ہو) سے بدظن ہوجائیں لیکن غیبت کرنے والا علاوہ اس کے کہ لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش میں (اللہ کے ہاں اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے قیامت کے دن بھی لوگ اسے عذاب خداوندی سے نجات نہیں پاسکتے۔

۴۔ حسد

غیبت کے دیگر عوامل میں سے ایک حسد ہے۔ اس بیماری کے علاج کے لیئے ضروری ہے کہ انسان اس گناہ کی سنگینی کے بارے میں غور کرے۔ جو شخص حسد کی بناء پر غیبت کرے وہ در حقیقت دوگناہوں کا مرتکب اور دو عذابوں کا مستحق ہوتا ہے، ایک حسد کا عذاب اور دوسرا غیبت کا عذاب۔ یہ دونوں گناہ کبیرہ ہیں۔

حاسد آدمی اس بناء پر کہ اللہ نے کسی دوسرے کو کوئی نعمت عطا کی ہے اس سے حسد کرتا ہے۔ یہ حسادت اس کے لئے ذہنی کرب کا باعث ہے۔ دنیا میں وہ ہمیشہ اس عذاب میں مبتلا رہتا ہے اور آخرت کے عذاب کا بھی اس میں اضافہ ہوتا ہے یوں وہ دنیا و آخرت

---

(۱) فہرست موضوعی غرر ص ۳۶۱۔

دونوں میں خسارے کا شکار ہوتا ہے۔ حاسد اس لئے غیبت کرتا ہے کہ محسود (جس کی غیبت کی جائے) کا خاتمہ کرے لیکن در حقیقت وہ خود تباہ ہوکر رہ جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی تمام نیکیاں غیبت کے ذریعے مکمل طور پر اس شخص کے نام منتقل کرتا ہے جس کی وہ غیبت کرتا ہے۔ بنابریں حقیقت میں حاسد اپنا دشمن ہے اور اس شخص کا دوست ہے جس کی وہ غیبت کرتا ہے کیونکہ معتاب (جس کی غیبت کی جائے) کے سارے گناہ غیبت کرنے والے کے نامہ اعمال میں درج کئے جاتے ہیں اور غیبت کرنے والے کے نیک اعمال مغتاب کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے ہیں۔

۵۔ استہزاء اور تضحیک

غیبت کی ایک اور وجہ استہزاء و تضحیک ہے (اس بارے میں تفصیلی بحث ہوئی ہے)۔ اس روحانی بیماری کے علاج کے بارے میں محجۃ البیضاء کے مولف (فیض کاشانی مرحومؒ) فرماتے ہیں:

تم اس لئے استہزاء کے مرتکب ہوتے ہو۔ تاکہ تم کسی شخص کو لوگوں کی نظروں سے گرا دو حالانکہ تم اپنے آپ کو اللہ، رسول اور فرشتوں کے آگے ذلیل و خوار کرتے ہو حالانکہ اگر تم ایک لحظے کے لئے بھی روز قیامت کی حسرت و ندامت، دنیا میں اپنے جرائم اور روز محشر کی شرمساری و سرافکندگی اور رسوائی کے بارے میں غور و فکر کرتے اور یہ جانتے کہ استہزاء کے باعث دوسروں کے گناہ اور ان کے عذاب کا وبال تیری گردن میں آن پڑے گا اور تجھے جہنم میں داخل ہونا پڑے گا تو یقیناً یہ احساس تجھے دوسروں کا مذاق اڑاتے اور ان کو خوار کرنے سے روکتا۔

ہماری اعمال عالم وجود کے باطن میں پوشیدہ رہتے ہیں اور قیامت کے دن جو اس عالم وجود کا دوسرا صفحہ ہے ظاہر ہوں گے۔ علاوہ ازیں خداوند عزوجل، رسول اکرم اور آپ کے اولیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین ہمارے اعمال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

حالانکہ قرآن کریم فرماتا ہے:

وَ قُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُولُهُ وَ الْمُؤْمِنُونَ وَ سَتُرَدُّونَ اِلٰى عَالِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۱)

(اور اے رسول) کہہ دو کہ تم لوگ اپنے اپنے کام کئے جاؤ ابھی تو خدا اور اس کا رسول اور مؤمنین تمہاری کاموں کو دیکھیں گے اور بہت جلد ظاہر و باطن کے جاننے والے (خدا) کی طرف لوٹائے جاؤگے تب جو کچھ تم کرتے تھے تمہیں بتادے گا۔

۶۔ ہمدردی و غمخواری کا اظہار

گاہے انسان اظہار ہمدردی اور غمخواری کے باعث غیبت میں مبتلا ہوتا ہے۔ گناہ میں مبتلا ہونے والے کے ساتھ رضائے الٰہی کی خاطر ہمدردی و دلسوزی بہت پسندیدہ بات ہے لیکن بہت سے لوگ فقط حسادت یا بدخواہی کی بناپر ہمدردی اور دلسوزی کا دکھاوا کرتے ہیں۔ یعنی غیبت کرنے والا جذبہ حسادت و انتقام کو ہمدردی کی صورت میں تسکین دیتا ہے اور ممکن ہے کہ اسے خود بھی احساس نہ ہو لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس ہمدردی کی اصلی وجہ درد دل نہیں۔

مثال کے طور پر گاہے انسان یوں کہتا ہے فلاں بیچارہ بری طرح سے برائیوں میں پھنس گیا ہے خدا اسے اس بھنور سے نجات دے۔ ایسے موقعوں پر انسان دعا اور اظہار محبت کی صورت میں غیبت کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ عمل بجائے خود ایک قسم کار یا اتفاق ہے اور اس قسم کی بات کہلونے والا در حقیقت شیطان ہے۔ جو ہمدردی کے بہانے انسان کو غیبت پر اکساتا ہے اور نتیجۃً اس کا اجر و ثواب جاتا رہتا ہے۔ اسباب کے علاوہ غیبت کے اور بھی عوامل ہیں جن کا ذکر ہم اختصار کے پیش نظر نہیں کرتے۔

---

(۱) سورۂ توبہ / ۱۰۵۔

وہ مقامات جہاں غیبت جائز ہے

اگر چہ غیبت گناہ کبیرہ ہے اور قرآن و سنت ہیں اس سے سخت منع کیا گیا ہے لیکن بعض مقامات ایسے ہیں جہاں غیبت جائز ہے۔

چونکہ یہ بحث ایک خاص اہمیت کی حامل ہے اور اس کی تمام جزئیات پر تبصرہ کرنے کے لیئے وقت درکار ہے لہذا یہاں ہم اختصار کے ساتھ اہم موارد کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔

۱۔ طلب انصاف کی خاطر غیبت

جب کوئی مظلوم شخص قاضی کے پاس شکایت لے جائے تو وہ اس بات پر مجبور ہے کہ ظالم کے مظالم کا تذکرہ کرے نیز ظالم کا نام اور اس کی نشانیاں بتائے کیونکہ اگر وہ ظالم کا نام نہ لے اور اس کے کرتوت سے قاضی کو آگاہ کرے تو قاضی مظلوم کی شکایت کی تحقیق نہیں کرسکے گا اور فیصلہ کرنے سے بھی عاجز رہے گا۔

بنابرین جو شخص ظلم کے ازالے اور اپنا حق لینے کے لیئے قاضی کے پاس رجوع کرتا ہے اس کے لئے غیبت کیئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ مثلاً جو شخص مقروض ہے اور اپنا قرض ادا کرسکتا ہے لیکن اس کے باوجود قرض کی ادائیگی میں سہل انگاری سے کام لیتا ہے اس کا قرض خواہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیئے اس کی بدگوئی اور غیبت کرسکتا ہے۔ اس قسم کے مواقع پر غیبت کا جواز ایک قانونی اور فقہی قاعدے کی بنیاد پر استوار ہے جو ایک اصول کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے منقول ہے۔

رسول اکرم کا فرمان ہے۔

لَیُّ الوَاجِدِ بِالدَّینِ یُحِلُّ عِرْضَہُ وَ عُقُوبَتَہ [1]

جو شخص قرض کی ادائیگی پر قادر ہونے کے باوجود قرض ادا کرنے میں سستی اور تاخیر سے کام لے اس کی بے عزتی کرنا اور اسے سزا دینا جائز ہے۔

بنابرین مظلوم قرض خواہ اپنا من طلب کرتے اور مقروض کے خلاف دعویٰ دائر کرنے کا حق رکھتا ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔

لِصَاحِبِ الحَقِّ مَقَال [2]

یعنی صاحب حق کو بات کرنے کا حق حاصل ہے۔

انصاف طلب کرنا اس قدر اہم ہے کہ خود قاضی کے خلاف بھی شکایت کی جاسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ قاضی کسی پر ظلم کرے اور رشوت وغیرہ لے کر روابط کو ضوابط پر ترجیح دے اور نتیجۃً حکم شریعت کے خلاف فیصلہ کرے۔ اس صورت میں مظلوم کو اجازت دی گئی ہے کہ اس قاضی کے خلاف شکایت کرتے ہوئے اس کی غیبت کرے اور با اختیار عہدیداروں کے پاس اس کا نام لے۔

بہر حال قرآن کریم کے صریح حکم کی رو سے انصاف کرنے کے لئے بدگوئی اور غیبت جائز ہے۔ قرآن مجید نے مظلوم واقع ہونے والوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیئے آواز اٹھائیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الجَھْرَ بِالسُّوءِ مِنَ القَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَکَانَ اللّٰہُ سَمِیعاً عَلِیماً [3]

---

(۱) وسائل الشیعہ ج/ ۱۳ ص ۹۰۔

(۲) محجۃ البیضاء ج/ ۵ ص ۲۷۰۔

(۳) النساء / ۱۴۸۔

اللہ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی شخص کھلم کھلا کسی کی بد گوئی کرے یا کسی کو گالی دے سوائے مظلوم کے (یعنی اسے ظالم کی بد گوئی کا حق حاصل ہے۔ اور اللہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

واضح ہے کہ اس قسم کے مواقع پر صرف انہی امور کے دائرے میں غیبت جائز رہے جو ظالم کے ظلم اور مظلوم کے دفاع سے مربوط ہوں۔ ظالم کے دیگر عیوب کا تذکرہ گناہ اور حرام ہے۔ شاید مذکورہ آیت کے آخر میں اللہ کے ارشاد " و کان اللہ سمیعاً علیماً " اللہ خوب سننے اور خوب جاننے والا ہے کا مقصد یہ ہو کہ لوگ مذکورہ اصول سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔ گویا اللہ فرمارہاہے۔ خدا تمہاری نیتوں سے آگاہ ہے اور خوب جانتاہے کہ تم نے ظلم کا ازالہ کرنے کے لئے غیبت کی ہے یا دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے۔

۲۔ برائیوں کی روک تھام کے لئے کمک طلبی

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر بھی غیبت کو جائز شمار کیا گیا ہے کیونکہ گاہے انسان تن تنہا برائیوں کی روک تھام نہیں کرسکتا اور وہ دوسروں سے مدد طلب کرنے یا متعلقہ اداروں (مثلا پولیس اور عدلیہ) کو اطلاع دینے پر مجبور ہوتاہے تاکہ ان کی مدد سے برے کام کا راستہ روکے۔ بنابرین برے کام کے مرتکب فرد اور محل وقوع کا ذکر کئے بغیر کوئی چارہ نہیں مثلاً فرض کریں آپ کو علم ہوتاہے کہ کسی کا گھر فحاشی کا اڈا بن چکاہے اور اس اڈے میں بہت سے لوگوں کی رفت و آمد ہے اب اگر آپ ان لوگوں کو اس کام سے روکنے کے خواہاں ہوں تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ لوگوں کو اس کے بارے میں بتائیں یا انتظامیہ اور عدلیہ کو اس کی اطلاع دیں۔

واضح ہے اس قسم کے مواقع پر غیبت کی حرمت کا بہانہ بناکر اپنی ذمہ داری سے پہلوتہی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ اس طرح کے فحاشی کے اڈے معاشرتی تہذیب و اخلاق کے لئے نقصان دہ ہیں نیز لوگوں کو بے راہروی اور تباہی کی جانب، لے جانے ان کے وجود کو تباہ

کرنے اور معاشرے کی فعّال افرادی قوت کو بے کار بتادینے کا باعث ہیں۔ اسی لئے بہت سے فقہاء نے اس قسم کے اڈے چلانے والوں کو " مفسد الارض " اور قتل کی سزا کے مستحق قرار دیا ہے۔ پس اس قسم کے موقعوں پر برائی کا راستہ روکنے کے لئے فحاشی یا برائی کے کسی اڈے یا اس کے چلانے والوں کی نشاندہی نہ صرف یہ کہ غیبت اور حرام نہیں بلکہ واجب ہے۔

۳۔ استفتاء

استفتاء (یعنی حکم شرعی کے بارے میں سوال) کی خاطر بھی غیبت جائز ہوجاتی ہے۔ بعض موقعوں پر انسان حکم شرعی کے بارے میں سوال کی خاطر مجبور ہوجاتا ہے کہ اس شخص یا ان اشخاص کے ناموں کا ذکر کرے جو اس مسئلے میں ملوث ہوں اور اپنے ناموں کے ذکر سے ناراض ہوتے ہوں۔

اس صورت میں اگر مسئلہ اہم اور ضروری ہو تو ان کا نام لینے میں کوئی حرج نہیں۔ بطور مثال وہ کہتا ہے "فلاں مسئلے میں میرے باپ یا بھائی یا .... نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور میرا حق ضائع کیا ہے۔ کیا اس بارے میں میرا نقطہ نظر صحیح ہے اور صحیح ہونے کی صورت میں کیا میں اس کے خلاف شکایت کرسکتاہوں۔

یاد رہے کہ یہاں نام لینے کا مقصد یہ ہے کہ مجتہد کے لئے مسئلہ کی حقیقت واضح ہوجائے تاکہ وہ مناسب جواب دے سکے، لیکن اگر مسئلے کی وضاحت کے معاملے میں کسی کا نام لینے یا نہ لینے سے کوئی فرق نہ پڑتاہو تو اس صورت میں نام کا ذکر کرنا، جائز نہیں۔

۴۔ خبردار کرنے کی خاطر غیبت

کسی مسلمان کو درپیش خطرے سے آگاہ کرنے کی خاطر بھی غیبت جائز ہے۔ جب کوئی شخص یہ دیکھے کہ اس کے دوست کا رابطہ ایسے گروہ سے ہے جس کے ساتھ ارتباط اس کے لئے نقصان دہ ہے تو اسے چاہیئے کہ اپنے دوست کو آگاہ کرے۔ مثلاً اگر اس کا دوست ایسے

افراد سے تعلقات رکھتا ہو جن کے ساتھ تعلقات جاری رہنے کی صورت میں اس بات کا خطرہ ہو کہ وہ بتدریج ان کے برے کردار سے متاثر ہوگا تو اس صورت میں اسے ان لوگوں کے عیوب سے مطلع کرنا ضروری ہے تا کہ وہ آگاہی اور بصیرت کے ہمراہ ان لوگوں کے ساتھ مناسب رویہ اختیار کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا ارشاد ہے:

اَ تَرعَونَ عَنْ ذِکْرِ الْفَاجِرِ حَتّٰی لاَ یَعْرِفَہُ النَّاسُ اذْکُرُوْہُ بِمَا فِیْہِ یَحْذَرْہُ النَّاسُ (۱)

کیا تم لوگ فاسق و فاجر انسان کے ذکر سے احتراز کرتے ہو تا کہ لوگ اسے نہ پہچانیں؟ اس کے عیوب کا ذکر کرو تا کہ لوگ اس سے محتاط رہیں۔

۵۔ مشہور لقب کا ذکر

اگر کوئی شخص کسی نام یا لقب سے معروف ہو اور وہ نام یا لقب بنیادی طور پر کسی عیب یا نقص کی نشاندہی کرتا ہو لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اسی کی قباحت جاتی رہی ہو یہاں تک کہ اگر کوئی اسے اس نام یا لقب سے پکارے تو وہ ناراض نہ ہوتا ہو تو اس صورت میں اسے اس نام یا لقب سے یاد کرنا جائز ہے۔ مثال کے طور پر کسی نابینا کے بارے میں یہ کہنا کہ فلاں اندھا آگیا یا اس اندھے نے فلاں بات کہی یا کسی لنگڑے کے بارے میں یہ کہنا کہ فلاں لنگڑا ایسی بات کر رہا تھا وغیرہ وغیرہ ....

ان صورتوں میں اگر کوئی شخص ان صفات کے ساتھ ان کا ذکر کرے تو یہ غیبت نہیں ہے۔ کیونکہ ان صفات کے ذکر سے انہیں غصہ نہیں آتا اور ان کا نام لینے والے کی نیت بھی عیب جوئی پر مشتمل نہیں ہے۔ یاد رہے کہ احادیث کے راویوں میں سے بعض حضرات کے اعضاء بدن میں نقص تھا اور احادیث میں بھی ان کا ذکر انہی نقائص کے

---

(۱) محجۃ البیضاء ج/ ۵ ص ۲۷۱۔

ساتھ ہوا ہے۔ مثلاً "اعور" (جس کی ایک آنکھ سالم ہو) اور اعمش (جس کی آنکھیں بے نور ہوں) وغیرہ۔

واضح ہو کہ اگر غیبت سے مراد پوشیدہ اور ظاہری عیوب کا تذکرہ ہو تو مذکورہ بالا موارد کا شمار غیبت کی استثنائی صورتوں میں ہوگا لیکن اگر غیبت سے مراد صرف پوشیدہ باتوں کو فاش کرنا ہو تو مذکورہ موارد کا شمار غیبت کے مستثنیات میں نہیں ہوگا بلکہ وہ غیبت کے موضوع سے ہی خارج ہوں گے۔

۶۔ مشورے کی خاطر غیبت

مشورے کی خاطر غیبت کرنا جائز ہے۔ اگر کوئی شخص اہم انفرادی یا اجتماعی امور مثلاً شادی، لین دین، کسی کو ملازم رکھنے، ملازمت یا عہدہ دینے اور ملازمت و عہدے سے برطرف کرنے کی خاطر کسی سے مشورہ کرے تو ضرورت کی صورت میں اس شخص کے عیوب اور نقایص وغیرہ کا ذکر جائز ہے جس کے بارے میں مشورہ لیا جارہا ہو۔ بلکہ گاہے ان عیوب کا ذکر واجب ہے ......

امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرمایا:

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤتَمَن

یعنی جس سے مشورہ لیاجائے اسے چاہیئے کہ وہ امانتداری کے ساتھ مشورہ دے اور مشورہ دینے میں خیانت نہ کرے۔

جن مقامات پر غیبت جائز ہے ان میں سے ایک مشورہ کرنے والے کو نصیحت کرنے کا مقام ہے کیونکہ جس شخص سے مشورہ لیا جائے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ مشورہ لینے والے کو مفید اور صحیح مشورہ دے اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے ساتھ خیانت ہے اور گاہے نصیحت نہ کرنے کا گناہ غیبت کرنے سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں: یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی سے مشورہ بھی کرے اور کسی عورت سے شادی کا ارادہ رکھتا ہو جس کے عیوب سے وہ آگاہ نہ ہو لیکن دوسرا شخص جانتا ہو کہ اس عورت میں ایسے نقائص ہیں جن کا ذکر نہ کرنے کی صورت میں اس شخص کو نقصانات کا سامنا ہوگا تو یہاں بھی اسے ان نقائص سے آگاہ کرنا چاہیئے اگر چہ غیبت ہو۔ اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ اس غیبت کا ارتکاب مومن کو نصیحت نہ کرنے سے بہتر ہے خاص کر اس بات کے پیش نظر کر بعض احادیث بظاہر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مؤمن کو نصیحت کرنا واجب ہے۔ (۱)

۷۔ بدعتی انسان کی غیبت

اگر کوئی شخص لوگوں کو گمراہ کرتاہو اور دین خدا میں بدعت پیدا کرتاہو تو اس خرابی کی جڑیں کاٹنے کے لئے اس کی غیبت جائز ہے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ اس کی غیبت جائز ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس کے نامہ عمل میں ثواب بھی لکھتاہے، چنانچہ امام صادق علیہم السلام کا ارشاد گہربار ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم:

اذا رایتُمْ اھلَ الرَّیْبِ وَ الْبِدعِ مِنْ بَعْدِیْ فَاظْھِرُوا البرائۃ مِنْھُمْ ... (۲)

یعنی رسول اللہ نے فرمایا، جب تم میرے بعد اہل ریب (جو لوگ دین میں شک پیدا کرتے ہیں) اور بدعتیوں کو دیکھو تو ان سے اعلانیہ طور پر بیزاری اور برائت کا اظہار کرو۔

۸۔ کھلے عام گناہ کرنے والے کی غیبت

جن مقامات پر غیبت جائز ہے ان میں سے ایک اعلانیہ گناہ کرنے والے کی غیبت ہے اگر چہ غیبت کرنے میں کوئی خاص مصلحت نہ بھی ہو۔ یہاں ہم اس سلسلے میں چند احادیث کی طرف اشارہ کریں گے۔

---

(۱) مکاسب محرمہ ج/ ۴ ص ۴۵ مطبوعہ دار الکتاب قم۔ ایران۔ (۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۳۷۵۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

ثَلاثَۃٌ لَیْسَ لَھُمْ حُرمَۃ صَاحِب ھَویً مُبْتَدِع وَ الاِ مامُ الجَائِرُ وَ الفَاسِقُ المُعْلِنُ بِفِسْقِہ (۱)

تین قسم کے لوگوں کا اسلام کی نظر میں کوئی احترام نہیں۔

۱۔ گمراہ اور بدعتی آدمی

۲۔ ظالم حکمران

۳۔ کھل کر گناہ کرنے والا

نیز فرمایا ہے:

مَنِ القَیٰ جِلْبَابَ الحَیَآءِ مِنْ وَجْھِہِ فَلاَ غِیْبَۃَ لَہُ (۲)

جس شخص نے اپنے چہرے سے حیاء کا پردہ اتار دیا ہو اس کی غیبت جائز ہے۔

غیبت کا کفارہ

کفارہ سے مراد ہے وہ عمل جو جرم اور گناہ کے آثار کو مٹائے اور اللہ کے عفو کا راستہ ہموار کرے۔ طبعی بات ہے کہ ہر گناہ کا کفارہ اس کے تناسب سے ہی ہوگا۔

یاد رہے کہ غیبت وہ گناہ ہے جس کے دو منفی اثرات ہیں۔

۱۔ احکام الٰہی کے مقابلے میں سرکشی اور نافرمانی۔

۲۔ اللہ کے ایک یا چند بندوں کا آزردہ خاطر ہونا۔

بنابرین ان اثرات کے خاتمے کے لیے چارہ کار سوچنے اور مناسب تلافی کی ضرورت ہے نیز غیبت کرنے والا خدا کی حکم عدولی کا جبران کرنے کے لئے غور کرے اور عفو خداوندی کا راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرے اور جن لوگوں کے حقوق کو اس نے غیبت کے ذریعے پامال کیا ہے ان کو راضی کرے کیونکہ اگر وہ راضی نہ ہوں تو اللہ بھی راضی نہیں ہوگا۔

---

(۱) مکاسب محرمہ (شیخ انصاری) ص ۴۴۔ (۲) محجۃ البیضاء ج/ ۵ ص ۲۷۲۔

ایک اہم نکتہ

ایک اہم اور قابل ذکر نکتہ جس پر غور و فکر کی ضرورت ہے یہ ہے کہ ہر انسان کسی نہ کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور کوئی شخص یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ پس بنابریں سارے افراد بشر گناہ گار ہیں (سوائے معصومین علیہم السلام کے) دوسری طرف سے خداوند تعالیٰ نے بندوں کے لئے توبہ کی راہ مسدود نہیں فرمائی وہ توبہ و استغفار کے ذریعے اپنے گزشتہ گناہوں کی تلافی اور توبہ و پشیمانی کے بعد تقویٰ و عبادت کا راستہ اختیار کرسکتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید اور اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں توبہ و استغفار کی ترغیب اور دعوت دی گئی ہے۔ ان آیات و احادیث میں سے چند ایک کا تذکرہ ہم یہاں کریں گے۔

قرآن مجید اور دعوت توبہ

قُلْ یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوا عَلٰیٓ اَنْفُسِہِم لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِیْعاً اِنَّہُ ھُوَ الْغَفُورُ الرَّحِیْمُ وَ اَنِیْبُوا اِلٰی رَبِّکُم... (۱)

کہہ دیجئے اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی ظلم کیا ہے! اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہونا کیونکہ اللہ تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جاؤ توبہ کرو۔

کَتَبَ رَبُّکُم عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ اِنَّہُ مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوٓءً بِجَھَالَۃٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِہٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّہُ غَفُورٌ رَحِیْمٌ (۲)

---

(۱) سورہ زمر / ۵۳ و ۵۴۔

(۲) سورہ انعام / ۵۴۔

تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم ٹھہرایا ہے۔ بہ تحقیق تم میں سے جو کوئی نادانی کی بناء پر کسی برائی کا مرتکب ہو جائے پھر توبہ اور اپنی اصلاح کرلے تو (جان لو کہ) اللہ نہایت بخشنے والا اور بڑا رحم والا ہے۔

ان اللّٰہ یُحِبُّ التّوابیْنَ (۱)

اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

قبولیتِ توبہ کی شرائط

یہ بات واضح ہے کہ توبہ و استغفار کا فائدہ تب ہوسکتا ہے جب اس میں چند شرائط موجود ہوں۔ ان شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ گناہ کے بعد توبہ کرنے والا یہ پکا ارادہ کرلے کہ پھر گناہ نہ کرے گا۔

معاذ بن جبل نے رسول اکرمؐ سے سوال کیا کہ توبۃ النصوح سے کیا مراد ہے؟ آنحضرت نے فرمایا:

اَنْ یَّتُوبَ التَّائبُ ثُمَّ لاَ یَرْجِعُ فِی ذَنْبٍ کَمَا لاَ یَعُوذُ اللَّبَنُ اِلَی الضَّرعِ (۲)

یعنی توبہ نصوح یہ ہے کہ توبہ کرنے والا توبہ کرنے کے بعد پھر کسی گناہ کا رخ نہ کرے جس طرح (دوہا ہوا) دودھ دوبارہ تھن میں واپس نہیں جاتا۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام کا ارشاد:

و قَالَ عَلَیْہِ السَّلاَمَ لِقَائِلٍ قَالَ بِحَضْرَتِہِ اسْتَغْفِرُاللّٰہ ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ اتَدْرِیْ مَا الاِ سْتِغْفَارُ؟ انَّ الاِ سْتِغْفَار درجَۃ العِلّیینَ وَ ھُوَ اسْم واقع عَلیٰ سِتَّۃِ مکانٍ

---

(۱) بقرہ / ۲۲۲۔

(۲) مجمع البیان مطبوعہ بیروت ج/ ۱۰ ص ۳۱۸۔

یعنی ایک شخص نے امیر المؤمنین علیہ السلام کے حضور میں استغفر اللہ کہا تو آپ نے اس سے فرمایا " تیری ماں تجھ پر روئے کیا تم جانتے ہو کہ استغفار کیا ہے؟ استغفار علّیّین (بلند مرتبہ والوں) کا مقام ہے اور وہ ایک ایسا اسم ہے جس کے ساتھ معانی و مراتب ہیں۔

اَوَّلُهَا النَّدَمُ عَلىٰ مَا مَضىٰ

پہلا مرحلہ گزشتہ (گناہوں) پر ندامت و پشیمانی ہے۔

والثَّانِيَ العزمُ علىٰ تَرْكِ الْعَوْدِ اِلَيْهِ اَ بَداً

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس گناہ کی طرف ہرگز نہ لوٹنے کا عزم کیا جائے۔

وَ الثَّالِثُ اَنْ تُوَدِّيَ اِلَى الْمَخْلُوقِيْنَ حُقُوقَهُم حَتّٰى تَلقَى اللهَ اَمْلَسَ عَلَيْكَ تَبِعَة

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ تم لوگوں کے حقوق کو لوٹا دو یہاں تک کہ جب تم اللہ سے ملاقات کرو تو تمہارے اوپر کسی کا کوئی حق نہ ہو۔

وَالرَّابِعُ اَنْ تَعْمِدَ اِلىٰ كُلِّ فَرِيْضَةٍ عَلَيْكَ ضَيَّعْتَهَا فَتُوَدِّيَ حَقَّهَا

چوتھا مرحلہ یہ ہے کہ تم ہر اس واجب کا حق ادا کرو جسے تم بجا نہیں لائے (یعنی اس کی تلافی اور قضا کرو۔

وَ الْخَامِسُ اَنْ تَعْمَدَ اِلَى اللَّحْمِ الَّذِيْ نَبَتَ عَلَى السُّحْتِ فَتُذِيْبَهُ بِالاَحزانِ حَتّٰى تَلْصِقَ الْجِلْدَ بِالْعَظْمِ وَ يَنْشَا بَيْنَهُمَا لَحمٌ جَدِيْد۔

پانچواں مرحلہ یہ ہے کہ جو گوشت تیرے بدن پر (رزق) حرام سے اگا ہے انہیں حزن و غم (گناہ پر) کے ذریعے پگھلاؤ یہاں تک کہ بدن کی کھال کو ہڈیوں سے ملا دو کہ پھر سے ان دونوں کے درمیان تازہ گوشت پیدا ہو۔

وَ السَّادِ سُ اَ نْ تُذِ يقَ الْجِسْمَ اَ لَمَ الطَّاعَةِ كَمَا اذَ قْتَهُ حلاَ وَ ةَ الْمَعْصِيَةِ فَعِنْدَ ذَالِكَ تَقُوْ لُ اَ سْتَغْفِرُ اللّٰه (۱)

چھٹا مرحلہ یہ ہے کہ تم اپنے بدن کو اطاعت کی زحمت و تکلیف کا مزہ اسی طرح دو جس طرح تو نے اسے گناہوں کا مزہ چکھایا تھا۔ پس ان تمام مراحل کو طے کرنے کے بعد استغفر اللہ کہو۔

فیض کاشانی مرحومؒ فرماتے ہیں کہ انسان کو پہلے اپنے اندر ایک باطنی انقلاب برپا کرنا چاہیئے اور پھر توبہ کرنا چاہیئے۔ اگر توبہ میں یہ شرط مفقود ہو تو اس کی حیثیت ایک مذاق جیسی ہوگی چنانچہ امام باقر علیہ السلام نے ایک حدیث میں فرمایا ہے:

وَ الْمُقِيْمُ عَلَى الذَّ نْبِ وَ هُوَ مُسْتَغْفِرِ مِنْهُ كَالْمُسْتَهزِی (۲)

جو شخص استغفار کرتے ہوئے گناہ کا سلسلہ جاری رکھتاہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو ٹھٹھا کرتاہے۔

مختصر یہ کہ انسان کو اپنے برے اعمال سے پشیمان ہونا چاہیئے اور اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرنی چاہیئے۔ پھر جن لوگوں کو اس نے ناراض کیا ہو اور ان کی غیبت کی ہو انہیں راضی کرلینا چاہیئے۔ رہا یہ سوال کہ انہیں کس طرح راضی کیا جائے اور ان سے کسطرح معافی مانگی جائے تو یہ بات بجائے خود قابل بحث ہے کہ کیا مغتاب (جس کی غیبت کی گئی ہو) کی رضایت کے حصول کی خاطر اس کے پاس جاکر اسے راضی کرلینا چاہیئے یا اس کے حق میں دعائے خیر اور طلب مغفرت کافی ہے؟

---

(۱) نہج البلاغہ فیض الاسلام حکمت ۴۰۹۔

(۲) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج/ ۶ ص ۳۶۔

فقہا کے نظریات

یہاں فقہاء کے درمیان دو نظریات دیکھنے میں آتے ہیں:

بعض فقہاء کا خیال ہے کہ اس شخص (جس کی غیبت ہوئی ہو) کے حق میں پشیمانی اور اس کے لئے استغفار دعائے خیر نیز صدقہ دینا اور نیک کام انجام دینا کافی ہے۔ اس کے لئے ان نیک اعمال کی بجاآوری کے باعث اللہ غیبت کرنے والے کی توبہ قبول فرماتاہے کیونکہ گاہے اس بات کا احتمال ہوتاہے کہ اگر غیبت کرنے والا اس کے پاس جائے تو اس کا الٹا نتیجہ نکلے۔ اس سلسلے میں ہم ایک حدیث نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا ارشاد ہے:

كَفَّارَةُ مَنِ اغْتَبْتَهُ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لَهُ (۱)

جس شخص کی تو نے غیبت کی ہے اس کا کفارہ یہ ہے کہ تو اس کے لئے استغفار کرو۔

بعض دوسرے فقہاء کا یہ نظریہ ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اس شخص کے پاس جائے جس کی اس نے غیبت کی ہو اور اس سے معافی مانگ لے کیونکہ غیبت حق الناس ہے اور جب تک وہ شخص جس کی غیبت کی گئی ہو غیبت کرنے والے سے راضی نہ ہو استغفار کا فائدہ نہیں۔ وہ اس سلسلے میں بعض احادیث سے استدلال کرتے ہیں مثال کے طور پر

(۱) رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا:

انَّ الغِيْبَةَ اَشَدُّ مِنَ الزِّنا وَ انَّ الرَّجُلَ يزنِى فَيَتُوبُ وَ يَتُوبُ اللّٰه عَلَيْهِ وَ انَّ صَاحِبَ الْغِيْبَةِ لاَ يُغْفَرُ لَهُ حَتّٰى يَغْفِرَ لَهُ صَاحِبُه (۲)

---

(۱) المحجۃ البیضاء ج/ ۵ ص ۲۷۳ اور امالی شیخ طوسی ص ۱۲۰۔

(۲) شیخ انصاری (رح) کی کتاب مکاسب محرمہ ص ۴۰۔

به تحقیق غیبت زنا سے زیادہ شدید ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک آدمی زنا کرنے کے بعد توبہ کرے اور اللہ اس کی توبہ قبول کرے لیکن غیبت کرنے والا بخشا نہیں جاتا جب تک اس کا مد مقابل (جس کی اس نے غیبت کی تھی) اسے معاف نہ کردے۔

(۲) ایک اور حدیث میں فرمایا:

مَنِ اغْتَابَ مُسْلِماً اَوْ مُسْلِمَةً لَمْ يَقْبَلِ اللهُ صَلواتَهُ وَلاَ صِيامَهُ اَرْبَعِيْنَ يَوماً وَلَيْلَةً اِلاَّ اَنْ يَّغْفِرَ لَهُ صَاحِبُهُ (۱)

جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت کی غیبت کرے چالیس دنوں اور راتوں تک اللہ اس کی نمازیں اور روزوں کو قبول نہیں فرماتا مگر یہ کہ وہ شخص اسے بخش دے جس کی اس نے غیبت کی تھی۔

جمع بین الروایات

سؤال:- کفارہ غیبت کے بارے میں احادیث میں اختلاف ہے۔ بعض احادیث فقط استغفار کو کافی قرار دیتی ہیں اور بعض احادیث مغتاب (جس کی غیبت کی جائے) کو راضی کرنے اور اس سے معافی مانگنے کو لازم قرار دیتی ہیں اس اختلاف کے پیش نظر ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ ہم ان میں سے کس حدیث کے مطابق عمل کریں؟

جواب:- احادیث کی ان دو قسموں میں سے ہر ایک قسم ایک خاص مقام سے مربوط ہے اور اپنے اپنے مقام پر ان میں سے ہر ایک پر عمل ہونا چاہیئے۔ البتہ ان دونوں کو اس طرح سے ہماہنگ کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) ایضاً مکاسب محرمہ ص ۴۳۔

جو روایات صرف استغفار کو کافی قرار دیتی ہیں ان کا تعلق ان مواقع سے ہے جب معافی مانگنے کی صورت میں کینہ و عداوت پیدا ہونے نیز ناراضگی اور اختلاف کا خطرہ ہو۔ اور جو احادیث معافی مانگنے کو لازم قرار دیتی ہیں ان کا تعلق ان صورتوں سے ہے جہاں معافی مانگنا منفی نتائج کا حامل نہ ہو۔ اس صورت میں انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مغتاب (جس کی اس نے غیبت کی تھی) کے پاس جائے، اور کہے کہ میں نے تمہارے بارے میں غلط باتیں کی تھیں میں نے غلط اور برا کام کیا ہے۔ اگر چاہتے ہو تو مجھ سے اپنا حق لے لو و گرنہ مجھے معاف کردو۔

جناب فیض کاشانی مرحومؒ ان دو قسم کی روایتوں کو باہم جمع کرنے کے لئے ایک اور راستہ تجویز کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

ان اغْتَبتَ فَبَلَغَ الْمُغتَابَ فَاستَحِلَّ مِنْهُ وَ انْ لَمْ تَبلُغْهُ فَاستَغْفِرِ اللهَ له [۱]

اگر تم غیبت کرو اور مغتاب (جس کی غیبت کی گئی ہو) اس غیبت سے باخبر ہو جائے تو اس سے معافی مانگ لو لیکن اگر اسے اس کی خبر نہ ہو تو اس کے لئے اللہ سے طلب مغفرت کرو۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد جناب فیض کہتے ہیں: اسے غیبت کا علم نہ ہونے کی صورت میں معافی مانگنا کینہ و عداوت اور فتنے کا باعث بن جائے گا۔

ایک نکتہ جس پر سب کو اتفاق ہے۔ صرف ایک صورت میں فقہاء متفق الخیال ہیں اور کہتے ہیں کہ استغفار کافی ہے اور وہ تب ہے جب مغتاب (جس کی غیبت ہوئی ہو) دنیا سے جا چکا ہو یا وہ زندہ ہو لیکن اس تک رسائی ممکن نہ ہو۔ اس صورت میں انسان کی ذمہ داری یہی ہے۔

---

(۱) المحجۃ البیضاء ج/ ۵ ص ۲۷۳۔

غیبت کی اجازت

سوال:۔ کیا انسان دوسروں کو اجازت دے سکتا ہے کہ وہ اس کی غیبت کریں؟ کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے: جو کوئی بھی میری غیبت کرے میں اس سے راضی ہوں؟

جواب:۔ ان لوگوں کو معاف کرنے میں کوئی حرج نہیں جنہوں نے ماضی میں غیبت کی ہو۔ جیسا کہ امام زین العابدین علیہ السلام اللہ کے حضور عرض کرتے ہیں:

اللّٰھُمّ وَ اَیُّمَا عَبْدٍ نَالَ مِنِّی مَا حَظَرْتَ عَلَیْهِ وَ انْتَھَکَ مِنِّی مَا حَجَرْتَ عَلَیْهِ فَمَضیٰ بِظُلَامَتِی مَیِّتاً اَوْ حَصَلَتْ لِیْ قِبَلَه حَیّاً فَاغْفِرْ لَهُ مَا اَلَمَّ بِهِ مِنِّی واعفُ لَه عَمَّا اَدْبَرَ بِهِ عَنِّی وَ لَا تَقِفْهُ عَلیٰ مَا ارْتَکَبَ فِیَّ وَ لَا تَکْشِفْهُ عَمَّا اکْتَسَبَ بِی (۱)

پروردگارا جس بندے نے میرے حق میں تیری طرف سے ممنوعیت کے باوجود بدگوئی کی ہے اور میرے بارے میں تو نے اسے جس خیر سے روکا، اس کی حرمت کو پامال کیا ہے اور وہ میرا حق اپنی گردن پر لے کر اس دنیا سے چلا گیا ہے یا جس کی زندگی میں اس کے ذمے میرے حقوق تھے تو میرے بارے میں اس کی ہوئی برائی کو بخش دے اور اسے اپنی بخشش سے محروم نہ رکھ۔ اس نے میرے حق میں جو ظلم کیا ہے میں اسے معاف کرتا ہوں تو بھی اسے بخش دے۔

---

(۱) صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۳۹۔

لیکن مستقبل میں غیبت کرنے کی اجازت دینا درست نہیں کیونکہ گناہ کی اجازت بجائے خود ایک گناہ ہے چونکہ یہ امر ایک برے کام میں لوگوں کو آزاد چھوڑنے اور ان کی تشویق و ترغیب کا باعث بنتاہے لہذا اسلام کی نظر میں یہ عمل ممنوع ہے در حقیقت اس قسم کی اجازت کا مطلب حلال خداوندی کو حرام اور حرام خداوندی کو حلال ٹھہرانا ہے۔
دین مقدس اسلام نے انسان کے اوپر اپنی آبرو کی حفاظت کو واجب قرار دیا ہے پس یہ کیسے معقول ہے کہ اسلام اسے اس بات کی چھوٹ دے کہ وہ دوسروں کو اپنی آبرو پامال کرنے کی اجازت دے؟

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

غیبت کا ارتکاب کرنے والے بہت سے موقعوں پر اپنے عمل کی توجیہ کی خاطر کہتے ہیں " فلاں آدمی کے جو عیوب میں نے بیان کئے ہیں وہ عیوب اس کے اندر موجود ہیں دوسرے لفظوں میں یہ اس کی غیبت نہیں بلکہ اس کی حقیقی صفات ہیں"

حالانکہ یہ عذر غیبت کے گناہ سے بھی بدتر ہے کیونکہ غیبت ان عیوب کے اظہار کا نام ہے جو کسی میں موجود ہوں اس کے اندر جو عیوب موجود نہ ہوں ان کا ذکر غیبت نہیں۔ غیبت کی مذمت میں جو آیات اور احادیث نقل ہوئی ہیں ان کا تعلق ان عیوب سے ہے جو اس شخص میں موجود ہوں۔

رہے وہ عیوب جو اس کے اندر موجود نہیں تو ان کا ذکر بہتان ہے جس کا گناہ غیبت سے زیادہ ہے۔

حضرت موسی بن جعفرؑ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ ذَكَرَ رَجلاً مِنْ خَلْفه بِمَا هُوَ فِيْه مِمّا عَرَفَهُ النَّاسُ لَمْ يَغْتَبْهُ وَ مَنْ ذَكَرَهُ مِنْ خَلْفِهِ بِمَا هُوَ فِيْه مِمَّا لَا يَعْرِفُهُ النَّاسُ اِغْتَابَهُ وَ مَنْ ذَكَرَهُ بِمَا لَيْسَ فِيْه فَقَدْ بَهتَه (۲)

جو شخص کسی کی عدم موجودگی میں اس کی ایسی برائی بیان کرے جو اس کے اندر موجود ہے اور لوگ بھی اس سے آگاہ ہیں تو یہ غیبت نہیں ہے اور جو شخص اس کے پیٹھ پیچھے اس کے اندر موجود اس برائی کا ذکر کرے جس سے لوگ واقف نہ ہوں تو یہ غیبت ہے۔ اور اگر ایسی برائی بیان کرے جو اس میں موجود نہیں تو یہ بہتان ہے۔

آشکارا گناہ

قرآن مجید بہتان کو آشکارا گناہ کے نام سے یاد کرتا ہے اور فرماتا ہے:

وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانا وَّاِثْماً مُبِيْناً (۲)

اور جو لوگ ایمان دار مردوں اور ایمان دار عورتوں کو بے جرم و خطا (تہمت لگاکر) اذیت دیتے ہیں تو وہ ایک بہتان اور واضح گناہ کا بوجھ اپنی گردن پر اٹھاتے ہیں۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۳۵۸۔

(۲) سورۃ الاحزاب / ۵۸۔

بہتان احادیث کی روشنی میں

احادیث میں تہمت اور بہتان کی زبردست مذمت ہوئی ہے۔ یہاں بطور نمونہ ان میں سے چند احادیث کا ذکر کیا جاتاہے۔ جو لوگ بے قصور اور پاکدامن افراد پر تہمت لگاتے ہیں وہ بے ایمان ہیں کیونکہ امام صادقؑ نے فرمایا ہے:

اِذَا اتَّھَمَ المُؤمِنُ اَخَاہُ اِنْمَاثَ الْاِیْمَانُ مِنْ قَلْبِہِ کَمَا یَنْمَاثُ المِلْحُ فِی المَآءِ (۱)

جو شخص اپنے مومن بھائی پر تہمت لگائے تو اس کا ایمان اس طرح پگھل جاتاہے جس طرح نمک پانی میں پگھل جاتاہے۔

تہمت لگانے والا کئی ایک گناہوں کا مرتکب ہوتاہے۔ ایک طرف سے وہ دوسرے فرد کی طرف غلط نسبت دینے کی بناء پر جھوٹ میں مبتلا ہوتاہے۔ دوسری طرف سے غیبت کا شکار ہوتاہے کیونکہ وہ دوسرے شخص کے بارے میں ایسی بات کہتاہے جس سے وہ راضی نہیں۔ علاوہ ازیں ایک بے گناہ اور نیک انسان پر تہمت لگاکر اس کی توھین کرتاہے۔

ان نکات کے پیش نظر تہمت لگانے والا بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوتاہے۔

تہمت کی مثال ایک تیر کی طرح ہے جو اپنے نشانے پر لگتا اور اس کا خاتمہ کردیتاہے غیبت اس شخص کی شخصیت کو پامال کردیتی ہے جس پر تہمت لگائی جائے اور اس کے دل کو ہمیشہ کے لئے مجروح کردیتی ہے۔ بنابریں تہمت لگانے والا گناہ کا سنگین بوجھ اپنی گردن پر لادتاہے اور خدا کا دردناک عذاب اس کا منتظر ہوتاہے۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۳۶۱۔

رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو:

مَنْ بَهَتَ مُؤْمِناً اَوْ مُؤْمِنَةً اَوْ قَالَ فِيْهِ مَا لَيْسَ فِيْهِ اَقَامَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى تَلٍّ مِنْ نَارٍ حَتّٰى يَخْرُجَ مِمَّا قَالَهُ (۱)

جو کسی مومن یا مومنہ پر بہتان لگائے یا اس کے بارے میں ایسی بری بات کہے جو اس کے اندر موجود نہیں تو اللہ تعالی قیامت کے دن اسے آگ کے ایک شعلے پر کھڑا کرے گا یہاں تک کہ اپنی اس بات کے شر سے جان چھڑائے۔

اپنے عیوب کا علاج

مؤمن اور صاحب اخلاق انسان کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عیوب سے مبرا رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ عیب جوئی ایک قبیح اور غیرپسندیدہ صفت ہے لیکن عیوب سے پرہیز ایک نہایت اچھی اور پسندیدہ صفت ہے کیونکہ انسان تب کامل ہوتا ہے جب وہ اپنے عیوب کو برطرف کرے۔ اس بات میں کسی کو شک نہیں کہ معصوم ہستیوں کے علاوہ سارے انسان نقائص اور کمزوریوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی غلطیوں سے مبرا نہیں ہوتا بنابریں سب پر لازم ہے کہ اپنے عیوب کو برطرف کرنے کی کوشش کریں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب انسان پہلے اپنے عیوب کو پہچانے اور ان کا اعتراف کرے۔ کیونکہ جب تک آدمی اپنے عیوب سے آگاہ نہ ہو اور ان کا معترف نہ ہو ان کا معالجہ کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

سوال:۔ انسان اپنے عیوب سے کیسے آگاہ ہوسکتا ہے؟

جواب:۔ انسان تین طریقوں سے اپنے عیوب کو پہچان سکتا ہے۔

---

(۱) بحارالانوار مطبوعہ بیروت ج ۲، ص ۱۹۴۔

وہ طریقے یہ ہیں:

(۱) مراقبہ اور محاسبہ: یعنی انسان اپنے اعمال و کردار پر نظر رکھے اور اپنا محاسبہ کرے تو وہ اپنے عیوب کو بخوبی پہچان سکتا ہے۔

(۲) غلط، برے اور بداخلاق لوگوں کے اعمال و کردار سے عبرت حاصل کرنا۔ سعدی کے بقول لقمان سے پوچھا گیا کہ آپ نے کس سے ادب سیکھا ہے؟ بولے۔ بے ادب لوگوں سے

(۳) ایسے مخلص اور ہمدرد دوستوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا جو نصیحت کرنے سے دریغ نہ کرتے ہوں اور اپنے دوست کی خامیوں کو چاپلوسی اور لحاظ داری کے بغیر اس کے گوش گزار کرتے ہوں۔

عاقل اور صاحب ایمان آدمی جس طرح ضرورت کے مواقع پر ڈاکٹر یا طبیب کی طرف رجوع کرتا ہے تاکہ کسی پوشیدہ یا لاعلاج بیماری میں مبتلا نہ ہو اسی طرح اسے اخلاقی مسائل میں بھی اخلاقی طبیب اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

جی ہاں حقیقی اور باایمان دوست اس راستے میں بہترین راہنمائی کر سکتے ہیں اور اپنے ساتھی کو اس کی بیماریوں سے آگاہ کر سکتے ہیں تاکہ وہ جلد سے جلد ان کا علاج کرنے کی کوشش کرے۔ البتہ یہ بات اس وقت مفید اور ثمر بخش ثابت ہو سکتی ہے جب انسان اپنے مخلص دوستوں اور ہمدرد ساتھیوں کی نصیحتوں کو دل کے کانوں سے سنے اور ان سے تقاضا کرے کہ وہ اسے اس کی غلطیوں اور لغزشوں سے آگاہ کرتے رہیں۔

اخلاقی ذمہ داری

جس طرح اسلام نے مخلص اور قابل اعتماد دینی بھائیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا حکم دیا ہے اسی طرح ان کی بھی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ صحیح اور مفید مشورہ دینے سے دریغ نہ کریں کیونکہ دوست وہ ہے جو اپنے ساتھی کو اس کے عیوب سے آگاہ کرے۔

احادیث میں مذکور ہے:

صَدِیْقُکَ مَنْ نَہَاکَ وَ عَدُوُّکَ مَنْ اَغْرَاکَ (۱)

آپ کا دوست وہ ہے جو آپکو برے کاموں سے روکے اور آپ کا دشمن وہ ہے جو آپ کو فریب دے (اور برے کاموں کو اچھا قرار دے)۔

امام صادقؑ نے فرمایا:

اَحَبُّ اِخْوَانِیْ اِلَیَّ مَنْ اَھْدیٰ اِلَیَّ عُیُوْبِیْ (۲)

میرا سب سے محبوب دوست وہ ہے جو میرے عیوب سے مجھے آگاہ کرے۔

عیب چھپانا خیانت ہے

جس طرح عیب جوئی قبیح اور حرام ہے اسی طرح عیوب سے آگاہ نہ کرنا بھی بد دیانتی ہے کیونکہ مومن پر لازم ہے کہ وہ آئینے کی طرح اپنے دینی بھائی کو اس کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ کرے۔ البتہ اس کی خامیاں خود اس کو بتائے نہ کہ دوسروں کے پاس کیونکہ آئینے کی صفت یہی ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ رایٰ اَخَاہُ عَلیٰ اَمْرٍ یَکْرَھُہُ فَلَمْ یَرُدَّہُ عَنْہُ وَ ھُوَ یَقْدِرُ عَلَیْہِ فَقَدْ خَانَہُ (۳)

جو شخص اپنے دینی بھائی کو کسی غیر پسندیدہ عمل میں مبتلا دیکھے لیکن اسے نہ روکے جبکہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہو تو یہ اس کے ساتھ خیانت ہے۔

---

(۱) فہرست موضوعی غرر، ص ۲۰۳۔

(۲) تحف العقول ص ۲۷۳۔

(۳) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج ۷۲، ص ۶۵۔

عیبوں سے اجتناب کی ضرورت اور عیب جوئی کی قباحت

عیبوں سے دوری کی ضرورت پر گفتگو ہو چکی ہے اس سلسلے میں جس قدر گفتگو کی جائے کم ہے۔ اس کے بعد اب ہم عیب جوئی کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ عیب جوئی کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے۔

یاد رہے کہ ان دونوں کے درمیان نہایت نازک سا فرق ہے کیونکہ اگر چہ ان دونوں میں بظاہر عیوب کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن عیب جوئی میں عیب کا ذکر دوسرے کی تحقیر اور تنقیص کے لئے ہوتا ہے اور دوسری قسم میں عیوب کا ذکر جذبۂ اصلاح و ہمدردی کے تحت ہوتا ہے۔ عیب جوئی میں دشمنی و عداوت کار فرما ہوتی ہے لیکن عیبوں سے نجات دلانے میں نصیحت اور ہمدردی کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔

اگر دوسروں کے عیوب کو ذکر کرنے کا مقصد خیر خواہی اور ہمدردی ہو تو لازمی طور پر مشفقانہ اور آبرومندانہ سلوک کا مظاہرہ ہوگا لیکن اگر دوسرے کی تنقیص اور تحقیر مطلوب ہو تو طبعی طور پر تحقیر آمیز اور توہین آمیز سلوک سامنے آئے گا۔

خلاصہ یہ کہ اگر چہ ہدف کے بہانے ہر قسم کے وسیلے کی اچھی تاویل نہیں کی جا سکتی لیکن ہدف وسیلے کی حد بندی کرتا ہے یعنی ہدف وسیلے کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔

قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (۱)

کہہ دو کہ ہر کوئی اپنی نیت اور ارادے کے مطابق عمل کرتا ہے۔

بنابریں جو کوئی دوسرے شخص کو اس کے عیوب سے آگاہ کرنے کا طالب ہو اسے نیک نیتی اور پاک دل کے ساتھ ایسا کرنا چاہیئے اور بات کرتے وقت ادب و احترام کا مکمل لحاظ کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس کی اہانت نہ ہونے پائے اور تعمیری

---

(۱) سورہ اسراء / ۸۴۔

تنقید کی بجائے عیب جوئی اور طعن و تشنیع کا راستہ اختیار نہ کیا جائے کیونکہ اس کا اثر الٹا ہوگا۔ کوئی انسان خطا و لغزش سے مبّرا نہیں ہوسکتا اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ غلطیوں کا مرتکب نہیں ہوتا سوائے معصوم اماموںؑ کے جو خود معصوم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اللہ کے حضور ناقص اور گناہگار گردانتے تھے۔ مثال کے طور پر امام سجادؑ خدا کے حضور عرض کرتے ہیں:

اِلٰهی اِلَیکَ اَشکُوْ نَفساً بِالسّوءِ اَمّارَۃً وَ اِلیَ الْخَطِیئَةِ مُبادِرَۃً وَ بِمَعَاصِیکَ مُولَعَۃً وِلسَخَطِکَ مُتَعَرِّضَۃً (۱)

خدایا میں تجھ سے اس نفس کی شکایت کرتاہوں جو (مجھے) برائی کی بہت ترغیب دیتاہے، ہر خطا کی طرف سبقت کرتاہے، تیری نافرمانیوں کا دلدادہ ہے اور تیرے غیظ و غضب کو دعوت دیتاہے۔

امام علیؑ نے فرمایا:

نُصْحُکَ بَیْنَ الْمَلاَءِ تَقْرِیْعٌ (۲)

لوگوں کے درمیان کسی کو نصیحت کرنا اس (کی شخصیت) کو کچلنے کا باعث ہے۔

امام حسن عسکریؑ کا فرمان ہے:

مَنْ وَعَظَ اَخاهُ سِترا فَقَدْ زَانَه وَ مَنْ وَعَظه عَلاَنِیَۃً فَقَدْ شَانَه (۳)

جس نے دوسروں سے چھپاکر اپنے دینی بھائی کو نصیحت کی اس نے اس کی لاج رکھی لیکن (اس کے برعکس) جس نے دوسروں کی موجودگی میں اس کو نصیحت کی گویا اس نے اس کی بے عزتی کی۔

---

(۱) مفاتیح الجنان مناجات خمسۃ عشر مناجات دوم۔

(۲) فہرست موضوعی غرر ص ۳۸۲۔

(۳) تحف العقول ص ۳۸۶۔

بقول شاعر

نصیحت در نہانی بہتر آید گره از جان و بند از دل گشاید۔

چھپاکر نصیحت کرنا بہتر ہے کیونکہ یہ دلوں کی گرہیں کھول دیتی ہے۔

عیب جوئی کا برا انجام

اگر دوسروں کے عیوب کو ذکر کرنے کا مقصد ان کی رسوائی ہو تو یقینا ایک دن آئے گا کہ اللہ اسے لوگوں کے درمیان رسوا کردے گا۔

امام باقرؑ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يُسْلِمْ بِقَلْبِهِ لا تَتَّبِعُوْا عَثَرَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاِنَّهُ مَنْ يَتَّبِعْ عَثَرَاتِ الْمُسْلِمِيْنَ يَتَّبِعِ الْمُسْلِمِيْنَ يَتَّبِعُ اللّٰهُ عَثَرَاتِهِ وَمَنْ يَتَّبِعُ اللّٰهُ عَثَرَاتِهِ يَفْضَحُهُ (۱)

اے بظاہر ایمان لانے والو جو دل سے مسلمان نہیں ہوئے ہو! مسلمانوں کی لغزشیں مت ڈھونڈو کیونکہ جو کوئی مسلمانوں کی لغزشوں کے پیچھے پھرتاہے اللہ اس کی خطاؤں کو طشت ازبام کردیتاہے اور اسے ذلیل و خوار فرماتاہے۔

عیب جوئی اور کفر

جو لوگ بظاہر اپنے دینی بھائی کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھاتے ہیں اور اس کا اعتماد حاصل کرتے ہیں لیکن باطن میں اس سے دشمنی رکھتے ہیں، اس کی لغزشوں، خطاؤں اور کمزوریوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں تاکہ موقع پاکر اسے رسوا کریں وہ آخر کار کفر کی حدود کو چھونے لگتے ہیں۔

---

(۱) الوافی ج ۳ ص ۱۶۳۔

اس سلسلے میں امام باقر علیہ السلام کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو:

مِنْ اَقْرَب مَا یَکُونُ الْعَبْدُ اِلَی الْکُفْرِ اَنْ یُوَاخِیَ الرَّجلُ عَلَی الدِّینِ فَیُحْصِیَ عَلَیْهِ زَلَّاتِهِ لِیُعَیِّرَهُ بِهَا یَوْماً مَّا [1]

انسان کو کفر کی سرحدوں کے نزدیک لانے والے امور میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے دینی بھائی کے ساتھ بظاہر دوستی کا مظاہرہ کرے لیکن (در حقیقت) وہ اس کی لغزشوں کو گنتا رہے تاکہ کسی دن اسے رسوا کرے۔

دردناک عذاب

تعمیری تنقید کی بجائے دوسروں کے عیوب کو آشکار کرنے اور ان کی حیثیت کو گھٹانے کی کوشش کرنے والے عظیم گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس گناہ کے باعث وہ دردناک عذاب کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیمٌ فِی الدُّنْیَا وَ الْآخِرَةِ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [2]

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں کے درمیان برائیوں کا چرچا ہو بے شک ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ (حقیقت حال کو) خوب جانتا ہے جبکہ تم لوگ نہیں جانتے ہو۔

یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اللہ یہ نہیں فرماتا جو لوگ ایمان والوں کے درمیان برائیاں پھیلاتے ہیں وہ عذاب کے مستحق ہیں بلکہ فرماتا ہے جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں کے درمیان برائی کا چرچا ہو وہ عذاب پائیں گے۔

---

(۱) جامع السعادات ج ۲ ص ۲۷۹۔

(۲) سورۂ نور / ۱۹۔

یہ بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان کی آبرو خدا کی نظر میں قابل احترام ہے اور وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مومنوں کے بارے میں کہی اور سنی جانے والی ہر چیز دوسروں کے پاس نقل کی جائے۔ کیونکہ اگر انسان اپنی آنکھوں سے کسی کو گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے تو بھی اسے یہ حق حاصل نہیں کہ اس کا راز فاش کرے کہاں یہ کہ کوئی بات صرف دوسروں سے سنی ہو اور خود نہ دیکھی ہو۔ (غور کریں)

امام صادقؑ نے فرمایا ہے:

مَنْ قَالَ عَنْ مُؤْمِنٍ مَا رَاٰتْهُ عَيْنَاه وَ سَمِعَتْهُ اُذنَاهُ فَهُوَ مِنَ الذَّيْنَ قَالَ اللّٰه عزَّ وَّ جَلَّ اِنَّ الَّذِيْـنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْـعَ الفَاحِشَـةُ ..... (۱)

جو شخص کسی مومن کے بارے میں وہ بات کہے جسے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور اپنے کانوں سے سنا ہو (اور اسے لوگوں کے درمیان پھیلائے)

تو وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں اللّٰہ نے فرمایا ہے: اِنَّ الَّذینَ یُحِبُّونَ اَنْ تَشیْعَ الفاحشه ....

برائیوں کے پھیلاؤ کا مقابلہ کرنے کے طریقے

۱۔ عیب جوئی کرنے والوں کی مصاحبت سے اجتناب

سب سے بہترین راستہ یہ ہے کہ عیب جوئی کرنے والے لوگوں سے دوری کی روش اختیار کی جائے۔

دوسروں کی عیب جوئی کرنے والوں کی مثال مکھیوں جیسی ہے جو گندگی پر بیٹھی ہیں یہ افراد فقط منفی پہلوؤں پر توجہ کرتے ہیں اور لوگوں کی مثبت صفات نظر انداز کردیتے ہیں۔

---

(۱) تفسیر المیزان ج ۱۵ ص ۱۱۴۔

چنانچہ امام صادقؑ کا ارشاد ہے:

الاَشرَارُ یَتَّبِعُونَ مَسَاوِیَ النَّاسِ وَ یَترُکُونَ مَحَاسِنَہُم کَمَا یَتَّبِعُ الذُّبَابُ اَلمَوَاضِعَ الفَاسِدَۃَ مِنَ الجَسَدِ وَ یَترُکُ الصَّحِیحَ (۱)

یعنی برے اور پست فطرت لوگ دوسروں کے عیوب اور برے کاموں کی ٹوہ میں رہتے ہیں لیکن ان کی اچھی باتوں سے آنکھیں موند لیتے ہیں جس طرح مکھی بدن کے گندے حصوں کے پیچھے پھرتی ہے اور صاف جگہوں کو چھوڑ دیتی ہے۔

بنابریں ان لوگوں کے ساتھ مصاحبت اور ہم نشینی سے احتراز ضروری ہے ایسے لوگوں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ دوستی قائم نہ کی جائے بلکہ ان کو اپنے شدید ترین دشمنوں کے زمرے میں شمار کرنا چاہیئے کیونکہ ممکن ہے کہ ان کے ساتھ نشست و برخاست کے نتیجے میں ایک دن وہ کسی نقص کا مشاہدہ کریں اور انسان کی عزت خاک میں ملادیں۔ اسی بات کے پیش نظر امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا:

لِیَکُنْ اَبغَضُ النَّاسِ اِلَیکَ وَ اَبعَدُھُم مِنکَ اَطلَبُھُم لِمَعَایِبِ النَّاسِ (۲)

تمہیں چاہیئے کہ لوگوں میں سے جو افراد سب سے زیادہ دوسروں کے عیوب کی تلاش میں رہتے ہیں ان کے ساتھ سب سے زیادہ عداوت رکھو اور ان کو سب سے زیادہ اپنے آپ سے دور رکھو۔

۲۔ عیب جوؤں سے بے اعتنائی:

برائیوں کے پھیلاؤ کا مقابلہ کرنے کا ایک مؤثرترین راستہ عیب جوئی کرنے والوں سے بے اعتنائی برتنا ہے۔ عیب جوئی کرنے والوں کی باتوں کو اہمیت نہ دی جائے تو یہ لوگ مایوس ہو کر اپنی روش چھوڑ دیں گے۔

---

(۱) سفینۃ البحار ج ۲ ص ۲۹۵۔

(۲) فہرست غرر ص ۴۸۸۔

محمد بن فضیل کا بیان ہے: میں امام ہفتم حضرت موسی بن جعفرؑ کی خدمت میں پہنچا اور میں نے عرض کیا: قربان جاؤں! میں نے اپنے برادر دینی کے بارے میں ایسی بات سنی ہے جو مجھے ناپسند ہے لیکن جب میں خود اس سے سوال کرتا ہوں تو وہ انکار کرتا ہے حالانکہ قابل اعتماد لوگوں کی ایک جماعت سے میں نے یہ بات سنی ہے۔

امامؑ نے فرمایا:

يَا مُحَمَّدُ كَذِّبْ سَمْعَكَ وَ بَصَرَكَ عَنْ اَخِيكَ فَاِنْ شَهِدَ عِنْدَكَ خَمْسُوْنَ قَسَامَةً وَ قَالُوا لَكَ قَوْلاً فَصَدِّقْهُ وَكَذِّبْهُمْ لاَ تَذِيْعَنَّ عَلَيْهِ شَيْئاً تُشِيْنُهُ بِهِ وَ تَهْدِمُ بِهِ مُرُوَّتَهُ فَتَكُونَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالَ اللهُ فِي كِتَابِهِ اِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ .... (۱)

اے محمدؐ اپنے برادر دینی کے معاملے میں اپنی سماعت اور بصارت کی تکذیب کرو۔ اگر پچاس افراد گواہ کی حیثیت سے تیرے پاس قسم کھاکر اس کے خلاف کوئی بات کہیں لیکن وہ خود اس کا انکار کرے تو اس کی تصدیق اور ان کی تکذیب کرو۔ (اس کے بعد فرمایا) خبردار اس کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ پھیلاؤ جو اس کے لئے باعث ننگ ہو اور جس سے اس کی شخصیت اور حیثیت تباہ ہوتی ہو ورنہ تمہارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جن کے بارے میں اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے بہ تحقیق جو لوگ چاہتے ہیں کہ مومنین کے درمیان برائیوں کا چرچا ہو (ان کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے)۔

---

(۱) تفسیر برہان ج ۳ ص ۱۲۸۔

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مروی ہے:

يَجِبُ لِلمؤمِنِ عَلَى المُؤمِنِ اَنْ يَسْتُرَ عَلَيهِ سَبْعِينَ كَبِيرَةً (۱)

مومن کے اوپر واجب ہے کہ دوسرے مومن کے ستر کبیرہ گناہوں پر پردہ ڈالے۔

نتیجہ بحث

اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ انسان کو اپنے عیوب سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ اس سلسلے میں دوسروں کے نظریات اور تنقیدی خیالات سے بھی رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے نیز مخلص، نیک اور قابل اعتماد افراد کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ دوسری طرف سے وہ دوست جو خیرخواہی کی بناء پر اپنے دوست کو اس کی خطاؤں اور لغزشوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں انہیں چاہیئے کہ بہت خفیہ اور خصوصی طریقے سے یاد دہانی کرائیں۔ لوگوں کے سامنے ایسا نہ کریں۔

اگر کوئی شخص عیوب و نقائص سے نجات دلانے اور نصیحت کے نام پر مومنوں کے عیوب اور گناہوں کو لوگوں کے درمیان فاش کرے تو وہ قرآن کی اس آیت "انَّ الَّذينَ يُحِبّونَ ان تَشيعَ الفاحِشَة ...... کی رو سے ان لوگوں کے زمرے میں شامل ہوگا جو چاہتے ہیں کہ برائیوں کا چرچا ہو ایسا آدمی دنیا و آخرت میں اللہ کے دردناک عذاب میں مبتلا ہوجائے گا۔

---

(۱) تفسیر برہان ج ۳ ص ۱۲۸۔

نوٹ:-

بظاہر یہاں ستر گناہوں سے مراد گناہوں کی کثرت ہے اور اس عدد (ستر) کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں یعنی مومن کو چاہیئے کہ دوسرے مومن کے گناہوں کو چھپائے اگر چہ زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔

جھوٹ

زبان کی آفتوں اور اللہ کی طرف سے حرام قرار دیے جانے والے امور میں سے ایک جھوٹ ہے، جھوٹ گناہ کبیرہ ہے اور گناہوں کی چابی ہے نیز تمام برائیوں اور قباحتوں کا سرچشمہ ہے۔ صاحب ایمان مسلمان کبھی بھی اپنی زبان کو اس بری عادت میں مبتلا نہیں کرتا۔

جھوٹ انسان کی حیثیت کو خراب اور اس کے اعتبار کو ضائع، نیز اس کے بارے میں لوگوں کے اعتماد کو متزلزل کردیتا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ چونکہ جھوٹ بولنا آسان ہوتا ہے اس لئے کچھ لوگ اپنے مقاصد تک جلد رسائی کے زعم میں جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں اور اس سلسلے میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ دن میں دسیوں بار جھوٹ بولتے ہیں۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ایسے لوگ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر جھوٹ کے منفی اثرات اور اس کے برے نتائج پر غور و فکر نہیں کرتے۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ کچھ لوگ جھوٹ کو ہوشیاری و عقلمندی اور سچ بولنے والوں کو سادہ اندیش قرار دیتے ہیں لیکن وہ اس اہم نکتے سے غافل ہیں کہ دروغگوئی انسان کی پاک فطرت اور عظمت کے منافی ہے نیز جھوٹ اللہ کے ساتھ دشمنی و جنگ اور فطرت کے تقاضوں کی مخالفت سے عبارت ہے کیونکہ اللہ نے کائنات کو سچائی، حقیقت اور صداقت کی بنیاد پر خلق فرمایا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۱)

اور وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ خلق کیا۔

کائنات کی ہر چیز میں صداقت، صراحت اور حقیقت کا قانون جاری و ساری ہے۔

---

(۱) سورۂ انعام / ۷۳۔

اگر چہ ہم بظاہر اس کائنات میں بعض تضادات کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن در حقیقت قانون فطرت میں جھوٹ اور خیانت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خالص حقیقتوں کو عالم فطرت اور عالم وجود میں تلاش کرنا چاہیئے اور زبان فطرت سے ہی اس کی تعریف سننی چاہیئے امیر المومنین علی (علیہ السلام) اس حقیقت کی یوں ترجمانی فرماتے ہیں:

اِنَّ الدُّنْیَا دارُ صِدْقٍ لِمَنْ صَدَّقَهَا (۱)

بہ تحقیق دنیا ان لوگوں کے لئے صداقت کی منزل ہے جو اس کی تصدیق کریں

اللہ تعالی تکوینی اور تشریعی دونوں اعتبار سے صداقت و سچائی کے ساتھ اپنے بندوں سے گفتگو کرتا ہے اور فرماتا ہے:

وَ تَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ صِدْقاً وَّ عَدْلاً لاَ مُبَدِّلَ لِکَلِمَاتِهِ (۲)

سچائی اور انصاف میں تو تمہارے پروردگار کی بات درجہ کمال پر پہنچی ہوئی ہے اور اس کی باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں.

وہ اپنے بندوں سے بغیر سچائی اور درستی کے کوئی چیز قبول نہیں کرتا نیز فرماتا ہے:

هَذا یَوْمُ یَنْفَعُ الصَّادِقِیْنَ صِدْقُهم (۳)

یہ (روز قیامت) وہ دن ہے جب سچے بندوں کو ان کی سچائی کام دے گی.

دوسری طرف اللہ اپنے رسولوں کی صداقت کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور مومنوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ سچوں کے ساتھ رہیں۔

---

(۱) نہج البلاغہ حکمت نمبر ۲۶۔

(۲) سورۂ انعام / ۱۱۵۔

(۳) سورہ مائدہ / ۱۱۹۔

چنانچہ ارشاد باری ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوا مَعَ الصَّادِقِیْنَ (۱)

اے ایمان لانے والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

چند ضروری نکات

الف:۔ عام طور پر کہا جاتاہے کہ سچ وہ ہے جو حقیقت کے مطابق ہو اور جھوٹ وہ ہے جو حقیقت کے برخلاف ہو۔ یہ تعریف اگر چہ صدق و کذب کی شناخت کے لئے در حقیقت سب سے بہترین معیار ہے اور علمی مسائل میں صرف یہی معیار قابل قبول ہے لیکن یہ معیار اخلاقی اور قانونی نقطہ نظر سے علت تامہ نہیں ہوسکتا۔ یعنی قانون سازی، حکم اور سزا کے وقت صرف یہ معیار کافی نہیں کیونکہ حکم کے نتیجے میں ذمہ داری اس وقت عائد ہوتی ہے جب اس سے قبل حکم اور موضوع کے بارے میں علم و یقین حاصل ہو۔ بنابریں اگر بندے کو حکم اور موضوع کے بارے میں یقین حاصل نہ ہو تو اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ پس اگر کوئی شخص کسی غیر حقیقی بات کو اپنی نظر میں حقیقت سمجھے اور اس کا اسے یقین بھی حاصل ہو، پھر اسے ایک خبر کی حیثیت سے دوسروں کے لئے بیان کرے تو وہ شرعی اور قانونی لحاظ سے جھوٹا شمار نہیں ہوگا اور نہ اسے جھوٹ کی سزا دی جاسکے گی۔ اگر چہ اس کا یہ عمل اپنی ماہیت کے لحاظ سے اور علمی نقطہ نظر سے حقیقت کے برخلاف اور جھوٹ ہے۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ روزے کو باطل کرنے والی چیزوں میں سے ایک اللہ اور رسولؐ سے جھوٹ منسوب کرنا ہے لیکن اگر کوئی روزہ دار غلط فہمی کی بناء پر کوئی حکم اللہ اور رسولؐ سے منسوب کرے تو اس کا روزہ باطل نہیں ہوگا کیونکہ اس نے جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولا۔ اس قسم کے مواقع پر متکلم کو دروغگو

---

(۱) سورہ توبہ / ۱۱۹۔

کی حیثیت سے سزا نہیں دی جا سکتی اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کسی حکم کے موثر ہونے میں علم کا دخل ہے اگر چہ انسان کے جاننے یا نہ جاننے کی بناء پر حقیقت تبدیل نہیں ہوتی

ب :۔ جھوٹ اخلاقی پستی اور نفاق کی علامت ہے اگر چہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتےہیں کہ امام زین العابدین ؑ نے اپنی اولاد کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

اِتَّقُوا الْكِذْبَ الصَّغِيْرَ مِنْه وَالْكَبِيْرَ فِى كُلِّ جِدٍّ وَ هَزْلٍ فَاِنَّ الرَّجُلَ اِذَا كَذِبَ فِى صَغِيْرٍ اِجْتَرَءَ عَلَى الْكَبِيْرِ ، اَمَا عَلِمْتُمْ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ (ص) قَالَ مَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَصْدُقُ حَتّٰى يَكْتُبَهُ اللّٰهُ صِدِّيقاً وَ مَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَكْذِبُ حَتّٰى يَكْتُبَهُ اللّٰهُ كَذَّاباً (۱)

ہر جھوٹ سے پرہیز کرو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ سنجیدگی کے ساتھ یا خوش طبعی کی خاطر۔ ہرگز جھوٹ نہ بولو کیونکہ جب آدمی چھوٹے سے امر میں جھوٹ بولتاہے تو وہ بڑے بڑے جھوٹ بولنے میں بھی جراتمند ہوجاتاہے۔ کیا تجھے علم نہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا اللہ کا (ایک) بندہ ہمیشہ سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ اسے صدیقوں میں شمار کرتا ہے۔اور اللہ کا (دوسرا) بندہ جھوٹ بولتا رہتاہے یہاں تک کہ اللہ اس کا نام "کذابین" کے زمرے میں درج فرماتاہے۔

ج :۔ مذاق کے لئے بھی جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مزاح اور دوسروں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ لیکن یہ بات مد نظر رہے کہ اسلام نے ہر قسم کے جھوٹ سے منع کیا ہے اور ہر قسم کے جھوٹ کو ایمان کے منافی قرار دیا ہے خواہ وہ مزاح کے طور پر بولا جائے یا سنجیدگی کے ساتھ (۲) بہر حال جھوٹ چھوٹا ہو یا بڑا، سنجیدہ ہو

---

(۱) اصول کافی جلد ۲ ص ۳۳۸ ۔

(۲) مولا علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:۔ لَا يَجِدُ عَبْدٌ طَعْمَ الايمان حتّٰى يَتْرُكَ الْكِذْبَ هزله و جده۔

یا از راہ مزاح گناہ ہے اور انسان کے نامہ عمل میں درج ہوتا ہے ۔ کتنے ہی جھوٹ ایسے ہیں جو لوگوں کی نظر میں گناہ نہ ہوں لیکن اسلام کی نظر میں وہ قبیح اور غیر پسندیدہ ہیں ۔

پس جھوٹ کی عادت سے محفوظ رہنے کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی جھوٹ بولنے سے احتراز کرنا چاہیئے تا کہ انسان کی زبان اس کے قابو میں رہے ۔

د: جیسا کہ عرض ہوچکا جھوٹ بولنا ہر صورت میں حرام اور قبیح ہے (ضرورت کے موقعوں کے علاوہ جن کا ذکر بعد میں ہوگا) لیکن یاد رہے کہ علم اخلاق میں جس چیز کو اخلاقی قدروں کے منافی اور اخلاقی پستی قرار دیا گیا ہے اس سے مراد جھوٹ بولنے کی عادت اور جھوٹ کا خوگر ہونا ہے ۔ اسی لئے احادیث میں مذکور ہے کہ جھوٹ اور ایمان کا ساتھ نہیں ہوسکتا دوسرے لفظوں میں ممکن ہے کہ کوئی مومن ضرورت کے تحت یا غفلت کی بناپر کبھی جھوٹ بولے لیکن اس بات کا امکان نہیں کہ کوئی آدمی مومن ہونے کے باوجود جھوٹ کو اپنا وتیرہ قرار دے ۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے :

اِنَّ الْمُؤْمِنَ یَنْطَبِعُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ اِلَّا عَلَی الْکِذْبِ وَ الْخِیَانَةِ (۱)

مومن ہر چیز کا عادی ہوسکتا ہے سوائے جھوٹ اور خیانت کے ۔

حسن بن محبوب کا بیان ہے: میں نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہاں۔ میں نے سوال کیا: کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہاں۔ میں نے پھر پوچھا کیا مؤمن کذاب (بہت جھوٹ بولنے والا) ہوسکتا ہے، فرمایا نہیں اس کے بعد امامؑ نے فرمایا:

جُبِّلَ الْمُؤْمِنُ عَلٰی کُلِّ طَبِیْعَةٍ اِلَّا الْخِیَانَةَ وَالْکِذْبَ (۲)

مومن ہر خصلت کا خوگر ہوسکتا ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے ۔

---

(۱) مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۱۰۰ ۔

(۲) مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۱۰۰ ۔

ھ :- جھوٹ کی نفسیاتی علت احساس کمتری ہے ۔ اخلاقی نفسیات میں اس نکتے پر خاص توجہ کی ضرورت ہے ۔

رسول اللہؐ فرماتے ہیں :

لاَ یَکْذِبُ الْکَاذِبُ اِلاّ مِنْ مھانۃ نَفْسِہ ۔

جھوٹ بولنے والا جھوٹ نہیں بولتا مگر احساس کمتری کی بناء پر.

جھوٹ قرآن کی نظر میں

قرآن مجید میں جھوٹ اور باطل بات کا تذکرہ شرک کے ہمراہ کیا گیا ہے ۔ ارشاد ربانی ہے :

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ (۱)

پس تم ناپاک بتوں سے بچے رہو اور لغو باتوں (جھوٹ و غیرہ) سے اجتناب کرو ۔

جھوٹ بولنے والا بے ایمان ہے

قرآن مجید کی نظر میں جھوٹ بولنے والے مومن نہیں ہیں ۔ قرآن جھوٹوں کو کفار اور آیات الٰہی کے جھٹلانے والوں کی صف میں داخل کرتا ہے ۔

ارشاد خداوندی ہے :

اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ بِآیَاتِ اللهِ وَ اولٰئِکَ ھُمُ الْکَاذِبُوْنَ (۲)

صرف وہی لوگ خدا پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور حقیقت امر یہ ہے کہ یہی لوگ جھوٹے ہیں.

---

(۱) سورۂ حج / ۳۰ ۔

(۲) سورہ نحل / ۱۰۵ ۔

جھوٹ بولنے والا اللہ کی طرف سے ہدایت نہیں پاتا. چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ (۱)

بہ تحقیق اللہ اس شخص کو ہدایت سے ہمکنار نہیں کرتا جو جھوٹا اور اس کی نعمتوں کا انکار کرنے والا ہو.

جھوٹا آدمی اللہ کی رحمت سے دور ہے آیہ مباہلہ میں ارشاد ہوتا ہے:

فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ (۲)

پھر ہم جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں.

قرآن نے کن لوگوں پر لعنت بھیجی ہے؟

اللہ تعالی نے قرآن مجید میں بہت سے لوگوں اور گروہوں پر لعنت بھیجی ہے جن میں سے ایک گروہ جھوٹ بولنے والوں کا ہے۔ وہ گروہ یہ ہیں:

۱) منافقین۔ (سورہ توبہ آیت ۶۸).
۲) مشرکین۔ (سورہ الفتح آیت ۶).
۳) کفار۔ (سورہ بقرہ ۱۶۱).
۴) زمین میں فساد پھیلانے والے۔ (سورہ رعد آیت ۲۵).
۵) قوم یہود۔ (سورہ المائدہ ۶۴).
۶) مرتدین۔ (سورہ آل عمران آیت ۸۶).
۷) شیطان۔ (سورہ نساء آیت ۱۱۷).
۸) اللہ اور رسول کو ستانے والے۔ (سورہ احزاب آیت ۵۷).
۹) جھوٹ بولنے والے۔ (ان کے بارے میں آیات کا تذکرہ ہو چکا).

---

(۱) سورہ غافر / ۲۸۔

(۲) سورۂ آل عمران / ۶۱۔

جھوٹ، احادیث کی روشنی میں

جھوٹ خدا کے ساتھ شرک کے زمرے میں آتا ہے چنانچہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

اَلاَ اُخْبِرُکُمْ بِاَکْبَرِ الْکَبَائِرِ؟ اَلاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَ عُقُوقُ الْوَالِدَیْنِ وَ قَوْلُ الزُّوْرِ اَیْ اَلْکِذْب (۱)

یعنی کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟(وہ یہ ہیں)

۱۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینا۔

۲۔ والدین کے ساتھ برا سلوک۔(والدین کا عاق ہونا)

۳۔ جھوٹ بولنا۔

جھوٹ گناہوں کی چابی

حضرت امام حسن عسکریؑ نے فرمایا:

جُعِلَتِ الْخَبَائِثُ کُلُّهَا فِی بَیْتٍ وَ جُعِلَ مِفْتَاحُهَا الْکِذْبُ (۲)

تمام گناہوں کو ایک گھر میں جمع کیا گیا ہے اور ان کی چابی جھوٹ ہے۔

جھوٹ شراب سے بدتر ہے

حضرت امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَ جَلَّ جَعَلَ لِلشَّرِّ اَقْفَالاً وَ جَعَلَ مَفَاتِیحَ تِلْکَ الْاَقْفَالِ الشَّرَابَ وَ الْکِذْبُ شَرٌّ مِنَ الشَّرَابِ (۳)

اللہ تعالی نے تمام برائیوں پر تالے لگا رکھے ہیں اور شراب کو ان تالوں کی چابی قرار دی ہے اور جھوٹ شراب سے بھی بدتر ہے۔

---

(۱) جامع السعادات ج ۲ ص ۳۲۲۔

(۲) جامع السعادات ج ۲ ص ۳۳۳۔

(۳) وسائل ج ۸ ص ۵۷۲۔

جھوٹ خرابی ایمان کا پیش خیمہ ہے

حضرت امام باقرؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ الْکِذْبَ ھُوَ خَرَابُ الْاِیْمان [1]

جھوٹ ایمان کی خرابی کا باعث ہے۔

جھوٹ بولنے والوں پر فرشتے لعنت کرتے ہیں

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اَلْمُؤمِنُ اذا کَذِبَ مِنْ غَیْرِ عُذْرٍ لَعَنَہ سَبْعُونَ اَلْفَ مَلَکٍ وَ خَرَجَ مِنْ قَلْبِہِ نَتِن حَتّٰی یَبْلُغَ الْعَرْشَ فَیَلْعَنُہُ حَمَلَۃَ الْعَرْشِ [2]

جب مومن بلا وجہ جھوٹ بولتاہے تو ستر ہزار فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں اور اس کے قلب سے ایک بدبو خارج ہوتی ہے جو عرش تک پہنچتی ہے تب عرش کے ساکن اس پر لعنت کرتے ہیں۔

جھوٹ، نفاق کی علامت ہے

رسول اللہؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ثَلاَثٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ فَھُوَ مُنَافِق وَاِنْ صَامَ وَ صَلّٰی وَ زَعَمَ اَنَّہ مُسلِم اذا حَدَّثَ کَذِبَ وَ اذا وَعَدَ اخْلَفَ وَ اذا ائْتُمِنَ خَافَ [3]

یعنی تین خصلتیں ایسی ہیں جو اگر کسی انسان میں پائی جائیں تو وہ منافق ہے اگرچہ وہ روزہ رکھے، نماز پڑھے اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھے۔

---

(۱) بحارالانوار ج ۶۹ ص ۲۴۷ مطبوعہ بیروت۔

(۲) مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۱۰۰۔

(۳) محجۃ البیضاء۔ ج ۵ ص ۲۳۸۔

وہ تین خصلتیں یہ ہیں :-

۱۔ جھوٹ بولنا۔
۲۔ وعدہ خلافی۔
۳۔ امانت میں خیانت۔

نماز شب سے محرومی

جھوٹ ان گناہوں میں سے ایک ہے جن کے باعث نماز تہجد پڑھنے کی توفیق سلب ہوجاتی ہے۔ امام صادق علیہ السلام نے اس نکتے کو یوں بیان فرمایا ہے:

اِنَّ الرَّجُلَ لَیَکْذِبُ الْکِذْبَۃَ فَیُحْرَمُ بِھَا صَلاۃَ اللَّیْلِ (۱)

یعنی جو شخص جھوٹ بولتاہے وہ اس جھوٹ کے باعث نماز شب (تہجد) کی توفیق سے محروم ہوجاتاہے۔

جھوٹ رزق کو کم کرتاہے

چنانچہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اَلْکِذْبُ یَنْقُصُ الرِّزْقَ (۲)

جھوٹ رزق میں کمی کا باعث ہے۔

جھوٹ نسیان کا باعث ہے

چنانچہ امام صادقؑ کا ارشاد ہے:

اِنَّ مِمَّا اَعَانَ اللّٰہُ عَلَی الْکَذَّابِیْنَ النِّسْیَانُ (۳)

اللہ تعالی بہت زیادہ جھوٹ بولنے والوں پر نسیان اور فراموشی کو مسلط فرماتاہے۔

---

(۱) سفینۃ البحار ج ۲ ص ۴۷۳۔

(۲) جامع السعادات ج ۲ ص ۳۲۲۔

(۳) بحارالانوار مطبوعہ بیروت ۶۹ ص ۲۵۱۔

ایک اور اہم نکتہ

انسان پر لازم ہے کہ خود بھی جھوٹ نہ بولے اور جھوٹ بولنے والوں کے ساتھ دوستی و ہمنشینی سے بھی اجتناب کرے۔ اس سلسلے میں امام باقرؑ نے فرمایا ہے:

لاَ تُقَارِن وَ لاَ تُوَاخِ اَرْبَعَةً، الاَحْمَق وَ البَخِيلَ وَالجِبَانَ وَ الكَذَّابَ .....

یعنی چار قسم کے لوگوں کے ساتھ مصاحبت اور دوستی سے اجتناب کرو

۱۔ احمق ۲۔ بخیل ۳۔ بزدل ۴۔ دروغگو

اس کے بعد فرمایا:

اَمَّا الكَذَّابَ فَانَّهُ يَصْدُقُ وَ لَا يُصَدَّقُ (۱)

جھوٹا آدمی اگر سچ بولے تب بھی اس کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام نے اپنے فرزند ارجمند حضرت امام حسنؑ سے فرمایا:

اِيَّاكَ وَ مُصَادَقَةَ الكَذَّابِ فَانَّهُ كَالسَّرَابِ يُقَرِّبُ عَلَيْكَ الْبَعِيْدَ وَ يُبَعِّدُ عَلَيْكَ الْقَرِيْبَ (۲)

جھوٹے آدمی سے دوستی نہ کرو کیونکہ اس کی مثال سراب جیسی ہے جو تیری نظر میں دور کو نزدیک اور نزدیک کو دور دکھاتا ہے۔

وہ مقامات جہاں جھوٹ بولنا حرام نہیں

قبل ازیں ہم عرض کر چکے ہیں کہ جھوٹ بولنا بنیادی طور پر ایک قبیح اور غیرپسندیدہ عمل ہے نیز جھوٹ کا خوگر ہونا اخلاقی پستی اور گناہ کبیرہ ہے اور جب تک کوئی اہم ضرورت یا مصلحت درپیش نہ ہو جھوٹ بولنا جائز نہیں۔

جن موارد میں ضرورت یا مصلحت کی بنیاد پر جھوٹ بولنے کی گنجائش رکھی گئی ہیں وہ یہ ہیں

---

(۱) شیخ صدوق کی کتاب الخصال ج ۱ ص ۲۲۱ حدیث ۸۹۔

(۲) نہج البلاغۃ صبحی صالح حکمت نمبر ۳۸۔

۱۔ مجبوری اور ضرورت

اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ ضرورت کے مقام پر دو نقصان دہ باتوں میں سے اس کو اختیار کرنا چاہیئے جس کا ضرر کم ہو قرآن مجید نے جبر و اکراہ اور مجبوری کے وقت تقیہ کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ واضح ہے کہ تقیہ بھی ایک قسم کی خلاف واقع بات اور حقیقت کی نفی ہے انسان مجبوری کے وقت اپنے اصلی عقیدے کو چھپاکر تقیہ سے کام لے سکتا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد گہر بار ہے:

اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ (۱)

سوائے اس شخص کے جسے (کلمہ کفر پر) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے حوالے سے مطمئن ہو۔

رسول اللہؐ نے اس سلسلے میں فرمایا ہے:

مَا مِنْ شَیْئٍ اِلَّا وَقَدْ اَحَلَّہُ اللّٰہُ لِمَنِ اضْطُرَّ اِلَیْہِ (۲)

کوئی چیز ایسی نہیں جسے اللہ نے اس شخص کے لئے حلال قرار نہ دیا ہو جو اس پر مجبور ہو جائے۔

۲۔ لوگوں کے درمیان اصلاح

لوگوں کے درمیان اصلاح کی غرض سے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ رسول اللہؐ نے مولا علی کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

یَا عَلِیُّ اِنَّ اللّٰہَ اَحَبَّ الْکِذْبَ فِی الْاِصْلَاحِ وَاَبْغَضَ الصِّدْقَ فِی الْفَسَادِ (۳)

اے علیؑ اللہ کو وہ جھوٹ پسند ہے جو اصلاح کی خاطر بولا جائے اور اس سچائی سے نفرت ہے جو فتنہ انگیزی کی خاطر ہو۔

---

(۱) سورہ نحل / ۱۰۶۔ (۲) شیخ انصاری کی کتاب مکاسب محرمہ۔

(۳) وسائل الشیعہ ج ۸ ص ۵۷۸۔

۲۔ جنگی چال

اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ جنگ دینی اور اجتماعی ضرورت ہے ۔ نظریاتی، سیاسی اور اقتصادی اسباب کی بناء پر ملتوں اور اقوام کے لئے جنگ ناگزیر ہوجاتی ہے ۔ اس ناگزیر مشکل سے رہائی نیز دشمن کو جلد از جلد شکست سے دوچار کرنے کے لئے ایسے وسائل سے کام لیا جاتاہے جو عام حالات میں جائز نہیں ہوتے ۔ اگر جنگ کا مقصد اپنا دفاع یا فتنہ و فساد کی بیخ کنی ہو تو اس صورت میں دوسروں کو قتل کرنا اسیر بنانا اور ان کے اموال کو لوٹنا شرعی اور عقلی نقطہ نظر سے یقیناً جائز ہیں ۔ جنگ میں فتح کا ایک اہم طریقہ دشمن پر اچانک ہلہ بول دینا ہے اس سلسلے میں جنگی چال اور فریب ممد و معاون ثابت ہوسکتاہے۔

امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے :

كُلُّ كِذْبٍ مَسْئُولٌ عَنْهُ يَوْماً اِلّا كِذْباً فِي ثَلٰثَةٍ : رَجُلٌ كَايَدَ فِي حَرْبِهِ فَهُوَ مَوْضُوعٌ عَنْهُ (۱)

ہر جھوٹ کے بارے میں کسی نہ کسی دن بازپرس ہوگی سوائے تین صورتوں کے ۔ ایک صورت یہ ہے کہ آدمی جنگی چال چلے (یعنی جنگی چال کے طور پر جھوٹ کا سہارا لے) ۔ اس صورت میں اس پر جھوٹ کا گناہ نہ ہوگا ۔

امیر المومنینؑ کے نام رسول اللہؐ کی نصیحتوں میں مذکور ہے :

يَا عَلِيُّ ثَلَاثٌ يَحْسُنُ فِيهِنَّ الْكِذْبُ ۔ اَلْمَكِيْدَةُ فِي الْحَرْبِ وَ ...... (۲)

اے علی تین صورتوں میں جھوٹ بولنا پسندیدہ ہے ۔ ایک جنگی چال چلنے کے لئے اور ......

---

(۱) اصول کافی ج/ ۲ ص ۳۴۲ حدیث نمبر ۱۸ ۔

(۲) بحارالانوار مطبوعہ بیروت ج ۷۴، ص ۵۱ ۔

۴۔ بیوی بچوں سے وعدہ

بعض احادیث میں بیوی اور بچوں کے ساتھ جھوٹا وعدہ کرنے کو جائز شمار کیا گیا ہے اگر چہ بعض بزرگ فقہاء نے وعدے کو جھوٹ کے دائرے سے ہی خارج کیا ہے لیکن عرف عام میں جھوٹا وعدہ جھوٹ ہی کی ایک قسم ہے۔

چغلخوری

زبان کی آفتوں میں سے ایک اور آفت جو اخلاقی پستی کا ثبوت ہے اور انسان کو خدا سے دور کرتی ہے چغلخوری اور سخن چینی ہے۔ قرآن مجید اس بارے میں کہتا ہے:

وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ (۱)

ہر طعنہ دینے والے چغل خور کی ھلاکت ہے۔

اللہ تعالی ایک اور مقام پر اپنے رسول سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَا تُطِعۡ کُلَّ ...... ہَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِیۡمٍ (۲)

یعنی اے رسول جو لوگ بہت عیب جوئی اور سخن چینی کرتے ہیں ان کی پیروی نہ کرو۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

عُتُلٍّۭ بَعۡدَ ذٰلِکَ زَنِیۡمٍ (۳)

وہ (چغل خور) کینہ پرور پیٹو، سخت مزاج اور بدنام ہے۔

جناب فیض کاشانی مرحوم نے اپنی کتاب محجۃ البیضاء میں عبداللہ بن مبارک سے نقل کیا ہے کہ: زنیم وہ ہے جو زنا کے ذریعے پیدا ہوا ہو اور ہر بات ہر جگہ پر کہہ دیتا ہو۔ اس کے بعد جناب کاشانی نے کیا ہے کہ عبداللہ بن مبارک نے یہ تفسیر "عتل بعد ذلک زنیم" والی آیت کریمہ سے سمجھی ہے۔

---

(۱) سورہ ہمزہ / نمبر ۱۔ (۲) سورہ قلم / ۱۱۔ (۳) سورہ قلم / ۱۳۔

چغل خوری اور احادیث

احادیث میں چغلخوری کی زبردست مذمت ہوئی ہے۔ چند ایک احادیث کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

الف:۔ چغلخور بدترین انسان ہے

رسول اللہؐ نے فرمایا:

اَلاَ اُنَبِّئُکُمْ بِشِرَارِکُمْ؟ قَالُوا: بَلیٰ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ: اَلْمَشَّاؤُوْنَ بِالنَّمِیْمَۃِ اَلْمُفَرِّقُوْنَ بَیْنَ الْاَحِبَّۃِ، اَلْبَاغُوْنَ لِلْبُرَآءِ الْمَعَائِبَ (۱)

کیا میں تمہارے بدترین افراد کے بارے میں خبر نہ دوں؟ حاضرین نے کہا، کیوں نہیں اے اللہ کے رسول۔ فرمایا (بدترین لوگ وہ ہیں) جو چغلخوری کے پیچھے پھرتے ہیں، دوستوں میں جدائی ڈالتے اور پاک دامن افراد کے عیوب تلاش کرتے ہیں۔

چغلخوری اور عذاب قبر

امام علیؑ نے فرمایا:

عَذَابُ الْقَبْرِ مِنَ النَّمِیْمَۃِ وَ الْغِیْبَۃِ وَ الْکِذْبِ (۲)

یعنی چغل خوری، غیبت اور جھوٹ عذاب قبر کی علت ہیں۔

چغلخور جنت میں نہیں جاتا

رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ نَمَّامٌ (۳)

چغل خور جنت میں نہیں جا سکتا۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۳۶۹۔

(۲) انوار نعمانیہ ص ۳۵۹۔

(۳) محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۷۵۔

حضرت امام باقرؑ کا ارشاد ہے :

اَلْجَنَّۃُ مُحَرَّمَۃٌ عَلَی الْمُغْتَابِیْنَ وَ الْمَشَائِیْنَ بِالنَّمِیمَۃِ [1]

بہشت غیبت کرنے والوں اور چغل خوروں پر حرام ہے۔

چغلخور میدانِ محشر میں

براء بن عاذب سے منقول ہے کہ معاذ بن جبل ابو ایوب انصاری کے گھر میں رسول اللہؐ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ معاذ نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ قرآن کی اس آیت "یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجاً [2] کے بارے میں آپؐ کیا فرماتے ہیں ؟

فرمایا اے معاذ تم نے ایک بڑی بات پوچھی ہے۔ پھر آنحضرتؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور آپؐ نے فرمایا میری امت کے دس گروہ منتشر ہوکر محشور ہوں گے اللہ ان کو دوسرے مسلمانوں سے جدا کرکے ان کے چہروں کو مسخ فرمائے گا۔ ان میں سے کچھ لوگ بندر کی شکل میں، کچھ سور کی شکل میں اور بعض اس حالت میں کہ ان کے پاؤں اوپر اور سر نیچے ہوں گے لائے جائیں گے ان میں سے بعض ایسے اندھے ہوں گے جو ادھر ادھر بھٹک رہے ہوں گے، بعض بہرے اور گونگے ہوں گے جو کسی چیز کو درک نہ کرتے ہوں گے، کچھ اپنی زبانوں کو چبا رہے ہوں گے اور ان کے منہ سے گندگی ٹپک رہی ہوگی جس سے اہل محشر متنفر ہوں گے، کچھ لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں گے، کچھ آگ کی ٹہنیوں سے لٹک رہے ہوں گے، کچھ لوگوں کی بدبو مردار سے بھی بدتر ہوگی، اور کچھ لوگوں کو ایسے خول پہنائے جائیں گے جو پگھلے ہوئے تانبے سے بنے ہوں گے جو ان کے جسموں سے چمٹے ہوئے ہوں گے۔

---

(۱) ایضاً محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۷۶۔

(۲) سورہ نساء / ۱۸۔

اس کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا: بندر کی صورت میں محشور ہونے والے چغلخور ہیں اور سور کی شکل میں محشور ہونے والے وہ ہیں جن کا پیشہ حرام خوری اور رشوت خوری ہو۔ جو لوگ سر کے بل ہوں گے وہ سود کھانے والے ہیں، جو لوگ اندھے ہوکر حاضر ہوں گے وہ ایسے لوگ ہیں جو حکومت اور قضاوت کے دوران ظلم کرتے ہیں بہرے اور گونگے بن کر محشور ہونے والے وہ خودپسند لوگ ہیں جو اپنے کاموں کے شیفتہ اور دلدادہ ہیں اپنی زبان چبانے والے وہ علماء اور قاضی ہیں جن کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ بے دست و پا لوگ وہ ہیں جو اپنے ہمسایوں کو ستاتے ہوں۔ آگ کی ٹہنیوں سے لٹکے ہوئے وہ ہیں جو بادشاہوں کے پاس لوگوں کی جاسوسی اور بدگوئی کرتے ہیں۔ مردار سے بھی زیادہ بدبو والے وہ ہیں جو دنیوی خواہشات اور لذتوں میں غرق رہتے ہیں اور اپنے اموال سے ان حقوق کو ادا نہیں کرتے جنہیں اللہ نے واجب کیا ہے۔ جن لوگوں کو پگھلائے ہوئے تانبے کے لباس پہنائے جائیں گے وہ متکبر اور سرکش لوگ ہوں گے (۱)

چغلخور اللہ کی رحمت سے دور ہے

بہرحال چغلخوری کا گناہ اس قدر سنگین ہے کہ اگر ایک چغلخور بہت سے لوگوں کے درمیان رہتا ہو تو اللہ کی رحمت ان کے شامل حال نہیں ہوگی اس سلسلے میں ایک حدیث ملاحظہ ہو۔

اِنَّ مُوسیٰ اِسْتَسْقیٰ لِبَنِی اِسْرائیلَ حِینَ اَصَابَهُم قَحْط فَاَوْحَی اللهُ تَعَالیٰ اِلَیْهِ لاَ اَسْتَجِیبُ لَکَ وَلاَ لِمَنْ مَعَکَ وَفِیکُمْ نمام قَدْ اَصَرَّ عَلی النَّمِیمة (۲)

یعنی حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کو قحط کا سامنا ہوا حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے لئے بارش کی دعا فرمائی پس اللہ تعالی کی طرف سے

---

(۱) تفسیر مجمع البیان ج ۱۰ ص ۴۲۳۔

(۲) وسائل الشیعہ ج ۹ ص ۴۱۹۔

موسیٰ پر وحی ہوئی کہ میں تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی دعا قبول نہیں کروں گا کیونکہ تمہارے درمیان ایک چغلخور ہے جو بہت چغلخوری کرتا ہے۔

چغلخوری کے اسباب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس گناہ کے اسباب و عوامل کیا ہیں ؟ اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چغلخوری کے کئی ایک اسباب ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں :

۱۔ بدگمانی اور بد بینی :

جب کوئی آدمی کسی سے بدگمان ہوتا ہے اور اس کو بدنام کرنے کے درپے ہوتا ہے تو اس کے خلاف بدگوئی شروع کرتا ہے۔

۲۔ حکام کا تقرب حاصل کرنے کی خواہش:

کچھ لوگ سرکاری حکام کے سامنے لوگوں کی بدگوئی اور چغلخوری کے ذریعے ان حکام کو خوش کرنے اور ان سے دوستی قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ تفریح اور دل لگی :

بعض لوگ دل لگی کی خاطر اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

۴۔ کچھ لوگ فضول محفل گرم کرنے اور لوگوں کے ساتھ فضول وقت گزارنے کے لئے چغلخوری کے مرتکب ہوتے ہیں۔

۵۔ لوگوں کے درمیان افتراق یا ان کے اذہان میں تشویق و اضطراب پیدا کرنے کی خاطر بھی بدگوئی اور چغلخوری سے کام لیا جاتا ہے۔

تضحیک و استہزاء :

حرام کاموں میں سے ایک (جو غیبت کے عوامل میں سے بھی ایک ہے) مذاق اڑانا اور استہزاء ہے اگر چہ یہ عامل بذات خود دیگر عوامل و اسباب کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے اور بجائے خود قابل غور ہے ۔ لیکن یہاں ہماری بحث غیبت کے قریبی اور بلاواسطہ اسباب

سے ہے۔ اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ تضحیک و استہزاء کا تعلق ان عوامل سے ہے جو اکثر اوقات ضعیف الایمان لوگوں کو غیبت پر آمادہ کرتے ہیں۔

جی ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو محفل جمانے اور حاضرین کو ہنسانے کی خاطر دوسروں کی عزت و آبرو سے کھیلتے ہیں۔اور مختلف کاموں سے مثلاً چلنے، بات کرنے اور کھانا کھانے وغیرہ کی نقل اتارکر خلاصہ یہ کہ ہر طرح کے اشاروں کنایوں وغیرہ سے دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں۔

قرآن کریم اس کام سے شدید منع کرتاہے، اسے ظلم و ستم قرار دے کر اس کی مذمت کرتاہے اور توبہ کا حکم دیتے ہوئے کہتاہے:

يَا يُّهَا الذَّ يْنَ آمَنُـوا لاَ يَسْخَرْ قَوم مِنْ قَوْ م عَسىٰ اَ ن يَكُونُوا خَيْـراً مِنْهُـمْ وَ لاَ نِساء مِن نِسآءٍ عَسىٰ اَ نْ يَكُنَّ خَيْـراً مِنْهُنَّ وَ لاَ تَلْمِـزُوا اَ نْفُسَكُـمْ وَ لاَ تَنابَزُوا بِالاَ لْقَاب بِئْسَ اِلاَّ سم الْفُسُوقُ بَعْدَ الايمـانِ وَ مَـنْ لَـمْ يَتُـب فَاوْلٰئكَ هـمُ الظّالمـونَ (۱)

اے ایمان دارو تم میں سے کسی قوم کا کوئی مرد دوسری قوم کے مردوں کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے کہ وہ لوگ خدا کے نزدیک ان سے اچھے ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں کیا عجب ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور تم آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو نہ ایک دوسرے کو برے ناموں سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد بدکاری (کا) نام ہی برا ہے۔ اور جو لوگ باز نہ آئیں تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

---

(۱) سورہ حجرات / ۱۱۔

اللہ کے ہاں مومن کا مقام

اللہ کے ہاں بندہ مومن بہت ہی عزت و احترام کا حامل ہے، اللہ مومنوں کو چاہتا ہے اور صرف مومنین کو ہی عزت و سربلندی کا مستحق گردانتا ہے۔

چنانچہ اس بارے میں یوں فرماتا ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ (۱)

عزت و احترام خدا، خدا کے رسول اور مومنین کا حصہ ہے۔

اسی لئے سورہ حجرات کی آیت "لَا يَسْخَرْ قَوم مِنْ قَوْمٍ" میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو کوئی مومنوں کا مذاق اڑائے یا ان کو برے القاب سے یاد کرے اس کا شمار ظالموں میں ہوگا۔

مومن کا احترام خدا کا احترام ہے

احادیث میں مذکور ہے کہ مومن کا احترام خدا کا احترام کرنے کے مترادف ہے نیز مومن کی تحقیر و اہانت خدا کی اہانت اور غضب الٰہی کا باعث ہے۔

حدیث قدسی میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ مومنین کو ستاتے ہیں اللہ ان کے ساتھ اعلان جنگ فرماتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے:

قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِيَاذَنْ بِحَرْبٍ مِنِّي مَنْ اَذَلَّ عَبْدِيَ الْمُؤْمِنَ وَلِيَاْمَنْ مِنْ غَضَبِي مَنْ اَكْرَمَ عبدى المؤمن (۲)

یعنی خداوند عزوجل کا فرمان ہے کہ جو کوئی میرے مومن بندے کو ذلیل سمجھے وہ جان لے کہ وہ میرے ساتھ حالت جنگ میں ہے اور جو کوئی میرے مومن بندے کا احترام کرے بے شک اسے میرے غضب سے امان حاصل ہے۔

---

(۱) سورہ منافقون / ۸۔

(۲) ثواب الاعمال و عقاب الاعمال مولفہ شیخ صدوق ص ۲۸۴۔

مومن کا احترام کعبے کے احترام سے بھی زیادہ ہے

نہج البلاغہ کے اس جملے "اِذَا اسْتَوْلَی الصَّلَاحُ عَلَی الزَّمَانِ وَ اَهْلِه ..." کی تشریح کرتے ہوئے ابن ابی الحدید رسول اللہؐ کی ایک حدیث یوں نقل کرتے ہیں:

وَ الْخَبَرُ مَا رَوَاهُ جَابِرٌ قَالَ: نَظَرَ رَسُولُ اللهِ اِلَی الْكَعْبَةِ فَقَالَ مَرْحَباً بِکَ مِنْ بَيْتٍ مَا اَعْظَمَکَ وَ اَعْظَمَ حُرْمَتَکَ وَ اللهِ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اَعْظَمُ حُرْمَةً مِنْکَ عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ لِاَنَّ اللهَ حَرَّمَ مِنْکَ وَاحِدَةً وَ مِنَ الْمُؤْمِنِ ثَلَاثَةً دَمَهُ وَ مَالَهُ وَ اَنْ يُظَنَّ بِهِ ظَنَّ السَّوْءِ (۱)

یہ حدیث جابر سے منقول ہے۔ جابر کہتا ہے، رسول اللہؐ نے کعبے کی طرف نظر فرمائی اور کہا تیرے کیا کہنے۔ تو کس قدر عظیم گھر ہے اور تیری حرمت کس قدر عظیم ہے۔ اللہ کی قسم اللہ کے نزدیک مومن کا احترام تیرے احترام سے بڑھکر ہے کیونکہ اللہ نے تیرا احترام ایک زاویے سے لازم قرار دیا ہے (یعنی کعبے کے اندر خونریزی حرام ہے)۔ لیکن مومن کے احترام کو تین لحاظ سے لازم قرار دیا ہے۔

۱۔ اس کا خون محترم ہے۔

۲۔ اس کا مال محترم ہے۔

۳۔ اس کے بارے میں بدگمانی حرام ہے۔

تمسخر اور استہزاء کا برا انجام

اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ جو شخص لوگوں کی اہانت کرے اور ان کا مذاق اڑائے وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اسے اس گناہ کے برے نتائج سے روبرو ہونے کے لئے تیار رہنا ہوگا کیونکہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی رد عمل ضرور ہوتا ہے۔

---

(۱) شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی ج ۱۸ ص ۲۷۸۔

ارشاد قرآنی ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَه وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَه [1]

پس جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے وہ (اس دن) اسے پائے گا اور جو کوئی ذرہ برابر برائی کر چکا ہو اسے بھی پائے گا۔

فضول گوئی اور تمسخر کے برے آثار و نتائج میں سے بعض غفلت یا بے حسی، قساوت قلبی اور احساس ذمہ داری کا فقدان وغیرہ ہیں۔ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ طبعی طور پر ذکر خدا سے غافل اور عبادت خداوندی کی لذت سے محروم ہوجاتے ہیں یعنی وہ عبادت کے دوران اللہ کی طرف دلی توجہ نہیں کر پاتے اور بے رغبتی کے ساتھ عبادت کرتے ہیں۔ قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ کی یاد سے غفلت اور خدا کو فراموش کرنے کی وجوہات میں سے ایک مومنوں کی تحقیر اور ان کا مذاق اڑانا ہے کیونکہ اللہ کے مومن بندے دین کے آئینہ دار اور شریعت سید المرسلین کی قابل فخر ہستیاں ہیں۔ ان کے مقام و مرتبے سے بے اعتنائی، توفیق کے سلب ہونے اور دل کو تاریک بنانے کا باعث بنتی ہے جس کے نتیجے میں انسان گمراہ اور دوزخیوں کا ساتھی اور ہمنشین بن جاتا ہے۔

اللہ تعالی اپنی کتاب میں اہل جہنم کی بدحالی اور ان سے پوچھ گچھ کی کیفیت کو بیان فرماتا ہے نیز جہنم سے خارج ہونے اور دوزخ کے دردناک اور جلا دینے والے عذاب سے نجات پانے کے لئے ان کے جزع و فزع کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے انہیں یہ جواب دیتا ہے:

اِخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ [2]

اے کتو دور ہو جاؤ اور مجھ سے بات نہ کرو۔

---

(۱) سورہ زلزال / ۷-۸۔
(۲) سورہ مومنون / ۱۰۸۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِنْ عِبَادِي يَقُولُونَ آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا حَتَّىٰ أَنْسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ (۱)

میرے بندوں کی ایک جماعت کہتی تھی اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں پس تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما کہ تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔ تب تم لوگوں نے ان کا تمسخر اڑایا یہاں تک کہ تم لوگ میرے ذکر کو بھول بیٹھے اور تمہارا کام بس یہی تھا کہ ان (مومنوں) کا مذاق اڑایا کرتے تھے (لیکن) آج میں ان کے صبر کے باعث انہیں یہ جزا عطا کرتا ہوں کہ کامیابی حاصل کرنے والے وہی ہیں۔

کل مومنوں کی باری ہوگی

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے کہ جو لوگ دنیا میں با ایمان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں تمسخر آمیز اور تحقیر آمیز ہنسی کے ساتھ ان کے پاس سے گزرتے ہیں، اشاروں کنایوں سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں نیز اپنے اس قبیح عمل پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فخر و مباہات کرتے ہیں اور ـــ وہ جان لیں کہ کل (بروز قیامت) مومنوں کی باری ہوگی اور مومنین ان کا مذاق اڑائیں گے۔

---

(۱) سورہ مومنون / ۱۰۹ - ۱۱۱ -

آیات کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوا کَانُوا مِنَ الَّذِیْنَ آمَنُوا یَضْحَکُونَ (۱)

بہ تحقیق مجرم لوگ (دنیا میں) مومنین پر ہنسا کرتے تھے۔

وَ اِذَا مَرُّوا بِہِم یَتَغَامَزُوْنَ (۲)

اور جب وہ مومنوں کے پاس سے گزرتے تو ان پر آنکھ کے اشارے سے مذاق اڑاتے تھے۔

فَالیَومَ الَّذِیْنَ آمَنُوا مِنَ الکُفَّارِ یَضْحَکُونَ (۳)

لیکن آج (قیامت کے دن) مومنین کفار پر ہنسیں گے۔

عَلَی الْاَرَائِکِ یَنْظُرُوْنَ (۴)

تختوں پر بیٹھے نظارہ کریں گے۔

اس کے بعد بطور تمسخر کہا جائے گا۔

هَلْ ثُوِّبَ الکُفَّارُ مَا کَانُوا یَفْعَلُونَ؟ (۵)

کیا کافروں کو ان کے برے اعمال کا صلہ ملا؟

تمسخر و استہزاء احادیث کی روشنی میں

اس بات میں شک نہیں کہ لوگوں کا مذاق اڑانے والے قیامت کے دن قسم قسم کے عذاب اور اذیتوں میں مبتلا ہوں گے اور جس طرح وہ دنیا میں مومنوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے قیامت کے دن ایمان والے ان کا مذاق اڑائیں گے۔

---

(۱) سورہ مطففین / ۳۰۔

(۲) سورۂ مطففین / ۳۱۔

(۳) ایضاً / ۳۴۔

(۴) ایضاً / ۳۵۔

(۵) ایضاً / ۳۶۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

انَّ المُستَہزِئینَ بِالنّاسِ یُفتَحُ لِاحدِهِمْ بَاب مِن الجَنَّۃِ فَیُقالُ هَلُمَّ هَلُمَّ فَیَجِیُ بِکَربِہٖ وَ غَمِّہٖ فَاذا اتَاہُ اغلِقَ دُونَہ ثُمَّ یُفتَحُ لَہ بَاب آخَرُ فَیُقَالُ هَلُمَّ هَلُمَّ فَیَجِیُ بِکَربِہٖ وَ غَمِّہٖ فَاذا اتاہُ اغلِقَ دونَہ فَمَا یَزالُ کَذالِکَ حَتّیٰ انَّ الرجُلَ لَیُفتَحُ لَہ باب فَیُقالُ لَہ هَلُمَّ هَلُمَّ فَلاَ یاتِیہِ (۱)

بہ تحقیق (دنیا میں) لوگوں کا مذاق اڑانے والوں کا (قیامت میں) یہ حال ہوگا کہ ان میں سے کسی کے لئے جنت کا ایک دروازہ کھولا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا آجاؤ آجاؤ۔ پس وہ اپنے کرب و غم کے ساتھ آگے آئے گا۔ جب وہ دروازے کے پاس پہنچے گا تو دروازہ بند کیا جائے گا۔ پھر اس کے لئے ایک اور دروازہ کھولا جائے گا اور کہا جائے گا، آجاؤ آجاؤ!۔ پس وہ اپنے کرب و غم کے ساتھ آگے بڑھے گا۔ جب وہ دروازے کے پاس پہنچے تو دروازہ بند کردیا جائے گا اور یہ سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ اس شخص کے لئے ایک دروازہ کھولا جائے گا اور (اس سے) کہا جائے گا آجاؤ! آجاؤ! لیکن وہ (مایوس ہوکر) اس کی طرف نہیں بڑھے گا۔

اس منظر کو دیکھ کر مومنین (جو بہشت میں ساکن ہوں گے) ان پر ہنسیں گے۔

نتیجہ کلام

مذکورہ باتوں کے پیش نظر مومن اور احساس ذمہ داری کے حامل افراد کو چاہیئے کہ وہ اس قبیح اور غیر پسندیدہ کام سے دو وجوہات کی بناء پر اجتناب کریں پہلی وجہ یہ کہ دوسروں کا استہزاء اور مذاق اڑانا ذاتی طور پر برا اور قبیح عمل ہے جو ایمان اور تقوی کے منافی ہے دوسری وجہ یہ کہ یہ عمل ایک اور کبیرہ گناہ (یعنی غیبت) کا باعث بنتا ہے۔ پالنے والے تو گناہوں اور لغزشوں سے ہمیں محفوظ رکھ۔

---

(۱) احیاء العلوم غزالی ج ۳ ص ۱۳۱، معراج السعادہ ص ۴۰۲ اور جامع السعادات مطبوعہ بیروت ج ۲ ص ۲۸۸۔

حسد

محرمات الہیہ میں سے ایک (جو غیبت کے اسباب و عوامل میں بھی شامل) حسد ہے۔
حاسد اپنے حسد کے باعث ہمیشہ دوسروں کی عیب جوئی اور تحقیر کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اس طریقے سے اپنے جذبہ خودپسندی کو تسکین دیتا ہے۔
جو شخص حسد کی بناء پر غیبت کرتا ہے وہ تین مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

۱۔ حسد کے باعث روحانی اور ذھنی کرب میں مبتلا رہتا ہے۔

۲۔ ایک عذاب خود حسد کی وجہ سے ہوگا۔

۳۔ غیبت کے عذاب کا بھی شکار ہوگا۔

حسد کی تعریف

راغب اصفہانی کہتا ہے:

اَلحَسَدُ تَمَنّی زَوالِ نِعْمَةٍ مِنْ مُسْتَحِقٍّ لَهَا وَ رُبَمَا كَانَ مَعَ ذَالِکَ سَعی فِیْ زَوَالِهَا وَ رُوِیَ: المُؤمِنُ یَغْبِطُ وَ المُنَافِقُ یَحْسُدُ (۱)

حسد مستحق شخص سے نعمت کے زوال کی تمنا کا نام ہے بسا اوقات حسد کرنے والا قلبی تمنا کے علاوہ اس نعمت کے زوال کوشش بھی کرتا ہے۔ روایت ہے کہ مؤمن رشک کرتا ہے اور منافق حسد برتتا ہے۔

غبطہ (رشک) یہ ہے کہ کسی شخص کو حاصل نعمت کے زوال کی تمنا کئے بغیر اسی قسم کی نعمت کی تمنا اپنے لئے بھی کرے۔

---

(۱) مفردات راغب مادہ حسد۔

حسد قرآن کی رو سے

أَمْ يحسدون النَّاسَ عَلىٰ مَا آتاهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنا آلَ ابْراهيمَ الْكِتَابَ وَ الحِكْمَةَ وَ آتَيْنَاهُمْ مُلْكاً عَظِيماً (۱)

لوگوں (پیغمبر اکرم یا خاندان رسالت یا مسلمانوں) کو اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ دیا ہے کیا اس پر وہ (یہودی) حسد کرتے ہیں ؟ بہ تحقیق ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا کی ہے اور ان کو عظیم سلطنت دی ہے۔

قرآن کی رو سے حسد کی مذمت میں یہی کافی ہے کہ اللہ فرماتا ہے:

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ (۲)

یعنی اے ہمارے رسول کہیئے ، میں اللہ کی پناہ مانگتاہوں حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔

حسد روایات کی روشنی میں

معصومین علیہم السلام سے مروی احادیث میں حسد کی بعض خاصیتوں کا تذکرہ ہوا ہے جن میں سے بعض کو ہم بطور نمونہ ذکر کریں گے۔

حسد کفر کی جڑ ہے

امام صادقؑ کا ارشاد ہے:

أُصُولُ الْكُفْرِ ثَلَاثَةٌ الْحِرْصُ وَ الاِسْتِكْبَارُ وَ الْحَسَدُ (۳)

کفر کی تین جڑیں ہیں:- حرص ، تکبر اور حسد۔

---

(۱) سورہ ء نساء / ۵۴ ۔

(۲) سورۂ فلق / ۵ ۔

(۳) اصول کافی ج ۲ ص ۲۸۹ ۔

علامہ مجلسی فرماتے ہیں:

وَ كَانَ الْمُرَادَ بِاُصُولِ الْكُفْرِ مَا يَصِيرُ سَبَباً لِلْكُفْرِ اَحْيَاناً لاَ دَائِماً وَلِلْكُفْرِ اَيْضاً مَعَانٍ كَثِيرَةٌ (۱)

یعنی کفر کی جڑوں سے مراد وہ گناہ ہیں جو گاہے کفر کا باعث بنتے ہیں ہمیشہ نہیں۔ پھر کفر کے بھی بہت سے معانی اور مراتب ہیں اور ممکن ہے کہ یہاں کفر سے مراد اس کے کچھ خاص درجات ہوں۔

اس کے بعد حسد کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَ اَمَّا الْحَسَدُ فَابْنَا آدَمَ حَيْثُ قَتَلَ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ (۲)

رہا حسد تو اس کا مشاہدہ آدم کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) کے واقعہ میں ہوتا ہے جب کہ ان دونوں میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔

حسد کا سرچشمہ

امام صادقؑ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:

اَلْحَسَدُ اَصْلُهُ مِنْ عَمَى الْقَلْبِ وَ الْجُحُودُ لِفَضْلِ اللّٰهِ تَعَالَىٰ وَ هُمَا جَنَاحَانِ لِلْكُفْرِ ـ وَ بِالْحَسَدِ وَقَعَ ابْنُ آدَمَ حَسْرَةَ الْاَبَدِ وَ هَلَكَ مَهْلِكاً لاَ يَنْجُوا مِنْهُ اَبَداً (۳)

حسد کا سرچشمہ دل کی تاریکی اور اللہ کی نعمتوں کا انکار ہے یہ دونوں (تاریکی قلب اور خدا پر اعتراض کہ اس نے دوسروں کو اپنی نعمتوں سے کیوں نوازا؟) کفر کے دو پر ہیں۔ حسد ہی اولاد آدم کی ابدی حسرت کا باعث ہے اور حسد ہی انسان کے لئے اس ہلاکت کی علت ہے جس سے وہ ہرگز نجات حاصل نہ کر سکے گا۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۲۸۹۔ مرات العقول ج ۱۰ ص ۴۷۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۲۸۹۔

(۳) مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۳۲۷ باب ۵۵۔

حسد ایمان کو کھاجاتاہے

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

اِنَّ الحَسَدَ یَاْکُلُ الْاِیمَانَ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الحَطَبَ (۱)

یعنی حسد ایمان کو اسی طرح کھاجاتاہے جس طرح آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے۔

حاسد سے اللہ ناراض ہوتاہے

جو دوسرے سے حسد کرتاہے اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوتاہے اور اللہ سے اس کا رابطہ منقطع ہوجاتاہے۔

چنانچہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وجَلَّ لِمُوسَی بْنَ عِمرَ انَ یابن عمران لَا تَحْسُدَنَّ النَّاسَ عَلَی مَا آتَیْتُهُمْ مِنْ فَضْلِي وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلَی ذٰلِکَ وَ لَا تُتْبِعْهُ نَفْسَکَ فَاِنَّ الحَاسِدَ سَاخِطٌ لِنِعَمِي صَادٌّ لِقَسْمِيَ الَّذِی قَسَمْتُ بَیْنَ عِبَادِیْ وَ مَنْ یَکُ کَذَالِکَ فَلَسْتُ مِنْهُ وَ لَیْسَ مِنِّی (۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ بن عمران (ع) سے فرمایا اے عمران کے فرزند! میں نے اپنے فضل سے لوگوں کو جو کچھ دیا ہے اس پر حسد نہ کر، نہ اس حال پر نظر رکھو اور نہ اس کی خواہش کرو کیونکہ حسد کرنے والا میری نعمتوں سے ناخوش ہے اور میں نے اپنے بندوں کو جو کچھ دیا ہے وہ ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالتاہے جس بندے کی یہ حالت ہو تو نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے نہ اس کا مجھ سے کوئی واسطہ ہے۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۳۰۶۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۳۰۷۔

حسد دین کے لئے آفت ہے

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

آفَۃُ الدینِ الحَسَدُ وَ العُجبُ وَ الفَخر (۱)

حسد اپنے اوپر اترانا اور فخر و خود نمائی دین کے لئے باعث مصیبت ہیں۔

حسد کے جسمانی نقصانات

حسد نہ صرف یہ کہ معنوی اور روحانی نقصانات کا حامل ہے اور دین و ایمان کو تباہ کرتا ہے بلکہ جسمانی نقطہ نظر سے بھی انسان کے اعصاب پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔

امیر المومنین علیؑ کا ارشاد ہے:

صِحّۃُ الجَسَدِ مِنْ قِلَّۃِ الحَسَدِ (۲)

یعنی حسد کی کمی جسمانی صحت کا باعث ہے۔

علامہ شیخ محمد تقی شوشتری امیر المومنین علیہ السلام کے مذکورہ جملے کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "چھ قسم کے لوگ بے چین رہتے ہیں جن میں سے ایک حاسد ہے۔ اس کے بعد اصمعی سے یوں نقل کرتے ہیں: میں نے ایک بادیہ نشین عرب کو دیکھا جو زندگی کی ایک سو بیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ پوچھا کیا وجہ ہے کہ تو نے اس قدر لمبی عمر پائی ہے۔ وہ بولا اس کی وجہ بس یہی ہے کہ میں نے (کسی سے) حسد نہیں کیا۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۳۰۷۔

(۲) نہج البلاغہ فیض الاسلام حکمت ص ۲۴۸۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے:

اَلْحَسَدُ دَآءٌ عَیَاءٌ لَا یَزُولُ اِلَّا بِھَلکِ الحَاسِدِ اَوْ بِمَوتِ المَحْسُود [1]

یعنی حسد ایک ایسی مہلک بیماری ہے جو حاسد کی ہلاکت یا محسود کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو سکتی ہے۔

بہر حال حسد ایک خطرناک روحانی بیماری ہے جس کے اسباب و علل پر تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ ان اسباب کی پہچان کے بعد انسان اس مہلک بیماری سے اپنے آپ کو نجات دلانے کے لئے کوئی راستہ تلاش کرے۔

اس مقام پر ہم صرف ایک نکتے کے ذکر پر اکتفا کریں گے اور وہ یہ کہ نفسیاتی مشکلات اور زندگی کی محرومیوں کے ساتھ سستی و کسالت کی آمیزش حسد کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ پس آپ جہد مسلسل کے ذریعے اپنی محرومیوں کا ازالہ کرنے اور نفسیاتی و قلبی گرہوں کو کھولنے کی کوشش کریں اور یہ جان لیں کہ زندگی میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے جو سعی و کوشش کو اپنا شیوہ قرار دے مگر یہ کہ بیرونی موانع آڑے آئیں تو ظاہر ہے ان موانع کا علاج حسد کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔

غصّہ

غصہ بھی حرام ہے اور سالک راہ خدا کو چاہیئے کہ اس سے اجتناب کرے۔ غصہ انسان کو دوسرے گناہوں مثلاً غیبت، تہمت گالی گلوچ وغیرہ وغیرہ میں بھی مبتلا کردیتا ہے۔

جب انسان کسی سے ناراض اور غضبناک ہوتا ہے تو وہ کینہ و عداوت اور غیظ و غضب کی آگ کو بجھانے کی خاطر غیبت کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اپنے دشمن کی حیثیت اور آبرو کا خاتمہ کرکے سکون حاصل کرے گا لیکن وہ اس نکتے سے غافل ہے کہ

---

(۱) مصادر نہج البلاغہ و رسانیدہ ج ۴ ص ۱۹۹ تا ۲۰۰۔

اس طرح کے مواقع پر غصہ انسان کو کس قسم کے نقصانات اور خطرات سے دوچار کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ گاہے غصے کے نتیجے میں انسان دین و دنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ غصے کے منفی نتائج کے بارے میں یہاں ہم چند احادیث نقل کرتے ہیں۔

غصّے کے برے نتائج

امیر المومنین علیؑ کا ارشاد ہے:

اَلْغَضَبُ یُرْدِی صَاحِبَہُ وَ یُبْدِیْ مَعَایِبَہُ [1]

غصہ غصہ کرنے والے کو ہلاک اور اس کے عیوب کو طشت از بام کر دیتا ہے۔

حضرت امام محمد باقرؑ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ ھٰذَا الْغَضَبَ جَمْرَۃٌ مِنَ الشَّیْطَانِ تُوْقَدُ فِیْ قَلْبِ ابْنِ آدَمَ وَ اِنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا غَضِبَ اِحْمَرَّتْ عَیْنَاہُ وَ انْتَفَخَتْ اَوْدَاجُہٗ وَ دَخَلَ الشَّیْطَانُ فِیْہِ فَاِذَا خَافَ اَحَدُکُمْ ذٰلِکَ مِنْ نَفْسِہٖ فَلْیَلْزَمِ الْاَرْضَ فَاِنَّ رِجْزَ الشَّیْطَانِ لَیَذْھَبُ عَنْہُ عِنْدَ ذٰلِکَ [2]

غصہ آتش شیطانی کا ایک انگارہ ہے جو بنی آدم کے دل میں سلگایا جاتا ہے۔ جب تم میں سے کسی کو غصّہ آئے تو اس کی آنکھیں سرخ اور گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اس دوران شیطان اس کے اندر داخل ہو جاتا ہے (اور اس کے اوپر تسلط حاصل کر لیتا ہے) پس جب تم میں سے کسی کو اپنے بارے میں اس بات کا خطرہ محسوس ہو تو وہ زمین پر بیٹھ جائے کیونکہ اس صورت میں شیطانی وسوسہ اس سے دور ہو جائے گا۔

---

(۱) فہرست موضوعی غرر الحکم ص ۲۹۲۔

(۲) جامع السعادات ج ۱ ص ۲۸۸۔

ہر برائی کی چابی

امام ہشتم علی بن موسی الرضاؑ نے فرمایا:

الْغَضَبُ مِفْتَاحُ كُلِّ شَرٍّ (۱)

غصّہ تمام برائیوں کی چابی ہے۔

غصہ نہ کرو:

چونکہ غصہ ہر برے کام کی چابی ہے لہذا اگر کوئی اپنے جذبات کو قابو میں رکھے اور غصے سے بچا رہے تو وہ ہر قسم کے نقصانات اور فتنوں سے محفوظ رہے گا جیساکہ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول مجھے کچھ سکھائیے: فرمایا جاؤ غصّہ مت کیا کرو۔ اس شخص نے عرض کیا: یہی نصیحت میرے لئے کافی ہے۔ جب وہ اپنے قبیلے کے ہاں گیا تو ان کے درمیان جنگ ہونے کو تھی وہ ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو چکے تھےاور جنگی لباس پہنے نبرد آزمائی کے لئے آمادہ تھے۔ یہ شخص بھی جنگی لباس زیب تنی کر کے جنگجوؤں کی صف میں شامل ہوگیا۔ اتنے میں اسے اچانک رسول اللہؐ کا ارشاد یاد آیا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ پس اس نے اسلحہ اتار لیا اور وہ ان لوگوں کے پاس چلا گیا جو اس کے قبیلے کے دشمن تھے اور کہنے لگا اے لوگو اگر کسی کو مارنے، زخمی کرنے یا قتل کرنے کے باعث آپ لوگوں کا کوئی حق میری قوم کی گردن پر ہو تو میں اسے اپنے ذمے لیتاہوں اور خون بہا ادا کرتاہوں۔ یہ سن کر انہوں نے کہا (جب تم نے اچھائی کا مظاہرہ کیا) تو ہم بھی تم سے کچھ نہیں مانگتے کیونکہ ہم عفو و درگذر سے کام لینے کے زیادہ سزاوار ہیں یوں ان کے درمیان صلح ہوگئی (۲)

---

(۱) مشکواۃ الانوار ص ۳۰۷۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۳۰۴۔

مختصر یہ کہ اگر انسان کسی سے ناراض ہو تو اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اس کی غیبت نہیں کرنی چاہیئے اور اس پر ناروا تہمت نہیں لگانی چاہیئے۔ کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ جس انسان کا ایمان کامل نہ ہو وہ غصے میں آکر ایسے گناہوں کا ارتکاب کرے جن کی تلافی ممکن نہ ہو۔

امام باقر علیہ السلام نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ:

اَیُّ شَیٍ اَشَدُّ مِنَ الغضب اِنّ الرَّجُلَ لَیَغْضِبُ فَیَقْتُلُ النَّفْسَ اَلّتی حَرَّمَ اللهُ وَ یَقْذِفُ الْمُحْصِنَةَ (۱)

کونسی چیز غصے سے زیادہ سخت (اور بدتر) ہے؟ بہ تحقیق انسان غصے میں آکر ایسے انسان کو قتل کردیتاہے جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور پاکدامن عورت پر بدکاری کا الزام لگاتاہے۔

غصے کو پی جانا بہترین راہ علاج ہے

امیرالمومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

اَلغَضَبُ نَارٌمُوقَدةٌ مَنْ کَظَمَه اطْفَاها وَ مَنْ اطلَقَهُ کانَ اولَ مُحْتَرِقٍ بِها (۲)

غصہ ایک بھڑکتی آگ ہے۔ جو اپنا غصہ پی جائے اس نے وہ آگ بجھالی اور جس نے غصے کو بے لگام چھوڑ دیا وہ سب سے پہلے خود اس کے شعلوں کی نذر ہوگیا۔

---

(۱) جامع السعادات ج ۱ ص ۲۸۸۔

(۲) مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۳۲۶۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

مَـنْ كَظَـمَ غَيْظـاً وَ هُوَ يَقْـدِرُ عَلىٰ اِمْضَائِهِ حَشَا اللهُ قَلْبَـهُ اَمْنـاً وَ ايماناً يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۱)

جو کوئی اپنے غصے کو عملی جامہ پہنانے پر قادر ہونے کے باوجود اس کو پی جائے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے دل کو سکون اور ایمان سے مالامال کر دے گا۔

غصے کا انجام

غصے کا سرانجام جہنم ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

انَّ لِجَهَنَّـمَ بَـابـاً لاَ يَـدْخُـلُ مِنْـهُ اِلاَّ مَـنْ شَفـىٰ غَيْظَـهُ بِمَعْصِيَـةِ اللهِ تَعَالـىٰ (۲)

جہنم کا ایک دروازہ ایسا ہے جس سے صرف وہی لوگ داخل ہوں گے جو اللہ کی نافرمانی کے ذریعے اپنے غصے کو تسکین دیتے ہیں۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۱۱۰۔

(۲) غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۱۴۹۔

نوان نکته

توبه و استغفار

نواں نقطۂ آغاز توبہ و استغفار ہے۔ جب انسان غفلت و نادانی یا نفسانی خواہشات سے مغلوب ہوکر گناہ کا مرتکب ہوجائے تو اسے فوراً توبہ و استغفار کے ذریعے اپنے باطن کو پاک کرنا چاہیئے۔ توبہ کرنے میں سستی اور لیت و لعل سے کام لینا بجائے خود ایک مزید گناہ اور سرکشی ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کی قبولیت درج ذیل دو باتوں کے ساتھ مشروط ہے:

(۱) یہ کہ گناہ کا ارتکاب جہل و نادانی کی بناء پر ہوا ہو نہ کہ جذبہ سرکشی، نافرمانی اور کفر کی بناء پر۔

(۲) یہ کہ ارتکاب گناہ کے بعد انسان فوری طور پر نادم ہو جائے اور جلد سے جلد توبہ کرے

اس سلسلے میں ارشاد خداوندی ہے:

انّما التَّوبَۃَ عَلَی اللہِ لِلَّذیْنَ یَعْمَلونَ السُّوٓءَ بِجَہَالَۃ ثُمَّ یَتُوبُونَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاولٰئکَ یَتُوبُ اللہُ عَلَیْہِم وکَانَ اللہُ علیماً حَکیْماً وَ لَیْسَت التَّوبَۃَ لِلّذیْنَ یَعْمَلونَ السَّیِّئاتِ حَتّٰی اذا حَضَر احدھُمْ الْمَوْتَ قَالَ اِنِّی تُبتُ الانَ وَ لاَ الَّذین یَمُوتونَ وھُمْ کفّار اولٰئک اعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَاباً الیماً (۱)

---

(۱) سورہ نساء / ۱۷۔ ۱۸۔

صرف انہی لوگوں کی توبہ اللہ کے ہاں مقبول ہے جو نادانی کی بناء پر برا کام کر بیٹھیں اور پھر جلدی سے توبہ کرلیں پس اللہ ان لوگوں کی توبہ قبول فرماتاہے اور خداتو بڑا ہی جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اور توبہ ان لوگوں کے لئے مفید نہیں ہے جو (عمر بھر) برے کام کرتے رہتے ہیں پھر جب ان میں سے کسی کے سر پر موت آکھڑی ہو تو وہ کہتاہے اب میں توبہ کرتاہوں۔ اسی طرح ان لوگوں کے لئے بھی (توبہ مفید) نہیں جو کفر کی حالت میں مرجاتےہیں ایسے ہی لوگوں کے واسطے ہم نے دردناک عذاب مہیّا کر رکھا ہے۔

توبہ نہ کرنے اور گناہ پر اصرار کا انجام

جو لوگ گناہ سے پشیمان نہیں ہوتے اور توبہ کرنے کے معاملے میں آج کل کرتے رہتے ہیں وہ برے انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا ہے:

كَانَ أَبِي يقول: مَا مِنْ شَيْءٍ أَفْسَدَ لِلْقَلْبِ مِنْ خَطِيئَةٍ۔ انَّ الْقَلْبَ لَيُوَاقِعُ الْخَطِيئَةَ فَمَا تَزَالُ بِهِ حَتَّى تَغْلِبَ عَلَيْهِ فَيَصِيْرُ اعلاهُ اَسْفَلَهُ (۱)

میرے والد امام باقرؑ فرمایا کرتے تھے دل کے واسطے کوئی چیز گناہ سے زیادہ نقصان دہ نہیں ہے۔ بہ تحقیق دل گناہ کے ساتھ گھل مل جاتاہےاور گناہ پر اصرار کرتا رہتاہے یہاں تک کہ گناہ دل پر غالب آجاتاہے اور آخر کار اسے سرنگوں کردیتاہے۔

یعنی وہ دل جس کا رخ فطری اور ابتدائی طور پر خدا کی طرف ہوتاہے گناہ کی وجہ سے اپنا راستہ اور اپنی شکل و صورت بدل دیتاہے اور مادیت کا شکار ہوجاتاہے جس کے نتیجے میں حق بات یا وعظ و نصیحت کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔ یہ وہی راستہ ہے جو قرآن کے بقول آیات خداوندی کے انکار و تکذیب اور غیبی حقیقتوں کے استہزاء پر منتہی ہوتاہے۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۲۶۸۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْـنَ اَسَآءُ وا السُّوآیٰ اَنْ کَـذَّ بُـوْ ا بِآیَـاتِ اللّٰهِ وَ كَانُـوا بِهَـا یَسْتَهْزِ ئُونَ (۱)

پھر جن لوگوں نے برائی کی تھی ان کا انجام براہی ہوا کیونکہ ان لوگوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

خدا نہ کرے کہ انسان کے دل اور کان پر غفلت کی مہر اور اس کی آنکھوں پر گمراہی اور تاریکی کا پردہ پڑجائے اور وہ قرآن کریم کی اس آیت کا مصداق بن جائے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلیٰ قُلُوبِهِم وَ عَلیٰ سَمْعِهِمْ وَ عَلیٰ اَبْصَارِهِمْ غِشاوَة (۲)

اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگادی اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے۔

اب جبکہ قرآن مجید اور اولیائے الٰہی کے نقطہ نظر سے گناہوں کا نقصان اور خطرہ واضح ہوچکا، صاحب خرد انسان کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ گناہوں کے منحوس اثرات کو صفحہ دل سے مٹانے میں سستی سے کام لے۔ اس قسم کی سستی یقیناً بےوقوفوں اور نادانوں کا ہی شیوہ ہو سکتی ہے۔ گناہ ایسا زہر ہلاہل ہے جس کے اثرات ختم کرنے کے لئے فوری اقدام نہ کیا گیا تو ہلاکت یقینی ہوجاتی ہے۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ موت اچانک انسان کو دبوچ لیتی ہے اور اسے دم لینے کی بھی فرصت نہیں دیتی؟ قرآن کا ارشاد ہے

فَـلا یَسْتَطِیْعُـونَ تَوْصِیَـةً وَ لَا اِلیٰ اَهْلِهِـم یَرْجِعُـونَ (۳)

پھر نہ تو یہ لوگ وصیت ہی کرنے پائیں گے اور نہ اپنے اہل کی طرف لوٹ کر جا سکیں گے۔

---

(۱) سورہ روم / ۱۰۔

(۲) سورہ بقرہ / ۷۔

(۳) سورہ یٰس / ۵۰۔

اس کے بعد کہیں گے:

یَا لَیْتَنَا نُرَدُّ وَ لاَ نُکَذِّبَ بِآیَاتِ رَبِّنَا وَ نَکُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱)

اے کاش ہم (دنیا میں) دوبارہ لوٹا دئے جاتے اور اپنے پروردگار کی آیتوں کو نہ جھٹلاتے اور ہم ایمان لانے والوں میں سے ہوتے۔

لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں کہنا پڑے:

وَ قَدْ اَفْنَیْتُ بِالتَّسْوِیْفِ وَ الآمَالِ عُمْرِی (۲)

یعنی (خدایا) میں نے امروز و فردا کرتے ہوئے اپنی عمر گنوادی۔

لھذا ہرگز استغفار کو فراموش نہ کریں کیونکہ طلب مغفرت دلوں کی جلا ہے۔ ہر حال میں استغفار کے ساتھ خدا کو یاد کیجیئے خواہ آپ نماز کی حالت میں ہوں یا تعقیبات کی یہاں تک کہ سوتے وقت بھی استغفار کو نہ بھولیں کیونکہ ممکن ہے کہ یہ آخری نیند ثابت ہو۔

رسولؐ اللہ کی سیرت تھی کہ آپ ہر روز ستر بار استغفر اللہ فرماتے تھے۔ یہ بھی مروی ہے کہ حضورؐ ہر نشست میں پچیس بار استغفر اللہ زبان پر جاری کرتے تھے۔ یاد رہے کہ استغفار گناہ گاروں کے لئے ایک شفا بخش دوا کی مانند ہے جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے:

لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ وَ دَوَاءُ الذُّنُوبِ اَلاسْتِغْفَارُ (۳)

ہر بیماری کا ایک علاج ہوتا ہے اور گناہوں کا علاج استغفار ہے۔

---

(۱) سورہ انعام / ۲۷۔

(۲) دعائے ابو حمزہ ثمالی۔

(۳) اصول کافی ج ۲ ص ۴۳۹۔

استغفار کا بہترین موقع

جان لیجئے کہ توبہ و استغفار کے لئے سب سے مناسب موقع رات کے وہ حصے ہیں جب سب سوچکے اور سارے دروازے بند ہوچکے ہوتے ہیں لیکن رحمت پروردگار کے دروازے اس کے بندوں پر کھلے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مؤمن بندوں کی توصیف میں فرماتا ہے:

الصّابِریـنَ والصّادِقیـنَ والقانِتیـنَ والمُنفِقیـنَ والمُستغفِریـنَ بالأسْحَـارِ (۱)

یہ سب صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، اطاعت کرنے والے، راہ خدا میں خرچ کرنے والے اور سحر کے وقت استغفار کرنے والے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

وَ کَانُوا قَلِیْلاً مِنَ الَّلیْلِ مَا یَہْجَعُونَ وَ بِالاَ سْحَارِ ھُمْ یَسْتَغْفِرونَ (۲)

صاحبان تقویٰ رات کو کم سوتے اور بوقت سحر استغفار کرتے ہیں۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

کُلّ عَیْنٍ بَاکِیـَة یـَوْمَ الْقِیَامَـةِ اِلّا ثَلٰثـَة، عَین غُضّتْ عَـنْ مَحَارِمِ اللّٰہِ وَ عَیـْن سَھـرتْ فِی طَاعَـةِ اللّٰہِ وَ عَیـن بَکَتْ فِی جَوْفِ الّلیْلِ مِـنْ خَشْـیَةِ اللّٰہ (۳)

قیامت کے دن ہر آنکھ روئے گی سوائے تین آنکھوں کے۔ ایک وہ آنکھ جس نے خدا کی حرام کردہ چیزوں کو نہ دیکھا ہو۔ دوسری وہ آنکھ جو اطاعت

---

(۱) سورہ آل عمران / ۱۷۔

(۲) سورہ الذاریات / ۱۷۔۱۸۔

(۳) اصول کافی ج ۲ ص ۴۸۲۔

خداوندی میں بیدار رہی ہو اور تیسری وہ آنکھ جو رات کو خوف خدا سے گریہ کناں رہی ہو۔

جسے توفیق حاصل ہو اسے چاہیئے کہ دعائے ابو حمزہ ثمالی کے اس حصے پر غور کرے اور اسے اپنی زبان پر جاری کرتے ہوئے اللہ کے حضور گڑگڑائے:

اللّٰهُمَّ اِنّی کُلَّمَا قَدْ تَهَیَّاتُ وَ تَعَبَّاتُ وَ قُمْتُ لِلصَّلاةِ بَیْنَ یَدَیکَ وَ نَاجَیْتُکَ اَلْقَیْتَ عَلَیَّ نُعَاساً اِذَا اَنَا صَلَّیْتُ وَ سَلَبْتَنِی مُنَاجَاتِکَ اِذَا اَنا صَلَّیْتُ مَا لِی کُلَّمَا قُلْتُ قَدْ صَلُحَتْ سَرِیْرَتِی وَ قَرُبَ مِنْ مَجَالِسِ التَّوَّابِینَ مَجْلِسی عَرَضَتْ لِیَ بَلِیَّةٌ اَزَالَتْ قَدَمِی وَ حَالَتْ بَیْنِی وَ بَیْنَ خِدمَتِکَ سَیِّدِیْ لَعَلَّکَ عَنْ بَابِکَ طَرَدْتَنِی وَ عَنْ خِدْمَتِکَ نَحَّیْتَنِی اَوْ لَعَلَّکَ رَاَیْتَنِی مُسْتَخِفاً بِحَقِّکَ فَاَقْصَیْتَنِی اَوْ لَعَلَّکَ رَاَیْتَنِی مُعْرِضاً عَنْکَ فَقَلَیْتَنِی او لعلّکَ وَجَدْتَنِی فِی مَقَام الکاذبین(الکذابین) فرفضتَنِی او لعلک رایتنی غیر شاکر لنعمائک فحرمتنی اَوْ لَعَلَّکَ فقدتَّنی مِنْ مَجَالِسِ العلماء فَخَذلتَنی او لعلک رایتَنی فی الغافلین فمِنْ رحمتِک ایستَنی او لَعَلَّک رایْتَنی الف مَجَالِسِ البَطَّالین فَبَیْنِیْ وَ بَیْنَهُمْ خَلَّیْتَنی اَو لَعلّکَ لَمْ تُحِبَّ اَنْ تَسْمَعَ دُعَائِی فَبَاعَدْتَّنی اَو لَعَلَّک بِجُرمِی وَ جَرِیْرَتِی کَافَیْتَنِی اَوْ لَعَلَّکَ بِقِلَّةِ حَیَائِی مِنْکَ جَازَیْتَنی (دعائے ابو حمزہ ثمالی)

ترجمہ:- پروردگارا میں جب بھی تیرے حضور نماز پڑھنے کے لئے تیار ہو کر کھڑا ہوتا ہوں اور تجھ سے راز و نیاز کی باتیں کرنے لگتا ہوں، تو میرے اوپر غنودگی طاری کرتا ہے اور مجھے تیرے ساتھ راز و نیاز سے محروم کردیتا ہے۔ خدایا مجھے کیا ہو گیا ہے کہ جب بھی عزم کرتا ہوں کہ اب کی بار میرے باطن کی اصلاح ہوگی اور توبہ کرنے والوں کے ساتھ ہم نشینی اختیار کروں گا تو اچانک کوئی

مصیبت پیش آتی ہے جو میرے قدموں کو بہکا دیتی ہے اور مجھے تیری خدمت سے محروم کردیتی ہے۔ اے میرے آقا کہیں ایسا نہ ہو کہ تو نے مجھے اپنے دروازے سے دور کردیا ہو اور اپنی خدمت کے شرف سے مجھے محروم کردیا ہو یا شاید تو نے میری حق ناشناسی کے پیش نظر مجھے اپنی بارگاہ سے دور کردیا ہو یا تیری ذات سے میری بے رخی دیکھ کر تو نے مجھے خیر باد کہہ دیا ہو یا یہ کہ تو نے مجھے جھوٹوں کی صف میں شامل دیکھ کر اپنے حال پر چھوڑ دیا ہو۔ یا اپنی نعمتوں پر شکر نہ کرنے کے جرم میں مجھے محروم فرمایا ہو یا شاید تو نے مجھے علماء کی محفلوں میں حاضر نہ ہونے کی بناء پر ذلیل کردیا ہو۔ یا شاید تو نے مجھے غافلوں میں شامل پاکر اپنی رحمت سے مایوس کردیا ہو یا شاید مجھے اہل باطل اور فضول لوگوں کی محافل میں شریک دیکھ کر مجھے ان کے ساتھ مجھے اپنی حالت پر چھوڑ دیا ہو یا میری دعاؤں سے نفرت کے باعث تو نے مجھے دور کردیا ہو یا شاید میرے جرائم اور گناہوں کے باعث مجھے سزا دی ہو یا شاید مجھے میری بے شرمی کا مزہ چکھایا ہو۔

خلاصہ یہ کہ اس مناجات کو زبان پر جاری کرتے ہوئے ہم اپنی باطنی و قلبی بیماریوں اور خدا سے دوری کے اسباب کو پہچان سکتے ہیں اور یوں اپنے معالجے اور اصلاح کا سامان مہیا کر سکتے ہیں۔ (اللہ تعالی ہم سب کو اپنی رضا سے سرفراز فرمائے)۔

امام سجاد علیہ السلام دعا کے ان جملوں میں توفیق الٰہی سے محرم ہونے کے عوامل بیان فرما رہے ہیں۔

دسواں نکتہ

واجبات اور
فرائض کی ادائیگی

عملی اخلاق کے اہم ترین ابتدائی مراحل میں سے ایک فرائض اور واجبات خاص کر نماز ، روزہ ، زکات ، حج ، جہاد ، امر بالمعروف اور عن المنکر کی بجا آوری ہے۔ مومن سالک کو چاہیئے کہ نماز کے وقت کی پابندی کرے، ساری نمازیں وقت فضیلت میں ادا کرے ، اور ہمیشہ وقت نماز کے سے پہلے ہی نماز کی تیاری کرے تا کہ نماز کا وقت ہوتے ہی اسے انجام دے۔

امام جعفر صادق ؑ کا ارشاد ہے :

اَوَّلُ الْوَقْتِ رِضْوَانُ اللهِ وَ آخِرُهُ عَفْوُ اللهِ وَ الْعَفْوُ لاَ يَكُونُ اِلاَّ مِنْ ذَنْبٍ (۱)

ابتدائے وقت میں نماز کی ادائیگی خدا کی خوشنودی کا سبب بنتی ہے اور آخری وقت (میں نماز کی بجا آوری) خدا کی طرف سے عفو و بخشش کی موجب ہے۔ واضح ہے کہ عفو و بخشش گناہ کے بعد ہی معقول ہے۔

---

(۱) من لا یحضرہ الفقیہ ج ۱ ص ۱۴۰۔

واجبات و فرائض کی ادائیگی پر توجہ انسان کے اندر موجود جذبہ اطاعت کی مظہر نیز تقویٰ ، ایمان اور اخلاق کی بنیادوں کے مضبوط ہونے کا سبب ہے۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے :

اِعْمَلْ بِفَرَائِضِ اللهِ تَكُنْ أَتْقَى النَّاسِ (۱)

اللہ کی طرف سے واجب شدہ فرائض پر عمل کرو تا کہ تم سب سے زیادہ پرہیزگار انسان بن سکو۔

امانت داری اور سچائی

امانت داری ، عہد کی پابندی اور سچائی اہم ترین واجبات میں سے ہیں ۔ ان صفات کی موجودگی ایمان کی علامت ہے اور ان کا فقدان نفاق کی علامت اس بات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ خداوند متعال قرآن مجید میں اپنے انبیاء کی تعریف رسول امین (امانتدار رسول)، ناصح امین (امانتدار ناصح) اور صادق الوعد جیسے الفاظ کے ساتھ فرماتا ہے۔

چنانچہ حضرت نوحؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :

اِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ (۲)

جب ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا کیا تم تقوی اختیار نہیں کرتے میں تمہارے لئے خدا کا ایک امانتدار نمائندہ ہوں ؟

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۸۱ ۔

(۲) سورۂ شعراء / ۱۰۶ تا ۱۰۷ ۔

ایک اور مقام پر حضرت ہودؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب لوگوں نے ان کی طرف بے عقلی و سفاہت کی نسبت دی تو انہوں نے کہا:

یَا قَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَ لٰکِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِیْنَ اُبَلِّغُکُمْ رِسَالَاتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ (۱)

اے میری قوم میں ہرگز بے خرد نہیں ہوں البتہ میں رب العالمین کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لئے ایک امانتدار ناصح ہوں۔

سورہ مریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

واذکر فی الکتاب ابراهیم انه کان صدیقاً نبیاً (۲)

اور اس کتاب میں ابراہیم کا تذکرہ کرو کہ وہ ایک نہایت راستگو پیغمبر تھے۔

یہ ان آیات میں سے بعض تھیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض انبیاء کی توصیف میں بیان فرمائی ہیں۔ یہ بات بجائے خود امانتداری کی اہمیت کی ایک دلیل ہے۔ بہر حال قرآن مجید لوگوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ انبیاء کی سیرت پر چلتے ہوئے امانت داری کا ثبوت دیں اور جو امانت ان کے سپرد کی جائے اس میں خیانت نہ کریں۔

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَهْلِهَا (۳)

اللہ تم لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک پہنچا دو۔

---

(۱) سورہ اعراف / ۶۷ - ۶۸-

(۲) سورہ مریم / ۴۱-

(۳) سورہ نساء / ۵۸-

امانت احادیث کی روشنی میں

بہت ساری احادیث میں بھی اس مسئلے کی اہمیت واضح طور پر بیان کی گئی ہے یہاں تک کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:

لَیْسَ مِنّا مَنْ خَانَ بِالأَمانَۃِ [1]

جو شخص امانت میں خیانت کرے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔

امام صادقؑ کا ارشاد ہے:

لاَ تَنْظُروا اِلیٰ طولِ رُکوعِ الرَّجُلِ وَ سُجُودِہِ فَاِنَّ ذَالِکَ شَیءٌ اعْتَادَہُ فَلَوْ تَرَکَہُ اِسْتَوْحَشَ لِذلِکَ وَلکِن انْظُرُوا اِلیٰ صِدْقِ حَدِیْثِہِ وَ اَداءِ اَمانَتِہِ [2]

لوگوں کے طولانی رکوع و سجود کو نہ دیکھو کیونکہ ممکن ہے کہ یہ عمل ان کی عادت بن چکی ہو (عادت سے مجبور ہوکر ایسا کرتے ہوں) اور اس عادت کے ترک کرنے سے ان کو وحشت ہوتی ہو بلکہ تم ان کی راستگوئی اور امانتداری کو دیکھو۔

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

فَاِنَّ عَلِیّاً بَلَغَ مَا بَلَغَ بِہِ عِنْدَ رَسُولِ اللہِ بِصِدْقِ الْحَدِیْثِ وَ اَدَاءِ الْاَمَانَۃِ [3]

بہ تحقیق علیؑ کو رسولؐ اللہ کے ہاں اس قدر مقام و مرتبہ راستگوئی اور امانداری کے باعث حاصل ہوا۔

---

(۱) مشکوۃ الانوار ۵۲۔

(۲) نور الثقلین ج ۱ ص ۴۹۶۔

(۳) اصول کافی ج ۲ ص ۱۰۵۔

رسول اللہ کی حدیث ہے:

آیۃُ النِّفَاقِ ثَلاثٌ اِذا حَدَّثَ کَذِبَ وَ اِذا وَعَدَ اَخْلَفَ وَ اِذا ائتُمِنَ خَانَ (۱)

یعنی منافقت کی تین علامتیں ہیں دروغگوئی، عہد شکنی اور امانت میں خیانت۔

اچھے اور برے سب کے ساتھ امانتداری

اسلام کی نظر میں امانت کی حفاظت اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ اگر کوئی دشمن بھی بطور امانت کوئی چیز کسی کے حوالے کرے تو اس کی حفاظت میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہیئے کیونکہ اسلام کا مقصد ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جہاں باہمی اعتماد کا دور دورہ ہو۔ اگر ہم عداوت کی بناء پر دشمن کی امانت میں خیانت کریں یا اس بہانے کہ فلاں شخص اچھا آدمی نہیں ہے اس کی امانت واپس نہ کریں تو ایسا معاشرہ ہرگز وجود میں نہیں آسکتا جو اسلام کے پیش نظر ہے۔ بنابریں دین مقدس اسلام کا حکم ہے کہ امانت کی ہر صورت میں محافظت کی جائے اور امامت صاحب امانت کو لوٹائی جائے خواہ وہ کوئی بھی ہو نیز اگر چہ وہ دشمن یا بدکار ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

ثَلاثٌ لَمْ یَجْعَلِ اللّٰہ عَزَّوَجَلَّ لِاَحَدٍ فِیہِنَّ رُخْصَۃً اداء الاَمَانَۃِ اِلَی البِرِّ وَ الفَاجِرِ وَ الوَفاء بِالعَہدِ لِلبَرِّ وَ الفَاجِرِ وَ بِرُّ الوَالِدَینِ بَرَّیْنِ کَانا اَوْ کَافِرَیْنِ (۲)

---

(۱) سنن نسائی ج ۴ ص ۱۱۷۔

(۲) بحار الانوار ج ۷۲ ص ۹۲۔

تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں اللہ عزوجل نے کسی کو مخالفت کی اجازت نہیں دی۔ (ان میں سے) ایک امانت کی ادائیگی ہے خواہ نیک شخص کے لئے ہو یا برے کے لئے۔ (دوسری چیز) اچھے اور برے دونوں قسم کے لوگوں کے ساتھ عہد کی پابندی ہے۔ اور (تیسری چیز) والدین کے ساتھ نیکی ہے خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے۔

نیز آپؑ نے فرمایا:

انَّ ضَارِ بَ عَلِيّ بِالسَّيْفِ وَ قَاتِلَه لو ائتَمَننيَ وَ اسْتَنْصَحَني وَ اسْتَشَارَ نِي ثُمَّ قَبِلْتُ ذالک مِنْه لَادَّيتُ اِلَيْهِ الاَ مَانَةَ (۱)

اگر حضرت علیؑ پر تلوار سے ضرب لگانے اور آپ کو قتل کرنے والا میرے پاس کوئی امانت رکھے یا مجھ سے نصیحت اور مشورہ چاہے اور میں اسے قبول کروں تو میں ضرور بہ ضرور اس کے ساتھ امانتداری کا ثبوت دوں گا۔

---

(۱) تفسیر نور الثقلین ج ۱ ص ۴۹۶۔

گیارھواں نکتہ

نوافل اور مستحبات کی انجام دہی

(اور مکروہات سے اجتناب)

عملی اخلاق کے ابتدائی مراحل میں سے ایک مرحلہ مستحبات و نوافل کی با قاعدہ بجا آوری ہے۔ مستحبات و نوافل کی اہمیت اسقدر زیادہ ہے کہ بعض فقہاء نے تمام مستحبات کے ترک کرنے کو اس بناء پر حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ امر تعلیمات شریعت مقدسہ سے بے اعتنائی کی علامت ہے۔

چند مفید نکتے

پہلا نکتہ:۔ نوافل اور مستحبات کی باقاعدہ اور مسلسل بجا آوری پر تین اہم اثرات مرتب ہوتے ہیں،

(۱) یہ امر گناہوں کو محو کرتا ہے چنانچہ خداوند متعال فرماتا ہے:

وَ اَقِمِ الصَّلاَ ةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَ زُلَفاً مِنَ اللَّيلِ اِنَّ الحَسَنَاتِ يَذهِبنَ السَّيئَاتِ (۱) .....

اور (اے رسول) آپ نماز قائم کریں دن کے ابتدائی اور آخری حصوں میں نیز رات کے کچھ حصوں میں کیونکہ نیکیاں برائیوں کو ختم کردیتی ہیں۔

---

(۱) سورہ ہود / ۱۱۴۔

حدیث ہے کہ رات کے وقت مومن کی نماز اس کے دن کے گناہوں کو محو کردیتی ہے یہ بھی مروی ہے کہ نماز وتر گناہوں کا خاتمہ کرتی ہے۔[1]

(۲) نوافل کے باعث ان نقایص اور کوتاہیوں کی تلافی ہوجاتی ہے جو غفلت یا غلطی کی وجہ سے فرائض و واجبات میں رہ جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر نوافل یومیہ خاصکر نوافل شب، نماز پنجگانہ میں رہ جانے والی کمی کو دور کرتے ہیں، مستحب روزے ماہ رمضان کے روزوں میں رہ جانے والے نقایص کا ازالہ کرتے ہیں اور مستحب صدقات خمس جیسی واجب ادائیگی میں کمی کو دور کرتے ہیں۔ اس بات کا احتمال بھی ہے کہ ہر قسم کے مستحب اعمال ہر قسم کے فرایض و واجبات میں رہ جانے والی کمی کا ازالہ کرتے ہیں۔

(۳) یہ امر خداوند متعال کا قرب حاصل کرنے کا باعث بنتا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَكَ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَحْمُوداً[2]

اور رات کے ایک حصہ میں نماز شب کے لئے بیدار ہوجاؤ تا کہ اس طرح آپ کا پروردگار آپ کو مقام محمود تک پہنچا دے۔

ایک حدیث میں مذکور ہے:

صَلاَةُ النَّوافِلِ قُرْبَانُ كُلِّ مُؤمِنٍ[3]

نفل نمازیں ہر مومن کے لئے اللہ سے نزدیک ہونے کا وسیلہ ہیں۔

---

(۱) وتر ایک رکعت ہے اور اس کے خاص آداب ہیں۔ یہ نماز تہجد کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ رات کے نوافل ۱۱ رکعات ہیں جن میں سے آٹھ رکعات نماز تہجد ۲ رکعتیں نماز شفع اور ایک رکعت نماز وتر کی نیت سے پڑھی جاتی ہے۔ ان نوافل کے اثرات اور ثواب بہت زیادہ ہیں۔

(۲) سورہ اسراء / ۷۹۔

(۳) جامع احادیث الشیعہ ج ۷، ص ۹۹۔

رسول اللہ کا فرمان ہے:

اَشْرَافُ اُمَّتِي حَمَلَةُ الْقُرآنِ وَ اَصْحَابُ اللَّيْلِ (۱)

یعنی میری امت کی بزرگ ہستیاں دو قسم کے لوگ ہیں قرآن کے حاملین (حافظ) اور رات کو عبادت کرنے والے۔

دوسرا نکتہ:- نوافل اور مسنون اعمال اس صورت میں فائدہ مند ہیں جب ان پر ہمیشہ تسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ عمل کیا جائے چنانچہ حدیث میں مذکور ہے: نیک کام کو باقاعدہ اور ہمیشہ انجام دینا اچھے نتائج کا حامل ہے جن میں سے بعض برے کاموں سے گلو خلاصی، گناہ اور خطاؤں سے اجتناب، حصول یقین، نجات اور اطاعت کا شوق...... و غیرہ ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں ایک عقلمند انسان نیک کاموں کی مسلسل انجام دہی کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ (۲)

تیسرا نکتہ:- نوافل اور مستحبات کی پابندی سے مراد یہ نہیں کہ انسان تمام مستحبات و مسنونات کو بجا لائے کیونکہ ایسا کرنا نہ ہی ممکن ہے اور نہ جائز بلکہ مراد یہ ہے کہ انسان انفرادی و اجتماعی حالات و امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض مناسب اعمال کا انتخاب کرے اور ان کی انجام دہی پر کاربندر ہے۔

چوتھا نکتہ:- شریعت اسلامیہ نے بعض عبادات، مستحب اعمال، خدمات، صدقات اور نیک کاموں کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ اولیائے الہی اور ائمہ معصومین ؑ نے اس قسم کے اعمال پر پابندی سے کاربند رہنے کی تاکید کی ہے۔ ان اعمال میں سے چند ایک یہ ہیں: قرآن کی تلاوت، تہجد، شب بیداری، رات کے وقت خدا کے ساتھ راز و نیاز، واجب نمازوں کی اول وقت میں ادائیگی، چوبیس گھنٹوں میں اکیاون رکعت نمازوں (جن میں

---

(۱) جامع احادیث الشیعہ ج۷، ص ۱۰۰۔

(۲) تحف العقول ج/ ۲ ص ۸۲ و ۸۳۔

سے سترہ رکعات واجب اور باقی مستحب ہیں) خاصکر نماز تہجد اور صبح و عشاء (وتیرہ) کی دو رکعت مستحب نمازوں کی بجا آوری، با وضو رہنا، عبادتوں میں آداب و سنن اور حضور قلب کی رعایت، تعقیبات نماز، جمعہ و جماعت میں ہمیشہ شرکت، نماز میں قنوت اور سجدوں کو طول دینا، ہر مہینے میں تین روزے رکھنا، اولیاء و شہداء خصوصاً رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کی قبور کی زیارت، سید الشہداءؑ کے غم میں گریہ و بکاء، امام حسینؑ اور دیگر معصومین علیہم السلام سے متوسل ہونا، صلہ رحم اور رشتہ داروں اور غریبوں کی مدد کرنا، لوگوں کو کھانا کھلانا اور سلام کرنے میں پہل کرنا خاص کر دوستداران اہلبیتؑ کو بعض اوراد و اذکار مثلاً لا الہ الا اللہ اور استغفر اللہ ربی و اتوب الیہ کہنا، محمد و آل محمدؐ پر درود بھیجنا، ہر نماز کے بعد اور سوتے وقت تسبیحات حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا پڑھنا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ نماز صبح کے بعد توجہ اور حضور قلب کے ساتھ سو بار لا الہ الا اللہ اور ستر دفعہ استغفار کرنا بہت مجرب ہے۔ لہذا حتی المقدور اسے ترک نہ کیجیے۔ اسی طرح نماز صبح اور نماز مغرب کے بعد دس بار لا الہ الا اللہ الملک الحق المبین اور سات بار لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کہنے کی بھی تاکید ہوئی ہے۔

احادیث میں مذکور ہے کہ سورہ حشر کی آخری چار آیات (لو انزلنا ھذا القرآن سے آخر سورہ تک) کو ہر صبح پڑھنا بہت خوب ہے اور بہتر یہ ہے کہ انہیں سجدہ شکر میں پڑھا جائے۔ یہ تھے بعض مستحب اعمال جن کو پابندی کے ساتھ بجا لانا نہایت مجرب اور مفید ہے۔

---

(۱) مفسرین کہتے ہیں کہ قرآن میں " و قران الفجر انَّ قُرْان الْفَجر کان مَشهودا (الاسراء ۷۸) سے مراد نافلہ صبح ہے جو خدا کے نزدیک مشہود اور مقبول ہے۔

بارھواں نکتہ

مرابطہ

سالکان راہ حق کے لئے مرابطہ نہایت نازک اور اہم مرحلہ ہے ۔ اس مرحلے کو بخوبی طے کئے بغیر روحانی ترقی و تکامل کی منازل تک رسائی ممکن نہیں ۔

مرابطہ کا لغوی معنی ایک دوسرے سے رابطہ رکھنا ہے لیکن اہل عرفان و سلوک کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے اپنے آپ سے رابطہ رکھنا ، اپنے اوپر نظر رکھنا یا ایک جملے میں، ہمیشہ اپنی حالت پر فکر مند رہنا ۔ یاد رہے کہ مرابطہ کے چار درج ذیل مراحل ہیں :

۱۔ مشارطہ جسے معاہدہ بھی کہہ سکتے ہیں ۲۔ مراقبہ ۳۔ محاسبہ ۴۔ معاتبہ (اپنے اوپر تنقید)

مشارطہ

مشارطہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ سے عہد و پیمان باندھے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرے گا، شریعت مطہرہ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، نیک کاموں کی انجام ھی کی کوشش کرے گا اور ناپسندیدہ کاموں سے اجتناب کرے گا۔ یہ عہد و پیمان اس صورت میں موثر ہے جب ہر روز اس کا اعادہ کیاجائے یہاں سے کہ یہ انسان کی روح میں رچ بس جائے۔ مشارطہ کے لئے سب سے بہترین وقت نماز صبح کے بعد کی گھڑی ہے ۔

مرابطہ کی کیفیت

کس قدر مناسب بات ہے کہ ہم مرابطہ کی خاطر اس دن کو یاد کریں جب لوگ دنیا سے ہاتھ دھوچکے ہوں گے اور حسرت و افسوس کے مارے یہ کہہ رہے ہوں گے:

یَا حَسْرَتیٰ عَلیٰ مَا فَرَّطتُّ فِی جَنْبِ اللّٰہ ......

افسوس کہ میں نے اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں کوتاہی کی اور اللہ کے حکم کا پاس نہ رکھا۔

نیز اس دن کو یاد کریں جب لوگ دوبارہ دنیا کی طرف لوٹنے کی آرزو کریں گے اور کہیں گے

رَبِّ ارجِعُونِ لَعَلِّی اَعْمَلُ صَالحاً فِیما تَرَکتُ کَلاّ اِنَّھا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَائِلُھا

یعنی پروردگارا مجھے لوٹا دے۔ شاید میں اپنے گذشتہ اعمال کی تلافی کرتے ہوئے کوئی اچھا عمل انجام دے سکوں۔ لیکن جواب میں کہا جائے گا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اس دن دنیا میں واپسی کی تمنا بے فائدہ ہوگی۔

پس ہمیں چاہیئے کہ اب جبکہ فرصت باقی ہے اس بات کا عہد کریں کہ اپنی قیمتی عمر کو ضایع نہ کریں گے اور زندگی کے ایک ایک لمحے سے خوب فائدہ اٹھائیں گے۔

کس قدر اچھی بات ہوگی اگر ہم ہر صبح اپنے تئیں تجدید عہد کریں کہ اپنی عمر کو فضول نہ گنوائیں گے اور کتنا ہی بہتر ہو گا اگر ہم ہر صبح سورہ عصر کی تلاوت کریں اور اس کے معانی میں تدبر کریں۔ اس سورت میں اللہ نے عصر (زمانے) کی قسم کھائی ہے جو انسان کی عمر اور اس کے گذرنے کی رفتار ناپنے کا پیمانہ ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ سارے انسان خسارے میں ہیں سوائے ایمان لانے اور نیک اعمال بجانے لانے والوں اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرنے والوں کے صرف وہی لوگ نجات پائیں گے جو اپنی قیمتی زندگی کو ایمان اور عمل صالح نیز حق اور صبر کی تلقین کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی سارے لوگ خسارے اور تباہی میں ہیں۔

ایک دلچسپ نکتہ:

خسارہ لغوی نقطہ نظر سے اس نقصان اور زیاں کا نام ہے جو اصلی سرمائے کی تباہی کا موجب ہو۔ گویا سرمایۂ عمر برف کی طرح ہے جو سورج کی تپتی شعاعوں کے سامنے آناً فاناً پگھل کر ختم ہوجاتا ہے۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ برف پانی کی صورت میں زمین کے اندر باقی رہتی ہے لیکن انسانی زندگی کا ایک لمحہ بھی واپس نہیں لایا جاسکتا۔ بنابرین اگر کوئی شخص ایک لحظے کے لئے بھی غفلت برتے تو وہ اسی حساب سے ابدی نقصان کا شکار ہوجائے گا۔ بر فرض انسان مستقبل میں اپنے سرمایۂ زندگی کو بہتر طریقے سے کام میں لائے تو یہ ممکن ہے لیکن اس کے باوجود وہ گذشتہ زندگی کے حوالے سے یقیناً خسارے میں ہے کیونکہ ہر ظرف فقط اپنی گنجائش کے تناسب سے کسی مظروف کا حامل ہوتا ہے اسی طرح ہر لحظے کی بھی خاص اور محدود گنجائش ہوتی ہے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اس محدود ظرف میں ماضی کو بھی سمو کر اس کی تلافی کی جائے مگر یہ کہ خدا کا لطف خاص شامل حال ہو عین ممکن ہے کہ ہم صدق دل سے توبہ کریں اور ہماری توبہ قبول بھی ہوجائے لیکن توبہ کا نتیجہ مغفرت اور عفو کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ توبہ بنیادی طور پر رفع عذاب کا موجب ہے درجات کی بلندی کا نہیں دوسرے لفظوں میں توبہ صرف عذاب اخروی کو دور کرتی ہے لیکن افتخار و سربلندی کا باعث نہیں بنتی۔ خوش نصیب ہیں وہ افراد جو زندگی کے تمام لمحوں اور وسائل سے معقول فائدہ حاصل کرتے ہیں اور آرام و استراحت کے لمحات کی منصوبہ بندی بھی اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی نیندیں عبادت اور سانسیں تسبیح شمار ہوں جیسا کہ رسول اکرمؐ نے رمضان المبارک کے دوران روزہ رکھنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے:

(۱)
اَنْفَاسُکُمْ فِیْهِ تَسْبِیح وَ نومُکم فیه عِبادَة وَ عَمَلَکُمْ فِیْهِ مَقْبُول

یعنی اس ماہ میں تمہاری سانسیں تسبیح اور نیندیں عبادت کا درجہ رکھتی ہیں نیز تمہارے اعمال اس ماہ میں مقبول ہوتے ہیں۔

---

(۱) کتاب الواقی ج ۲ ص ۵۳ رسول اللہؐ کا خطبہ شعبانیہ ملاحظہ ہو۔

لوگوں کا صرف ایک گروہ اس بات کی امید رکھ سکتاہے کہ وہ گذشتہ کی تلافی کرے اور وہ ہے راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کا گروہ یعنی وہ لوگ جو شہادت اور جانثاری کا راستہ اپناتے ہیں کیونکہ شہادت اعلی علیین تک رسائی اور پروردگار سے قریب ہونے کا وسیلہ ہے لہذا یہ گروہ عفو الہی سے بہرہ مند ہونے کے علاوہ تمام گزشتہ خامیوں اور نواقص کی تلافی بھی کرلیتاہے اور ایثار و فداکاری کی بدولت سوسال کا راستہ ایک رات میں طے کر لیتا ہے اور تمام ممکنہ امور ان کے لیے عملی شکل اختیار کرلیتے ہیں یہاں تک کہ پروردگار کے حضور دوسروں پر سبقت لے جاتے ہیں اور وہاں کچھ دوسروں کے ساتھ ابدی زندگی اور دائمی ضیافت سے سرافراز ہوتے ہیں۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ توبہ سے متعلق آیات و احادیث سے یہ معلوم ہوتاہے کہ توبہ، خدا کی رحمت و مغفرت کا موجب ہونے کے علاوہ انسان کے گناہوں کو اچھائیوں میں بدل دیتی ہے۔

جیسا کہ سورہ فرقان میں ارشاد ہوتاہے:

اِلاَّ مَنْ تَابَ وَ آمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَاُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللہُ سَیِّئَاتِھِمْ حَسَنَاتٍ (1)

یعنی جو توبہ کرے اور ایمان لے آئے نیز عمل صالح بجا لائے۔ اللہ تعالی اس قسم کے لوگوں کی برائیوں کو اچھائیوں میں تبدیل فرماتاہے۔

---

(1) سورہ الفرقان / ۷۰۔

علامہ طباطبائیؒ (قدس سرہ) اس آیت کی تفسیر میں مختلف مفسرین کی آراء و اقوال کو نقل کرنے کے بعد ان مفسرین کی رائے کو رد کرتے ہیں جو گناہوں کے نیکیوں میں تبدیل ہونے کے مسئلے کی مختلف تاویلات کرتے ہیں۔ علامہ طباطبائیؒ کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت اور احادیث مکمل طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کرنے والے شخص کے برے اعمال نیک اعمال کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں "گناہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک اس کا زوال پذیر اور فانی پہلو ہے اور دوسرا اس کا دائمی پہلو۔ گناہ کا فانی پہلو ان ظاہری اعمال و حرکات سے عبارت ہے جو ارتکاب گناہ کے وقت انسان سے سرزد ہوتے اور ختم ہوجاتے ہیں۔ لیکن دائمی پہلو سے مراد وہ برے اثرات ہیں جو گناہ کے باعث انسان کی روح اور نفس پر مرتب ہوتے ہیں اور انسان کے مستقبل کا دارومدار انہی پر ہوتاہے۔ جب انسان توبہ کرتاہے تو قبول توبہ کے ساتھ ہی یہ سارے آثار اس کے وجود سے محو ہوجاتے ہیں دوسرے لفظوں میں شقاوت سعادت میں اور ظلمت نور میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

التائبُ مِنَ الذَّنبِ کَمَنْ لاَ ذَنبَ لَه (۱)

یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس نے کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو۔

خلاصہ یہ کہ توبہ کی بدولت ایک طرف سے مغفرت الٰہی نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف سے روحانی پاکیزگی، عظمت اور قلبی نورانیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ توبہ گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کردیتی ہے۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۴۳۵۔

مراقبہ

مرابطے کا دوسرا مرحلہ مراقبہ ہے یعنی جب انسان اپنے ضمیر کے ساتھ عہد و پیمان باندھ لے تو اس کے بعد اسے چاہیئے کہ وہ تمام حالات میں اپنے اوپر کڑی نظر رکھے تاکہ وہ غفلت اور کوتاہی کے باعث کہیں اپنے عہد کو نہ توڑ بیٹھے ۔ واضح ہے کہ مومن کی ایک اہم صفت عہد و پیمان کی پابندی ہے۔

جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے :

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ (۱)

یعنی مومنین اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کے پابند ہوتے ہیں ۔

مراقبہ یہ ہے کہ ہم ہرگز اللہ کو فراموش نہ کریں اور ان اعمال و اذکار کو پابندی کے ساتھ بجا لائیں جو ہمیں خدا کی یاد دلائیں نیز ہر کام کو خدائی رنگ میں ڈھالیں اور اس کے نام سے شروع کریں ۔ خلاصہ یہ کہ خدا کی یاد سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہ ہوں کیونکہ جو شخص خدا کو فراموش کرے اللہ بھی اس کو بھول جائے گا اور جو شخص اللہ کو فراموش کرے آخر کار وہ اپنے وجود سے بھی بیگانہ ہوجائے گا اور اپنی عظیم انسانی شخصیت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

چنانچہ ارشاد باری ہے :

وَ لَا تَكُوْنُوا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (۲)

ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے اللہ کو فراموش کردیا پس اللہ نے ان کو خود فراموشی میں مبتلا کردیا۔

یوں وہ بندگی اور انسانیت کے مرتبے سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔

---

(۱) سورہ مومنون / ۸۔

(۲) سورہ حشر / ۱۹۔

کہتے ہیں کہ جب زلیخا نے حضرت یوسفؑ سے خلوت میں ملاقات کی اور گناہ کی دعوت دی تو اچانک اس کی نظر اس کمرے میں موجود ایک بت پر پڑی ۔ اس نے جلدی سے بڑھکر اس بت پر کپڑا ڈال دیا ۔ حضرت یوسفؑ نے اس سے کہا جب تو بے جان جمادات کی نگاہوں سے شرم محسوس کرتی ہو تو مجھے خداوند جبار کی نگاہوں سے شرم محسوس کیوں نہ ہو (۱)

یاد رہے کہ مراقبہ کے مختلف درجات ہیں ۔ یہ درجات سالک راہ حق کی معرفت و ریاضت کے حساب سے مختلف ہوتے ہیں ۔ مراقبہ کا پہلا درجہ پرہیزگاروں والا مراقبہ ہے اور بلندترین درجے کا مراقبہ مقرب بندوں کا مراقبہ ہے ۔

بقول شاعر

رسد آدمی به جائی که بجز خدا نبیند — بنگر که تا چه حد است مقام آدمیت

ریاضت ، کوشش اور مراقبت کے ذریعے انسان مقام قرب تک پہنچ کر پروردگار ذوالجلال کے جمال میں مستغرق ہوسکتاہے ۔ یہاں پہنچ کر معاملہ برعکس ہوجاتاہے اور خدا اپنے بندے کا نگہبان و محافظ بن جاتاہے ۔

چنانچہ حضرت یوسفؑ کے بارے میں ارشاد ربانی ہے :

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ..... (۲)

یعنی زلیخا فرط عشق میں یوسفؑ سے دست بردار نہیں ہوئی اگرچہ حضرت یوسفؑ نے اس کی خواہش کو رد کردیا تھا ۔

---

(۱) جامع السعادات ج ۳ ص ۹۶ ۔

(۲) سورہ یوسف / ۲۴ ۔

وہ وصل یوسف پر مصر تھی ۔ اگر اللہ اپنے لطف خاص اور واضح برہان کے ذریعے حضرت یوسف کی نگہبانی نہ فرماتا تو وہ بھی فطری میلانات کا شکار ہوجاتے اور زلیخا کی خواہش کا مثبت جواب دیتے ۔ پس خدا نے اپنے سرمدی جمال کا منظر دکھا کر زلیخا کے رخ زیبا سے اپنے مخلص بندے کی توجہ ہٹالی اور اسے لغزش سے اس طرح بچایا کہ اس کے دل سے گناہ کا خیال اور تصور ہی مٹادیا۔

طُوبیٰ لِمَنْ رَاقَبَ رَبَّہ وَ خَافَ ذَنْبَہُ (۱)

خوش نصیب ہے وہ شخص جو ہمیشہ اپنے اللہ کو مد نظر رکھے اور گناہ سے ڈرتا رہے۔

حضرت علیؑ مراقبت کے بارے میں فرماتے ہیں:

یَنْبَغِی اَنْ یَکُوْنَ الرَّجُلُ مُھَیْمِناً عَلیٰ نَفْسِہِ مُرَاقِباً قَلْبَہ حَافِظاً لِسَانَہ (۲)

انسان کو چاہیئے کہ اپنے نفس پر قابو رکھے ، اپنے دل پر کڑی نظر رکھے اور اپنی زبان کی حفاظت کرے۔

نفس کا محاسبہ

اخلاقی اور عرفانی اصولوں میں سے ایک محاسبہ کا اصول ہے۔ سالکان راہ خدا اور طالبان دار بقا جس طرح بوقت سحر اپنے ساتھ عہد و پیمان باندھتے ہیں اسی طرح وہ اپنے روزمرہ کے اعمال کا محاسبہ کرنے کے لئے بھی ایک گھڑی معین کرتے ہیں ۔ جناب نراقیؒ مرحوم لکھتے ہیں " مناسب ہے کہ عاقل آدمی اپنے وقت کو چار حصوں میں تقسیم کرے ۔

---

(۱) شرح غرر الحکم ج ۴ ص ۲۳۸ ۔

(۲) فہرست غرر الحکم ص ۳۹۳ کالم ۷، ۱۰۹۴ ۔

جن میں سے ایک روزمرہ کے اعمال کا محاسبہ کرنے کے لئے مختص ہو۔ بہتر ہے کہ محاسبہ کا وقت رات کو سونے سے قبل رکھا جائے تاکہ انسان روزمرہ کے سود و زیان سے مکمل طور پر آگاہ ہو[1] محاسبہ سے مراد گذشتہ امور کا حساب و کتاب اور جانچ پڑتال کرنا نیز مستقبل میں ہوشیار رہنا ہے۔ محاسبہ کے لئے درج ذیل سات اصولوں کی رعایت ضروری ہے۔

۱)۔ اندازہ گیری کا اصول

۲)۔ احساس ذمہ داری کا اصول

۳)۔ بقائے عمل کا اصول

۴)۔ اندراج اعمال کا اصول

۵)۔ مواخذہ کا اصول

۶)۔ سزا اور عقوبت کا اصول

۷)۔ توبہ اور تلافی کا اصول

اب ہم ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ تبصرہ کرتے ہیں۔

۱۔ اندازہ گیری کا اصول

یہ عالم خلقت کا ایک مسلمہ اصول اور نظام کائنات کا ایک بنیادی رکن ہے۔ خدا کے ہاں ہر چیز ایک خاص اندازے کے مطابق معین شدہ ہے۔ قرآن نے اسی کی یاد دہانی ان الفاظ میں کروائی ہے:

وَاِنْ مِنْ شَیٍٔ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ[2]

---

(۱) حدیث ہے: ان العاقل ینبغی ان یکون لہ اربع ساعات ساعۃ یناجی فیہا ربّہ و ساعۃ یحاسب فیہا نفسہ و ساعۃ یتفکر فی صنع اللہ و ساعۃ یخلوا فیہا للمطعم والمشرب (جامع السعادات ج ۳ ص ۹۹)

(۲) سورۃ حجر/۲۱۔

ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم اس کو مخصوص اندازے کے بغیر نازل نہیں کرتے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا:

وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِي اِمَامٍ مُبِيْنٍ (۱)

اور ہم نے ہر شے کو ایک واضح امام کے اندر جمع کر دیا ہے۔

۲۔ احساس ذمہ داری

خداوند عالم اور بنی نوع انسانیت کے معاملے میں احساس ذمہ داری کا جذبہ ایک خدائی امانت ہے جو انسان کے دوش پر رکھی گئی ہے۔ یہ ایک فطری تقاضا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهُ كَانَ ظَلُوْماً جَهُوْلاً (۲)

بے شک ہم نے امانت (ذمہ داری کے بوجھ) کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے رکھا پس انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اس بوجھ کو (اختیار و ارادہ اور انتخاب کی قدرت رکھنے کی بناء پر) اٹھانا قبول کیا۔ بہ تحقیق وہ ظالم اور نادان تھا (اور اس ذمہ داری کی قبولیت اسے ممکن، مفید اور ضروری معلوم ہوئی)۔

---

(۱) سورہ یٰس / ۱۲۔
(۲) سورہ احزاب / ۷۲۔

۳۔ بقاء عمل کا اصول

یہ ایک سائنسی اور فلسفی اصول ہے (فنا، ہلاکت، موت اور فنا جیسے الفاظ موجودات کے تغیّر و تبدل، شکل بدلنے اور جگہ بدلنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کسی وجود کا مکمل طور پر فنا ہوجانا ممکن نہیں ہے۔ فلسفیوں کے بقول " موجود اپنے نقیض یعنی فنا میں ہرگز تبدیل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ اجتماع نقیضین ہے جو محال ہے۔ قرآن کریم اس نظریے کی واضح الفاظ میں تائید کرتا ہے اور کہتا ہے۔

وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوا حَاضِرا ......(۱)

وہ قیامت کے دن اپنے اعمال کو اپنے سامنے حاضر پائیں گے۔

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَرَہ ہ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَرہ (۲)

پھر جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے وہ اسے دیکھے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے اسے بھی دیکھے گا۔

۴۔ اندراج اعمال کا اصول

بہت سے لوگ غفلت کی بناء پر مہینوں یا سالوں تک اپنا محاسبہ نہیں کرتے گویا انہوں نے کوئی کام ہی نہ کیا ہو۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے گذشتہ اعمال نابود اور منہدم ہوگئے ہیں۔ وہ اس بات سے غافل ہیں کہ اللہ تعالی کے پاس ہر شخص کا مکمل نامۂ عمل موجود ہے اور اللہ نے اس کو مرتب کرنے پر فرشتے معین کر رکھے ہیں۔ قیامت کے دن ان نامۂ اعمال کے تحت حساب لیا جائے گا۔

---

(۱) سورہ کہف / ۴۹۔

(۲) سورہ زلزال / ۷۔۸۔

۴ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا (۱)

اور ہر شخص کے اعمال کو ہم نے اس کے گلے کا ہار بنادیا ہے اور روز قیامت اس کے لئے ہم ایک کتاب کی صورت میں نکالیں گے جسے وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا۔

پھر کہا جائے گا:

اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۲)

(یہ لو) اپنا نامہ اعمال پڑھو آج تم اپنا محاسبہ کرنے کے لئے آپ ہی کافی ہو۔

اعمال انسانی کا یہ ریکارڈ قیامت کے دن تفصیل کے ساتھ اس کے سامنے لایا جائے گا تاکہ کسی قسم کے انکار یا اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔

۵۔ مواخذہ اور اعمال کی جانچ پڑتال

یہ قیامت کے اہم اور حساس امور میں سے ایک ہے۔ اس سے فرار کسی شخص کے لیے ممکن نہیں۔

اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ (۳)

ان کو روکو کیونکہ ان سے پوچھ گچھ ہونی ہے۔

یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ پیغمبروں سے بھی بازپرس ہوگی۔

---

(۱) سورہ اسراء / ۱۳۔

(۲) سورہ اسراء / ۱۴۔

(۳) سورہ الصافات / ۲۴۔

قرآن کا ارشاد ہے:

فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ (۱)

پس اب ہم ان امتوں سے بھی سوال کریں گے اور ان کی طرف بھیجے جانے والے رسولوں سے بھی۔

محاسبے کا مسئلہ اس قدر باریک ہے کہ قیامت کے دن انسان کے دلی ارادوں اور نیتوں کے بارے میں بھی بازپرس ہوگی۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ (۲)

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اسے ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو خدا تمہارا حساب اس کے مطابق ہی کرے گا۔

اللہ کے ناموں میں سے ایک سریع الحساب اور قیامت کے ناموں میں سے ایک "یوم الحساب" ہے۔ یہ دونوں نام حساب کتاب اور محاسبہ کی اہمیت پر دلالت کرتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۳)

اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر اختیار کریں وہ جان لیں کہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

---

(۱) سورہ اعراف / ۶۔

(۲) سورہ بقرہ / ۲۸۴۔

(۳) سورہ آل عمران / ۱۹۔

ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَضِلُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌۢ بِمَا نَسُوۡا یَوۡمَ الۡحِسَابِ (۱)

جو لوگ اللہ کے راستے کو چھوڑ کر گمراہ ہوجاتے ہیں ان کے لئے شدید عذاب ہے کیونکہ انہوں نے یوم حساب کو بھلا دیا۔

پس وائے ہو ان پر جو اس روز کو فراموش کریں۔ دو چیزوں کو فراموش کرنا ابدی بدبختی اور خسارے کا موجب ہے، خدا کو فراموش کرنا اور روز جزاء کو فراموش کرنا۔

۶۔ سزا کا اصول

سزا کا اصول نظام آفرینش کے مسلمہ اصولوں اور دین مبین اسلام کی واضح تعلیمات میں سے ایک ہے۔ ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔

بقول شاعر

از مکافات عمل غافل مشو　　　گندم از گندم بروید جو ز جو

اللہ تعالی نے اس نکتے پر کافی زور دیا ہے کہ کوئی عمل بغیر جزاء و سزا یا پاداش کے نہیں ہوگا۔

ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ (۲)

پھر ہر شخص نے جو کچھ کیا ہوگا وہ اسے لوٹا دیا جائے گا اور (اس سلسلے میں) ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

---

(۱) سورہ ص / ۲۶۔

(۲) سورہ بقرہ / ۲۸۱۔

۷۔ توبہ اور تلافی

توبہ کا اصول بھی اسلام کے تعمیری اور انسان ساز اصولوں میں سے ایک ہے۔ توبہ خدا کی رضامندی کے حصول اور گذشتہ غلطیوں کی تلافی کا ذریعہ ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ محاسبہ کا اصول توبہ کے بغیر عبث اور بے فائدہ ہے، اسی لئے اللہ تعالی اپنے بندوں کو بار بار توبہ کا حکم فرماتاہے اور ان کو رحمت و مغفرت کی نوید سناتاہے۔

ارشاد ہوا:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا (۱)

(اے پیغمبر) آپ پیغام پہنچا دیجئے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے رحمت خداوندی سے مایوس نہ ہوں بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔

نفس کا محاسبہ احادیث کی روشنی میں

احادیث میں بھی محاسبہ نفس کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ یہاں ہم صرف ایک حدیث کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

حَاسِبُوا أَنفُسَكُمْ قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوا (۲) وَزِنُوا قَبْلَ أَنْ تُوزَنُوا وَتَجهزوا لِلْعَرضِ الأَكْبَرِ

اپنا حساب آپ کرو قبل اس کے کہ (اللہ کی طرف سے) تمہارا حساب لیا جائے اور (اپنے اعمال کو) تولو قبل اس کے کہ (اللہ کی طرف سے) تمہارے اعمال کا وزن کیا جائے اور اپنے آپ کو روز قیامت کے لئے آمادہ کرو۔

---

(۱) سورہ زمر / ۵۳۔

(۲) محاسبۃ النفس ۱۳۔

کن چیزوں کے بارے میں سوال ہو گا ؟

(۱) محبت اہل بیت

ایک حدیث میں رسول اللہؐ سے مروی ہے :

اَوَّلُ مَا یُسْئَلُ عَنْهُ الْعَبْدُ حُبُّنَا اَهْلَ الْبَيْتِ (۱)

سب سے پہلے بندے سے جس بارے میں سوال ہوگا وہ ہم اہل بیت کی ہے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے :

لَا تَزُوْلُ قَدَمَا عَبْدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ اَرْبَعٍ عَنْ عُمْرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ وَ عَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ كَسَبَهُ وَ فِيْمَا اَنْفَقَهُ وَ عَنْ حُبِّنَا اَهْلَ الْبَيْتِ (۲)

قیامت کے دن کوئی بندہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا جب تک اس سے چار چیزوں کے بارے میں سوال نہ کیا جائے ۔ ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کس چیز میں صرف کی ۔ دوسری یہ کہ اس نے اپنی جوانی کس مقصد کے لئے بسر کی ۔ تیسری یہ کہ اس نے اپنا مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا ۔ چوتھی ہم اہل بیت کی محبت کے بارے میں ۔

(۲) نماز

ایک اور سوال جو انسان سے کیا جائے گا وہ نماز کے بارے میں ہوگا ۔ ابوبصیر کا بیان ہے :

---

(۱) بحارالانوار ج ۷، ص ۲۶۰ ۔

(۲) بحارالانوار ج ۷، ص ۲۵۸ ۔

میں نے امام باقرؑ سے سنا کہ آپؑ نے فرمایا:

اوَّلَ مَا یُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ الصَّلاَةُ فَاِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ مَا سِوَاهَا (۱)

بندے سے جس چیز کے بارے میں سب سے پہلے بازپرس ہوگی وہ نماز ہے۔
پس اگر وہ قبول ہوجائے تو باقی اعمال بھی مقبول ہوں گے۔

بنابریں انسان کو چاہیئے کہ وہ اس سرمائے سے جو اللہ نے اسے دیا ہے بہترین طریقے سے استفادہ کرے اور اسے پروردگار کی اطاعت و عبادت میں صرف کرے۔

محاسبہ کی کیفیت:

محاسبہ کے سلسلے میں درج ذیل امور کی رعایت ضروری ہے۔

الف:۔ یہ جاننا چاہیئے کہ نفس امارہ اور خود غرضی جیسی جبلی خصلت انسان کو فریب دیتی ہے جس کے نتیجے میں برائیاں اس کی نظر میں اچھی معلوم ہوتی ہیں اور اچھی چیزیں بری معلوم ہوتی ہیں۔ بنابرین اپنا محاسبہ کرتے وقت انسان کو چاہیئے کہ وہ مکمل طور پر غیر جانبدار بن کر اور حب ذات کو بالائے طاق رکھ کر سوچے نیز ذرہ برابر چشم پوشی اور اغماض کے بغیر اپنے اعمال کی چھان بین کرے۔ رسول اللہؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لاَ یَکُوْنُ الْعَبْدُ مُؤْمِنًا حَتّٰی یُحَاسِبُ نَفْسَهُ اَشَدَّ مِنْ مُحَاسَبَةِ الشَّرِیْکِ شَرِیْکَهُ وَ السَّیِّدِ عَبْدَهُ (۲)

کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنا محاسبہ اس

---

(۱) بحار الانوار ج، ص ۲۵۸۔ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس قسم کے امور کو مقدم یا موخر رکھنا یعنی پہلے یا بعد میں ذکر کرنا سوال کے موضوع کی اہمیت کی نشاندھی کرتا ہے۔ قیامت کے دن جن چیزوں کے بارے میں سوال کیا جائے ان کے بارے میں مزید معلومات کے لئے بحار الانوار ج، ص ۲۵۳ اور دیگر متعلقہ کتب کی طرف رجوع کریں۔

(۲) سید ابن طاؤس کی کتاب محاسبۃ النفس ص ۱۴۔

محاسبے سے بھی زیادہ شدید انداز میں نہ کرے جو شریک اپنے شریک سے اور مالک اپنے غلام سے کرتا ہے۔

ب ۔ محاسبہ کرتے وقت پہلے واجبات اور محرمات کی جانچ پڑتال کرنی چاہیئے تا کہ یہ معلوم ہو کہ آیا خدا کے اوامر و نواہی کی مکمل طور پر رعایت ہوئی ہے یا نہیں ۔ اس کے بعد مستحب اور دیگر نیک کاموں کی چھان بین کی جائے ۔

ج ۔ مواخذے کا عمل ختم ہوجانے کے بعد اگر نتیجہ مثبت ہو تو خدا کا شکر ادا کریں اور اس سے مزید توفیق طلب کریں ۔لیکن اگر نتیجہ منفی ہو تو اللہ سے مغفرت طلب کرنی چاہیئے اور گذشتہ اعمال کی تلافی کے لئے کمر بستہ ہونا چاہیئے تا کہ نیک اعمال اور اچھائیوں کے ذریعے غلطیوں اور نواقص کا جبران کیا جاسکے ۔

اللہ تعالی فرماتا ہے :

اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ (۱)

نیک اعمال برائیوں کا خاتمہ کردیتے ہیں۔

امام ہفتم حضرت موسی بن جعفر علیہما السلام کا ارشاد ہے :

یَا هِشَام،لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یُحَاسِبْ نَفْسَهُ فِی کُلِّ یَوْمٍ فَاِنْ عَمِلَ حَسَناً اِسْتَزَادَ مِنْهُ وَ اِنْ عَمِلَ سَیِّئاً اِسْتَغْفَرَ اللهَ مِنْهُ وَ تَابَ اِلَیْهِ (۲)

(اے هشام اس شخص کا ہم سے کوئی تعلق نہیں جو ہر روز اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرے ۔ تاکہ اگر اس نے کوئی اچھا عمل انجام دیا ہو تو اس میں اضافے کی کوشش کرے اور اگر کوئی برا عمل انجام دیا ہو تو اللہ سے مغفرت طلب کرے اور اس کے حضور توبہ کرے ۔

---

(۱) سورہ ھود / ۱۱۴ ۔

(۲) تحف العقول ص ۲۹۲ ۔

محاسبہ نفس کو اہمیت نہ دینے کی وجوہات

پہلی وجہ:۔ خدا فراموشی اور خود فراموشی:

اس بات میں شک کی گنجایش نہیں کہ محاسبہ نفس جیسے اہم موضوع سے بے توجہی کا سرچشمہ خدا فراموشی ہے اور جو شخص اللہ کو بھول جائے وہ اپنے آپ کو بھی فراموش کردیتاہے اور جو شخص خود فراموشی کا شکار ہوجائے وہ ہوا و ہوس کا مطیع ہوتاہے جو شخص ہوا و ہوس کا تابع بن جائے وہ حقائق سے کوسوں دور جا پڑتاہے اور پھر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے سے عاجز ہوجاتاہے۔

قرآن فرماتاہے:

وَلاَ تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (۲)

ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو نتیجتاً اللہ نے ان کو اپنے وجود سے بیگانہ بنادیا یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو بھلا بیٹھے اور انسانیت و بندگی کے درجے سے نیچے آگئے۔

بہر حال خواہشات نفسانی اور اللہ کی یاد یکجا نہیں ہو سکتیں جس طرح نور ظلمت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔

ہوائے نفس خود بشکن خدا را   ہدہ رہ پیش خود صاحب ہوی را

دوسری وجہ:۔ خود فریبی اور بے جا امیدیں

ترک محاسبہ کی ایک اور وجہ خود فریبی ہے۔ مولا علیؑ قرآن کی آیت:

يَا اَيُّهَا الاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (۲)

اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے رب کریم کے بارے میں دھوکہ دیا۔

---

(۱) سورہ حشر / ۱۹۔

(۲) سورہ انفطار / ۶۔

کی تشریح میں فرماتے ہیں:

أَدْحَضُ مَسْئُولٍ حُجَّةً وأَقْطَعُ مُغْتَرٍّ مَعْذِرَةً لَقَدْ أَبْرَحَ جَهَالَةً بِنَفْسِهِ ...(1)

وہ انسان جس سے یہ سوال ہو رہا ہے اور جو خدا کے بارے میں دھوکہ کھا گیا ہے جواب دینے میں سب سے زیادہ عاجز اور وہ فریب خوردہ عذر پیش کرنے میں سب سے زیادہ قاصر ہے وہ اپنے نفس کو بڑی ڈھٹائی سے جہالت میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔

يَا أَيُّهَا الإِنْسَانُ مَا جَرَّأَكَ عَلَى ذَنْبِكَ وَمَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ وَمَا أَنَّسَكَ بِهَلَكَةِ نَفْسِكَ أَمَا مِنْ دَائِكَ بُلُولٌ أَمْ لَيْسَ مِنْ نَوْمَتِكَ يَقَظَةٌ أَمَا تَرْحَمُ مِنْ نَفْسِكَ مَا تَرْحَمُ مِنْ غَيْرِكَ (2)

اے انسان تجھے کس چیز نے گناہ کی جرات دی ہے؟ اور کس چیز نے تجھے اپنے پروردگار کے بارے میں دھوکا دیا ہے؟ اور کس چیز نے تجھے اپنی تباہی پر مطمئن بنادیا ہے؟ کیا تیرے مرض کے لئے شفا اور تیرے خواب (غفلت) کے لئے بیداری نہیں ہے؟ کیا تجھے اپنے اوپر اتنا رحم نہیں آتا جتنا تو دوسروں پر ترس کھاتا ہے؟

نتیجہ کلام

مذکورہ آیات و احادیث سے محاسبہ نفس کی اہمیت و ضرورت بخوبی واضح ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زندگی جیسے قیمتی سرمایہ کو کسی حساب کتاب کے بغیر ضائع کرنا ناقابل تلافی خسارے کا باعث ہے۔

---

(1) نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۲۲۳ نہج البلاغہ مفتی جعفر حسینؒ خطبہ نمبر ۲۲۰ مترجمی

(2) ایضاً سابقہ ماخذ کی طرف رجوع ہو۔

حضرت امام ہادیؑ فرماتے ہیں:

الدُّنیا سُوقٌ رَبِحَ فِیہَا قَومٌ وخَسِرَ آخرونَ (۱)

دنیا ایک بازار ہے جس میں کچھ لوگ فائدہ پاتے اور کچھ لوگ خسارہ اٹھاتے ہیں)

پس انسان کو چاہیئے کہ جب تک زندہ ہے اپنا محاسبہ کرتا رہے کیونکہ دنیا سے جانے کے بعد اس دنیا میں واپسی اور گذشتہ کی تلافی کے لیے موقع کی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔

جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے:

حَتّٰی اذا جآءَ احدَھُم الْمَوتُ قَالَ ربِّ ارجِعُونِ لَعَلِّیٓ اَعْمَلُ صَالحاً فِیْمَا تَرَکْتُ کَلاَّ انَّھا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَائِلُھَا وَ مِنْ ورآئِھِمْ بَرزَخٌ اِلیٰ یَومِ یُبْعَثُوْنَ (۲)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہتاہے اے میرے رب مجھے واپس لوٹا دے۔ شاید میں اب کوئی نیک عمل انجام دوں ہر گز نہیں یہ ایک بات ہے جو یہ کہہ رہا ہے اور ان کے پیچھے ایک عالم برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے۔

خسارہ کیا ہے؟

خسران یا خسارہ سے مراد اصلی سرمائے کا ختم ہونا ہے۔ وہ سرمایہ انسان کی زندگی ہے۔ جب بھی زندگی کا ایک لمحہ گزرتاہے اس سرمائے کا ایک حصہ تباہ ہوجاتاہے اور پھر واپس نہیں آتا مگر یہ کہ یہ سرمایہ عمل صالح، حق کی حمایت اور خدا کی راہ میں جہاد کی خاطر صرف ہوا ہو اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کا ہر وہ لحظہ جو غفلت کے ساتھ گذر جائے ناقابل تلافی ہے۔

---

(۱) بحارا الانوار ج ۷۵، ص ۳۶۶۔

(۲) سورہ مومنون / ۹۹ و ۱۰۰۔

خلاصہ یہ کہ قرآنی آیات اور احادیث میں محاسبہ نفس پر اس قدر تاکید کی وجہ یہ ہے کہ لوگ خواب غفلت سے بیدار ہوں اور اخروی زندگی (جو جاودانی ہوگی) کی خاطر زاد و توشہ تیار کریں ۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں :

عِبَادَ اللّٰہِ الآنَ فَاعْمَلُوا۔ وَالاَلْسُنُ مطلقۃ وَ الاَبْدانُ صَحِیحَۃ وَ الاَعْضاءُ لَدْنَۃ وَ الْمُنْقَلَبُ فَسِیحٌ وَ المَجَالُ عَرِیضٌ قَبْلَ اِرْهَاقِ الفَوْتِ وَ حُلُولِ المَوتِ ، فَحَقِّقُوا عَلَیْکُم نُزُولَہ وَ لاَ تَنْتَظِرُوا قُدومَہ (۱)

ترجمہ : اے خدا کے بندو ، ابھی سے ہی ہوشیار رہو کیونکہ ابھی تک تمہاری زبانیں آزاد، جسم سالم اور اعضاء و جوارح عمل کے لیے آمادہ ہیں ۔ رفت و آمد کی جگہ (عمل کے لیے دنیا) وسیع اور وقت بھی بہت ہے ۔ بیدار رہو کہ کہیں فرصت ہاتھ سے نہ چلی جائے اور موت کا لمحہ آپہنچے اجل کو مسلم طور پر واقع ہونے والی سمجھو نہ یہ کہ اس کے انتظار میں رہنے لگو (جس کی وجہ سے مقام عمل میں سستی اور تاخیر کے شکار ہوگے ۔

معاتبہ (یا اپنے اوپر تنقید)

جب انسان اپنا محاسبہ کرنے ، اپنے روزمرہ کے اعمال پر نظر ثانی کرنے ، اپنے ضمیر کی عدالت میں اپنے خلاف مقدمہ پیش کرنے سے فارغ ہو اور اپنے آپ کو خطا کار ٹھہرائے تو اس کے بعد معاتبہ یعنی اپنے اوپر تنقید کا مرحلہ آتا ہے ۔

اس مرحلے میں انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوکر اپنی سرزنش کرے تاکہ اس طرح نقائص کی تلافی کے لئے آمادہ ہوجائے ۔

---

(۱) نہج البلاغۃ فیض الاسلام خطبہ ۱۸۷ ۔ (نہج البلاغۃ مفتی جعفر حسین خطبہ ۱۹۴ ۔ مترجم)

محاسبہ کے لئے ضروی ہے کہ انسان اپنے عیوب پر نظر رکھے اور دوسروں کے عیوب بیان کر کے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مولا علیؑ نے فرمایا:

مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهُ وَقَفَ عَلَىٰ عُيُوبِهِ وَ اَحَاطَ بِذُنُوبِهِ وَ اسْتَقَالَ الذُّنُوبَ وَ اَصْلَحَ العُيُوبَ (1)

جو شخص اپنا محاسبہ کرے وہ اپنے عیوب سے آگاہ اور اپنے گناہوں سے باخبر ہوتا ہے ایسا شخص گناہوں سے جان چھڑانے اور عیوب کی اصلاح کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نیز فرمایا:

طُوبَىٰ لِمَنْ شَغَلَهُ عَيْبُهُ عَنْ عُيُوبِ النَّاسِ (2)

خوش نصیب ہے وہ شخص جس کے عیوب اسے دوسروں کے عیوب سے روکے رکھیں۔

یعنی وہ اپنے عیوب کی فکر میں اس طرح سے کھو جائے کہ اس کو دوسروں کے عیوب کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ ہو۔ یاد رہے کہ معاتبہ کے دو مرحلے ہیں:

1) اپنے اوپر تنقید کا مرحلہ

2) گذشتہ خطاؤں کی تلافی اور توبہ کا مرحلہ

پہلے مرحلے میں "نفس لوامہ" سے رہنمائی حاصل کرنے اور اپنی سرزنش و ملامت کرنے کی ضرورت ہے یہ مذمت اور تنبیہ کا مرحلہ ہے۔ اولیائے الٰہی اپنی تنبیہ اور تادیب کی خاطر اپنے اوپر پابندیاں اور سختیاں عاید کرتے تھے مثلاً شب بیداری، روزے، بھوک، کم گوئی، معصومینؑ سے مروی دعاؤں اور اذکار کا ورد، بندگان خدا کی خدمت، ان کو کھانا کھلانا اور انعام دینا اور ـــــ وغیرہ۔

---

(1) شرح غرر الحکم مطبوعہ دانشگاہ ج ۵ ص ۳۳۹ حدیث نمبر ۸۹۲۷۔

(2) شرح غرر الحکم مطبوعہ دانشگاہ ج ۵ ص ۴۳۶ حدیث نمبر ۹۱۔

تاکہ اس طرح وہ اپنے سرکش نفسوں کو مغلوب کرسکیں۔ جیساکہ امیرالمومنین ؑ نے فرمایا ہے:

مَنْ لَمْ یَسُسْ نَفْسَہُ اَضَاعَھا (۱)

جو شخص اپنے نفس کی نگہداری نہ کرے وہ اسے تباہ کردے گا۔

جناب آیت اللہ بروجردی رح کے بارے میں منقول ہے کہ جب بھی کسی طالب علم کے ساتھ سخت الفاظ استعمال کرتے تو اس سے عذرخواہی کرنے کے علاوہ اس کام کی تلافی کی خاطر دوسرے دن روزہ رکھنے کی نذر بھی کرتے تھے۔

اس طرح کی تنبیہ و تادیب معصومین ؑ کی سیرت اور شریعت کے معیاروں کے عین مطابق ہے۔ احادیث میں نفس کی تادیب و تنبیہ کے لئے اس سے مشابہ مثالیں ملتی ہیں۔

رہا بعض اہل تصوف اور عرفا کے بارے میں منقول طرز عمل کہ وہ اپنی تنبیہ اور سرزنش کے لئے اپنے آپ کو آگ سے جلاتے تھے یا مشکل اور انسان کی شان کے منافی افعال کے مرتکب ہوتے تھے یا لوگوں سے کنارہ کشی کرتے تھے یا زندگی بھر خاموش رہنے کا طریقہ اختیار کرتے تھے تو یہ وہ امور ہیں جو شرعی تعلیمات کے دایرے سے خارج اور صاحبان وحی کی سیرت سے کوسوں دور ہیں۔ کتاب و سنت میں ان کاموں کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔

رہا دوسرا مرحلہ جو توبہ و استغفار اور گناہوں کی تلافی سے متعلق ہے تو اس کے بارے میں ہم قبل ازین مفصل بحث کرچکے ہیں (۲)

---

(۱) فہرست غرر ص ۳۸۹ نمبر ۸۱۹۳۔

(۲) یہاں یہ سوال ہو سکتاہے کہ توبیخ و سرزنش کے مرحلے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوئی ٹھیک دلیل موجود نہیں کیونکہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتاہے کہ اگر چہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں لیکن تنقید و سرزنش کے مرحلے کو توبہ پر تقدم حاصل ہے کیونکہ جب تک انسان اپنے اوپر تنقید نہ کرے وہ توبہ و استغفار کے لئے آمادہ نہیں ہوگا۔ واللہ العالم۔

تیرھواں نکتہ

نیت و اخلاص کی بحث
اور شرک و ریا اور منافقت
سے پرہیز

نیت یا روح عمل

چونکہ اخلاق اسلامی کی بنیاد تزکیہ نفس اور معنوی بنیادوں کی تقویت نیز روحانی خوبیوں اور بلند انسانی اقدار پر رکھی گئی ہے لہذا تمام قلبی اور جسمانی اعمال خاصکر عبادات کی جڑ نیت ہے، نیت اس قدر موثر ہے کہ اگر کوئی جائز عمل جو عبادت نہ ہو لیکن اسے خدائی قصد کے ساتھ اور قرب خداوندی کے حصول کی خاطر انجام دیا جائے تو وہ عبادت اور اجر و ثواب کا موجب بنتا ہے مثال کے طور پر اگر ہم اس نیت سے کھانا کھائیں یا آرام کریں کہ اچھی غذا کھاکر اور مناسب استراحت کر کے بہتر طور پر عبادت کر سکیں گے یا لوگوں کی بہتر خدمت کر سکیں گے تو ہمارا یہ کھانا اور آرام کرنا عبادت محسوب ہوں گے حالانکہ اس قسم کے اعمال ذاتی طور پر عبادت نہیں ہیں۔ بنابریں یہ کہنا بجا ہے کہ نیت عمل کی روح اور جان ہے دوسرے لفظوں میں اسلام نے جس چیز کو اہمیت دی ہے وہ عمل کا باطنی اور معنوی پہلو ہے اعمال کی قبولیت اور قدر و قیمت کا دارومدار نیت پر ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

انّما الاَعمَالُ بِالنّیّاتِ وَ انّما لکُلِّ امرِء مّا نوىٰ فَمَن کَانَت هِجرَتُهُ الی اللهِ وَ رَسُولِه فهجرَتُهُ اِلَی اللهِ وَ رَسُولِهِ وَ مَن

كانت هجْرَ تُه لِدُ نيـا يُصيبُهـا اَ و امـرَ اِۃٍ يَتزَوَّ جُهـا فَهجرتُـه الىٰ مـا هَاجَـرَ اليـهِ [1]

اعمال کا دار و مدار بس نیت پر ہے۔ اور ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہو۔ پس جو شخص اللہ اور رسول کی خاطر ہجرت کرے۔ اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہوگی اور جس شخص کی ہجرت حصول دنیا کی خاطر ہو یا کسی عورت سے شادی کی خاطر تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہوگی۔

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللهَ يَحْشُرُ النَّـاسَ عَلىٰ نِيَّاتِهـم يَـوْ مَ الْقِيامَـةِ [2]

یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی نیتوں کے مطابق محشور فرمائے گا۔

نیت اور ابدیت

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس بارے میں کہ اہل جہنم کس بناء پر ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور اہل بہشت کس وجہ سے ہمیشہ جنت میں رہیں گے منقول ہے:

اِنّما خُلِّـدَ اهل النّارِ لاَ نَّ نِيّاتِهـمْ كَانَتْ فِى الدُّ نيا اِنْ لَوْ خُلِّدوا فِيْها اَنْ يَعْصُوا الله ا بَدَ اً وَ اِ نّما خُلِّـدَ اهلُ الْجَنَّـةِ فِى الْجَنَّةِ لاَنَّ نيّاتِهم كَانَتْ فِى الدُّ نْيَـا اِنْ لَوْ بَقـو فِيْهَا اَنْ يُّطيعُوا الله ابدا فَبِالنّيّاتِ خُلِّد هٰؤلاء و هٰؤلاء ثُمَّ تَلاقوله تَعَالىٰ قُلْ كُلٌّ يَعْمَل عَلىٰ شَاكِلَتِهِ [3]

اہل دوزخ اس بنا پر ہمیشہ کے لئے دوزخی قرار پائیں گے کیونکہ دنیا میں ان کی نیت یہ تھی کہ اگر انہیں ہمیشہ کے لئے دنیا میں رکھا جائے تو وہ ہمیشہ اللہ کی نافرمانی کرتے رہیں گے اور اہل جنت اس بناء پر ہمیشہ کے لئے جنتی قرار

---

(۱) سنن ترمذی ج ۴ ص ۱۷۹ کتاب فضائل الجہاد باب ۱۶۔

(۲) وسائل الشیعہ، مطبوعہ الاسلامیہ ج ۱ ص ۳۴۔

(۳) اصول کافی ج ۲ ص ۸۵، وسائل الشیعہ ج ۱ ص ۳۶۔

پائیں گے کیونکہ دنیا میں ان کا ارادہ یہ تھا کہ اگر وہ ہمیشہ کے لئے دنیا میں باقی رہیں تو وہ ہمیشہ اللہ کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ پس یہ دونوں گروہ اپنی اپنی نیّتوں کی بناء پر (جنت یا جہنم میں) ہمیشگی حاصل کریں گے۔

اس کے بعد آپؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

(اے رسولؐ) کہہ دیجئے کہ ہر کوئی اپنی خصلت کے مطابق عمل کرتا ہے۔

ثواب و عقاب میں نیت کی تاثیر:

نیت اس حد تک موثر ہے کہ انسان کسی گروہ کی محض طرفداری کی بناء پر ان کے ثواب و عقاب میں شریک قرار پائے گا۔ جب اللہ تعالی نے امیر المومنین حضرت علیؑ کو جنگ جمل میں کامیاب فرمایا تو آپؑ کے ساتھیوں میں سے کسی نے آپؑ سے عرض کیا کہ کس قدر بہتر ہوتا اگر میرا بھائی ہمارے ساتھ ہوتا وہ دشمن پر آپ کی فتح کا مشاہدہ کرتا اور اس جہاد کی فضیلت میں شریک ہوتا۔ یہ سن کر امامؑ نے فرمایا:

اَهَـوىٰ اخِيکَ مَعَنَـا ؟ فَقَالَ نَعَـمْ قَالَ فَقَـدْ شَهِدَ نَا وَ لَقَدْ شَهِدنَـا فِیْ عَسْکَرِ نَـا هَـذا اَقْـوام فِـی اَصْلَابِ الـرّجالِ وَ اَرْحَـامِ النِّسَـاء سَیَرْعَـفُ بِهِـمُ الـزَّمانُ وَ یَقْویٰ بِهِـمُ الاِیْمَـانُ (۱)

امامؑ نے فرمایا: کیا تمہارا بھائی ہمارا طرفدار ہے؟ اس نے عرض کیا، ہاں۔ فرمایا، پس وہ ہمارے ساتھ شریک تھا۔ بلکہ ہمارے اس لشکر میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو مردوں کے صلب میں اور عورتوں کے شکم میں موجود ہیں (اور ہمارے طرفدار ہیں) زمانے کی گردش عنقریب انہیں ظاہر کرے گی اور ان سے ایمان کو تقویت ملے گی۔

---

(۱) نہج البلاغۃ فیض الاسلام خطبہ ۱۲۔

انسان کی شخصیت سازی میں نیت کا کردار

جس طرح عمل کی کیفیت اور قدر و قیمت نیت پر موقوف ہے اسی طرح انسانی شخصیت کی تعمیر میں بھی نیت کا اہم کردار ہے ۔ اگر ہم لوگوں کی شخصیتوں کے درجات کو پہچاننا چاہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ان کے اہداف و مقاصد اور ارادوں کی روشنی میں ان درجات کی جستجو کریں ۔ کیا وہ شخص جو فقط اپنی شکم پُری کے لئے جد و جہد کرتا ہے اس شخص کے مساوی ہوسکتا ہے جو لوگوں کی فلاح و نجات کے لئے کوشاں ہوتا ہے ؟ کیا وہ شخص جو مال غنیمت کی خاطر محاذ جنگ پر جاتا ہے اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو رضائے الٰہی کی خاطر جنگ کرتا ہے ؟ ۔ ان دونوں کا مساوی ہونا یا نہ ہونا ان کے اعمال پر موقوف نہیں بلکہ ان کے ارادوں ، عزائم اور ان کی معنوی کیفیت پر موقوف ہے ۔ ان دونوں کے اعمال بظاہر یکساں ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں کا نعرہ ایک ہے اور دونوں نے جنگ کی ہے لیکن اگر کوئی فرق ہے تو ان کی نیتوں میں ہے ۔ اس کسوٹی اور معیار کی بنیاد پر حضرت امام جعفر صادقؑ لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم فرماتے ہیں اور ہر گروہ کی مقصد عبادت کے لحاظ سے الگ الگ توصیف فرماتے ہیں:

آپ فرماتے ہیں :

اِنَّ الْعُبَّادَ ثَلاَثَۃ ۔ قَوم عَبَدُوا اللہ عَزَّوَجَلَّ خَوفاً فَتِلْکَ عِبادَۃُ الْعَبِیدِ وَ قَوْم عَبَدُوا اللہَ تَبارَکَ وَ تعالیٰ طَلَبَ الثَّوابِ فَتِلْکَ عِبادَۃُ الأُجَرَاءِ وَ قَوْم عَبَدُوا اللہ عَزَّوَجَلَّ حُباً لَه فَتِلْکَ عِبادَۃُ الاَحْرارِ وَ هِیَ اَفْضَلُ الْعِبادَۃِ (۱)

---

(۱) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج ۷۰ ص ۲۵۵ نیز اصول کافی ج ۲ ص ۸۴ ۔

یعنی عبادت کرنے والے تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو اللہ کے خوف سے اس کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کی عبادت غلاموں والی عبادت ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ثواب کے لالچ میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت مزدوروں والی عبادت ہے۔ تیسرے وہ جو اللہ کی محبت میں اس کی عبادت کرتے ہیں یہ آزاد منش انسانوں کی عبادت ہے اور یہ سب سے افضل عبادت ہے۔

اعتقادی، ثقافتی، سماجی اور قومی تعلقات میں نیت کا کردار

نیت جس طرح انسان کی انفرادی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے اسی طرح اعتقادی، سماجی اور قومی روابط کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بھی اس بات کی طرف کئی اشارے ملتے ہیں جن کو ہم مجموعی طور پر تین جملوں میں بطور خلاصہ بیان کر سکتے ہیں۔

۱۔ جو شخص کسی کے کام سے راضی ہو وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے یہ کام کیا ہو۔

۲۔ جو شخص کسی گروہ کے عمل سے راضی ہو اس کا شمار بھی اسی گروہ میں ہو گا۔

۳۔ جو شخص کسی جماعت کا طرفدار ہو وہ ان کے ثواب اور عقاب میں بھی شریک ہو گا۔

امام علیؑ سے اس بارے میں ایک جامع اور قابل غور جملہ منقول ہے جو مذکورہ تین باتوں کو شامل کرتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

اِنَّمَا یَجْمَعُ النَّاسَ الرِّضَا وَ السُّخْطُ ...... (۱)

---

(۱) نہج البلاغہ فیض الاسلام خطبہ ۱۹۲۔

یعنی اگر چہ لوگ مختلف کاموں میں مشغول ہیں اور زندگی کے آداب و رسوم کے لحاظ سے مختلف ہیں لیکن ایک چیز ہے جو ان کو ایک ہی لڑی میں پروتی ہے اور انہیں ایک ملت ، جماعت یا گروہ کی شکل دیتی ہے وہ ہے ان کی خوشنودی اور عدم خوشنودی یعنی عقیدے، مقاصد اور اہداف میں ان کی ہماہنگی ۔ یہ اصول ایک اجتماعی خصوصیت کی عکاسی کرتا ہے جو عقیدہ و نظریات اور عمل کے لحاظ سے لوگوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے۔ اور لوگوں میں اجتماعی، ثقافتی اور قومی وحدت پیدا کرتا ہے ۔

اس مقام پر درج ذیل چند نکات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

۱ ۔ خوشنودی اور عدم خوشنودی سے مراد وقتی اور ظاہری خواہشات نہیں جو وقتی جذبات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں اور جلد ہی زائل ہوتی ہیں بلکہ اس سے مراد وہ رجحانات ہیں جو ایک قسم کے فکری اور نظریاتی ارتباط اور مفادات کے اشتراک کی نشاندہی کرتے ہیں یعنی وہ میلانات جو انسان اور اس کے کردار و رفتار پر اثر انداز ہوں اور اسے اپنے جیسے لوگوں کا ہم خیال بنادیں۔

اس قسم کے گہرے رجحانات کا اثر انسان کے اعمال پر اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ اگر مواقع میسر اور موانع برطرف ہوں تو انسان فورا اس قسم کے لوگوں کی صف میں شامل ہوجاتا ہے اور وہی کام کرتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ جو شخص دوسروں کے عمل کو پسند کرتا ہو اگر چہ اس نے اس عمل میں شرکت اور تعاون نہ کیا ہو اور وقتی طور پر خود اس عمل کا ارادہ بھی نہ رکھتا ہو لیکن اس کے باوجود اس عمل سے اس کا لگاؤ اس کے دل کی گہرائیوں میں اسطرح ہے جیسے راکھ میں چھپی ہوئی چنگاری جو اچانک سارے ماحول کو آگ کے شعلوں میں تبدیل کر سکتی ہے ۔ یعنی اگر حالات سازگار ہوں تو وہ بھی اس عمل کو اسی نیّت کے ساتھ انجام دے گا۔

۲۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ قانونی نقطہ نظر سے اس قسم کی تابعیت عدل و انصاف کے برخلاف ہے اور قرآن کریم صریحاً کہتا ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۱)

کسی شخص کو دوسرے فرد کے جرم کی سزا نہیں ملے گی۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (۲)

ہر شخص اپنے اعمال کے ہاتھوں گرفتار ہے۔

علاوہ ازیں قانون کی رو سے جرم کے ارتکاب کا ارادہ جرم محسوب نہیں ہوتا، پس یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی قسم کے عملی اقدام کے بغیر اور صرف دوسروں کے کام سے راضی ہونے کی بناء پر کسی شخص کو دوسروں کے اعمال کی سزا ملے؟

اس سوال کے جواب میں یہ کہنا چاہیئے: اگر چہ قانونی نقطہ نظر سے گناہ کی نیت جرم نہیں ہے اور دوسروں کے عمل سے صرف قلبی طور پر راضی ہونا جرم یا اعانت جرم کی حیثیت سے قابل مواخذہ و عقاب نہیں ہے لیکن یہاں ہماری بحث ان اخلاقی و معاشرتی اثرات و نتائج سے ہے جو اس قلبی کیفیت کی وجہ سے طبعی طور پر ہر صورت میں مرتب ہوتے ہیں بطور مثال جو شخص کسی دوسرے کو قتل ہوتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے یقینی طور پر اس کی باطنی خصلت اس شخص کے قاتل سے ملتی جلتی ہے اور وہ اس کا ہم خیال ہے، اور اس لحاظ سے اس کے اور قاتل کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اگر چہ اس نے عملی طور پر قاتل کے ساتھ تعاون نہیں کیا ہے؟ اور نہ ہی وہ قتل کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس قسم کے کاموں کے فطری اور طبعی اثرات قانون فطرت کے تحت پورے

---

(۱) سورہ اسراء / ۱۵۔

(۲) سورہ مدثر / ۳۸۔

پورے معاشرے پر مرتب ہوکر رہتے ہیں اور معاشرے کے بعض افراد ان اثرات سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ فتح و شکست، بلا و نعمت، قحط و خوشحالی اور اس قسم کے واقعات و حادثات معاشرے کے افراد کو چھانٹ کر الگ نہیں کرتے بلکہ ان سب کو ایک ساتھ نعمت یا مشکل سے دوچار کرتے ہیں۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ اتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ...... (۱)

اس فتنے سے بچو جو تم میں سے صرف ظلم کرنے والوں کو لاحق نہیں ہوگا (بلکہ سب کو آلے گا)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ (۲)

اور ان لوگوں کو اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ اگر وہ خود اپنے بعد ضعیف اور ناتوان اولاد چھوڑ جاتے تو کس قدر پریشان ہوتے (کہ کہیں وہ دوسروں کی بے مہری کا شکار نہ ہو جائیں)۔

ملاحظہ ہو کہ لوگوں کی بے مہری کا منفی اثر مستقبل میں ان کی اولاد پر کس طرح مرتب ہوتا ہے حالانکہ اولاد کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہ ایک فطری قانون ہے جو کائنات کے نظام میں ایک ناقابل تغیر اصول کے طور پر جاری و ساری ہے۔ قانون فطرت یا فطرت کا عدالتی نظام عام انسانی عدالتوں کے قوانین سے مختلف ہے۔ اس عدالت کے ہاں حق اور عدل کا تصور عام انسانی عدالتوں کی نسبت کہیں زیادہ وسیع اور عمیق ہے۔

---

(۱) سورہ انفال / ۲۵۔

(۲) سورہ نساء / ۹۔

۲۔ وہ کام جن سے لوگ راضی ہوں دو طرح کے ہوسکتے ہیں:

۱ - انفرادی کام

۲ - اجتماعی کام

انفرادی کام سے مراد وہ عمل ہے جس میں صرف ایک شخص کی خواہش کو عمل دخل حاصل ہو اور عام لوگوں کے ارادوں کا مثبت یا منفی ہونا اس شخص کی خواہش کے ساتھ کوئی سرو کار نہ رکھتا ہو۔ اس کے برعکس اجتماعی کام سے مراد وہ عمل ہے جس میں اجتماعی ارادہ و خواہش کار فرما ہو اگر چہ اس کام کو ایک شخص انجام دے۔ مثال کے طور پر حضرت صالحؑ کی اونٹنی کی کونچیں کاٹنے اور اسے مارڈالنے والا ایک شخص تھا لیکن چونکہ عام لوگوں کی رضایت مرضی بھی اس کام میں شامل تھی لہذا اللہ تعالی اس عمل کو پوری قوم ثمود کی طرف نسبت دیتاہے اور فرماتاہے:

فَعَقَروها فَدَمدَمَ عَلَيهِم رَبُّهُم بِذَنبِهِم فَسَوّيها (۱)

ان لوگوں نے اس (اونٹنی) کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان سب پر عذاب نازل کردیا۔

بنابریں اجتماعی کاموں میں تابعیت کے لئے جسمانی طور پر حاضر ہونا اور عملی تعاون ضروری نہیں بلکہ فقط عقیدہ و نیت کا اشتراک اور باطنی رضامندی کافی ہے کیونکہ اجتماعی امور میں کسی کام کا انجام دینے والا گویا لوگوں کی نمایندگی کرتے ہوئے اور ان کے سہارے اور حمایت سے اس کام کو انجام دیتاہے اور در حقیقت ان سب کی خواہشات کو عملی جامہ پہناتاہے۔ اگر معاشرے کے دوسرے افراد راضی نہ ہوتے تو ایک شخص کے لئے اس کام کا انجام دینا ممکن نہ ہوتا یہی وجہ ہے کہ ایک شخص کا کام حقیقت میں معاشرے کے افراد کا

---

(۱) سورہ والشمس / ۱۴۔

کام محسوب ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے اس قسم کی مشارکت کے لئے وقت یا جگہ کا ایک ہونا بھی شرط نہیں بلکہ اس مشارکت میں آیندہ آنے والے اور گذشتہ لوگ موجودہ لوگوں کے مساوی ہیں۔

جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

الـرَّاضي بِفعْلِ قَـوْم كَالـدّاخِلِ فِيـهِ مَعَهُمْ (۱)

کسی گروہ کے کام سے راضی ہونیوالا اس کام میں شریک افراد کی طرح ہے۔

انفرادی کاموں میں مسئلہ تھوڑا دشوار نظر آتا ہے کیونکہ جب ہم یہ فرض کرلیں کہ کسی فرد کے کام میں دوسروں کی خوشنودی یا عدم خوشنودی سے کوئی اثر نہیں پڑتا تو پھر یہ خوشنودی اس کام کا ارتکاب کیوں محسوب ہو؟

اس سوال کا جواب گذشتہ باتوں کی روشنی میں تلاش کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہم عرض کرچکے کہ اشتراک و تابعیت میں بنیادی حیثیت اس کام کے بارے میں خوشنودی یا عدم خوشنودی سے ہے جو کام کے انجام دینے والے اور اس کام سے راضی و خوشنود ہونے والے کے درمیان ایک قسم کے روحانی و فکری رابطہ و یگانگت کی عکاسی کرتی ہے۔ اس لحاظ سے انفرادی اور اجتماعی کاموں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا یعنی جس طرح ملت کے افراد کے درمیان اس طرح کا ارتباط ایک قسم کی فکری و نظریاتی یگانگت و ہم آہنگی کی دلیل ہے اسی طرح انفرادی کاموں کا بھی یہی حال ہے۔ البتہ ان دونوں میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ انفرادی کاموں میں تابعیت اور فکری اشتراک کا دائرہ اجتماعی کاموں کی نسبت محدود ہوتا ہے۔

---

(۱) فہرست غرر الحکم ص ۱۴۰۔

۴۔ چوتھا نکتہ نیت کے روحانی و اخلاقی اثرات سے مربوط ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ محبتیں، نفرتیں اور اچھے یا برے میلانات انسان کی روحانی اور معنوی تعمیر میں مثبت یا منفی اثرات مرتب نہ کریں اور انسان کی خوش بختی یا بد بختی کا پیش خیمہ ثابت نہ ہوں۔ امام صادقؑ سے کسی نے پوچھا کہ آیا حُب و بغض کا تعلق ایمان سے ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا:

وَ هَلِ الاِیمانُ اِلاّ الحُبُّ وَ البُغضُ ؟[1]

کیا ایمان حبّ و بغض کے علاوہ کوئی اور شی ہے؟

یہ حدیث اگر چہ حب و بغض کے بارے میں آئی ہے لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ ہوچکا حب و بغض اور نیت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں اور ان کے احکام و آثار مشترک ہیں کیونکہ نیت، حب و بغض کی علامت ہے، حب و بغض ایمان کی علامت ہے، ایمان نظریہ و عقیدہ کا عکاس ہے، عقیدہ شاکلہ سے عبارت ہے اور شاکلہ انسان کی باطنی کیفیت اور اس کا طرہ امتیاز ہے جو اسے دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتا ہے۔ پس در حقیقت نیت اس ہیئت ترکیبی کا ایک جزء ہے۔

۵۔ علم اصول کے علماء "تجری" کی بحث میں فرماتے ہیں کہ گناہ کی نیّت اگر عمل پر منتہی نہ ہو تو معاف ہے اور اس کے لئے کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا۔ اس نظرئے کے حامی حضرات اپنے دعوے کے حق میں بطور دلیل بعض احادیث نقل کرتے ہیں جو علم اصول الفقہ کی کتابوں اور احادیث کے بنیادی مآخذ میں مذکور ہیں[2]

سوال:۔ کیا یہ دعویٰ پہلے بیان کی ہوئی اس بات کے منافی نہیں کہ اچھائی اور برائی کا دارومدار نیت پر ہے اور دوسرے لوگوں کے اعمال پر دل سے راضی ہونا انسان کو ان لوگوں کے ثواب یا عقاب میں شریک بنا دیتا ہے؟

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۱۲۵۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۴۲۸ نیز وسائل الشیعہ ج ۱ ص ۴۱۔

جواب:۔ اس سوال کے جواب میں مسلمان دانشوروں نے درج ذیل توجیہات پیش کی ہیں:

الف:۔ تجری (گناہ کا ارادہ) کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت میں یہ کہ عمل سے پہلے آدمی پشیمان ہوجائے اور باطنی عوامل کے باعث نیز اپنے اختیار سے گناہ کے ارتکاب کا ارادہ چھوڑ دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انسان عمل کی انجام دہی کے لیے آگے بڑھے لیکن بیرونی رکاوٹیں اسے انجام دہی سے روک دیں۔ پہلی صورت میں (گناہ کی نیت) میں بخشش ہوسکتی ہے کیونکہ پشیمانی اور گناہ کا ارادی چھوڑنا اس کے باطن کی پاکیزگی اور تطہیر روحی کی علامت ہے۔

دوسری صورت میں آدمی بخشا نہیں جاتا کیونکہ جو شخص گناہ کی حدود میں داخل ہوجائے وہ باغی طبیعت اور اپنے پروردگار سے بے پروائی کے باعث مذمت اور سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ شخص اپنے ارادے سے گناہ کے ارتکاب سے باز نہیں آیا ہے بلکہ بیرونی اسباب و عوامل نے اس کو گناہ کا موقع نہیں دیا۔

ب:۔ تجری (گناہ کا ارادہ) گاہے صرف ارادے کی حد تک ہے اور گاہے اقدام پر منتہی ہوتی ہے یعنی وہ شخص ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری اقدام بھی کرتا ہے۔ (اگر چہ ابتدائی تیاری ہی سہی)۔ پہلی صورت بطور گناہ نامہ اعمال میں درج نہیں ہوتی لیکن دوسری صورت حرام ہے اور اس صورت میں آدمی مذمت اور سزا کا حقدار ٹھہرتا ہے۔

۶۔ اخلاقی معیار کی رو سے اگر چہ عمل بھی موثر ہے لیکن بنیادی حیثیت نیت اور ارادے کو حاصل ہے۔ اس کے برعکس قانونی معیاروں کی رو سے عمل کو بنیادی حیثیت اور نیت کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے[1]

---

(۱) یاد رہے کہ قانونی مسائل میں نیت کو ثانوی حیثیت تب حاصل ہوگی جب نیت عمل پر منتج نہ ہو۔ لیکن اگر نیت عمل پر منتج ہو تو بہت سے امور میں بنیادی حیثیت نیت کو حاصل ہوگی۔

مثلاً اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو ذاتی دشمنی کی بناء پر قتل کردے اور اس کے بعد معلوم ہوجائے کہ مقتول کا خون مباح تھا تو یہاں قانونی نقطہ نظر سے قاتل دیت یا قصاص وغیرہ سے بری ہوگا لیکن اخلاقی اصولوں کی رو سے ایسا شخص مذمت، ملامت اور سزا کا مستحق ہے کیونکہ اگر چہ یہ عمل بذات خود قباحت نہیں رکھتا لیکن فاعل قابل مذمت اور قبیح ٹھہرے گا بنابریں قاتل مذمت، تنبیہ اور تادیب کا مستحق ہوگا۔

بعض علماء اس قسم کا اقدام کرنے والے کو تعزیر اور اور تادیب کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ شاید ان کی مراد اخلاقی اور تربیتی نقطہ نظر سے ہو نہ کہ قانونی نقطہ نظر سے یاد رہے کہ اسلامی فقہ کے اندر قانونی اور اخلاقی امور کا ایسا اختلاط ایک فطری بات ہے کیونکہ اسلامی قوانین اور اسلامی اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں اخلاقی اور قانونی مسائل کے درمیان فرق واضح ہو جاتاہے اور معلوم ہوجاتاہے کہ اخلاقی حرمت اور وجوب کا مفہوم شرعی حرمت و وجوب سے علیحدہ نہیں [1] البتہ واضح رہے کہ صرف ایک نکتہ اخلاقی حرمت و وجوب کو شرعی (قانونی) حرمت و وجوب سے الگ کرتا ہے اور وہ حکم کی حیثیت ہے نہ کہ اصل حکم۔

بنابریں ممکن ہے کہ ایک چیز اخلاقی لحاظ سے حرام ہو لیکن قانونی (فقہی) نقطہ نظر سے حرام نہ ہو اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ اخلاقی وجوب و حرمت اور شرعی وجوب و حرمت کے اپنے الگ الگ آثار ہیں۔

---

(۱) یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اگر ہم اس کے بارے میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اخلاقی فرائض سے کوتاہی مستحب امور کے ترک کرنے کے مساوی نہیں جیساکہ عام طور پر کہا جاتاہے سوائے اس صورت کے کہ اخلاقی مستحبات ہی کی بات ہو کیونکہ اخلاق کے اندر بھی فقہ کی طرح مستحبات اور واجبات دونوں پائے جاتے ہیں۔

بنابریں جو شخص کسی مظلوم کے قتل سے راضی ہو وہ اخلاقی نقطہ نظر سے قتل کے عمل میں شریک محسوب ہوگا یعنی خدا کی بارگاہ میں وہ جوابدہ ہوگا۔ اگر چہ قانونی (فقہی) نقطہ نظر سے وہ قتل میں شریک نہیں کہلائے گا۔

اللہ تعالی فرماتاہے:

وَ انْ تُبْدُوا مَا فِیْ انفسکم او تُخْفُوا یُحاسبکم به اللّٰه...... (۱)

تم اپنے دل کی بات کو خواہ ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے حساب لے گا۔

خلاصہ یہ کہ قلبی رحجانات اور عزائم بھی انسان کے اعمال کا حصہ شمار ہوں گے اور خدا کے حضور ان کا حساب لیا جائے گا۔ بعض احادیث میں منقول ہے کسی کے گناہ سے راضی ہونے والے کے لئے ایک گناہ اور گناہ کا ارتکاب کرنے والے کے لئے دو گناہ لکھے جائیں گے۔

اس حدیث سے مراد بظاہر یہ ہے کہ گناہ کا ارتکاب کرنے والا گناہ پر زیادہ راضی ہے جبکہ اس عمل کو پسند کرنے والا صرف قلبی طور پر گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اقدام کرنے والا قلبی اور عملی دونوں پہلوؤں سے گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ بنابریں اس کی سزا بھی زیادہ ہونی چاہیئے۔

قرآن مجید سے چند مثالیں

قرآن مجید بنی اسرائیل کے بارے میں کہتاہے:

وَ اذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِنْ آلِ فِرعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوء العَذَاب یُذَبِّحُونَ ابناء کم وَ یَسْتَحْیُونَ نِسَاءَ کُمْ وَ فِی ذٰلِکُمْ بَلاء مِنْ رَبِّکُمْ عَظیم (۲)

---

(۱) سورہ بقرہ / ۲۸۴۔

(۲) سورہ بقرہ / ۴۹۔

اور یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعون والوں کے شر سے نجات دی جو تمہیں بدترین طریقے سے اذیت دیتے تھے ۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (کنیز بنانے کے لئے) زندہ رکھتے تھے ۔ اس میں تمہارے لئے پروردگار کی طرف سے زبردست آزمایش تھی ۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے :

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنَاکُمْ وَ اَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۱)

اور (یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو شگافتہ کیا اور تمہیں نجات دی اور فرعون والوں کو غرق کیا جبکہ تم (یہ منظر) دیکھ رہے تھے ۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے :

اَلَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَا اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُهُ النَّارُ۔ قُلْ قَدْ جَاءَکُمْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِی بِالْبَیِّنَاتِ وَ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ (۲)

جن لوگوں نے کہا اللہ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر تب تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ لے آئے جسے آگ (آسمانی بجلی) کھا جائے ۔ کہئے مجھ سے پہلے تمہارے پاس روشن دلائل کے ساتھ اور تمہاری فرمایشات کے ہمراہ رسل آچکے ہیں۔ پس اگر تم سچے تھے تو ان کو قتل کیوں کیا ؟

---

(۱) سورہ بقرہ / ۵۰ ۔

(۲) سورہ آل عمران / ۱۸۳ ۔

سوال :- یہ سوال رسول اللہؐ کے دور کے یہودیوں سے کیوں کیا گیا جبکہ وہ اس قسم کے کسی عمل کے مرتکب نہیں ہوئے تھے؟ اللہ نے کس بناء پر مذکورہ اعمال کی خاطر ان لوگوں کی سرزنش فرمائی؟

جواب :- چونکہ رسول اللہؐ کے دور کے یہودی اپنے آباء و اجداد کے اعمال پر راضی اور خوش تھے۔ لہذا وہ ان کے اعمال میں شریک اور ان کے گناہوں میں حصہ دار بھی تھے [(۱) و (۲)]

مومن اور کافر کی نیت

حدیث ہے:

نِيَّـةُ الْمُؤمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ و نِيَّـةُ الْكَافِرِ شَرٌّ مِنْ عَمَلِه. [(۳)]

مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے اور کافر کی نیت اس کے عمل سے زیادہ بری ہے۔

سوال :- نیّت کیونکر عمل سے بہتر یا بدتر ہو سکتی ہے حالانکہ نیت عمل کا پیش خیمہ ہے اور اصلی مقصود جو اچھے یا برے آثار و نتائج کا حامل ہوتا ہے وہ عمل ہے؟ اگر نیت عمل سے بہتر ہے تو پھر ہم دن میں ہزار بار جہاد، شہادت، ایثار، انفاق فی سبیل اللہ، اور شب بیداری کی نیت کر کے عمل سے بے نیاز رہیں گے اور یہ دلیل پیش کریں گے کہ نیت عمل سے بہتر ہے۔

---

(۱) تفسیر المیزان ج ۴ / ص ۸۹۔

(۲) فخرالدین رازی کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ کے دور کے یہودیوں اور انبیاء کو قتل کرنے والے یہودیوں کے درمیان سات سو سال کا فاصلہ ہے۔

(۳) وسائل الشیعہ ج ۱۱ ص ۴۱۱۔

جواب :۔ **الف.** نیت سے مراد عمل کا حقیقی اور واقعی ارادہ ہے نہ کہ اس کا خالی تصور یا خیال کیونکہ تصور اور نیت میں بہت فرق ہے ۔ مثلاً گاہے انسان نماز، روزہ ،حج و غیرہ کو اپنے ذہن میں مجسم کر کے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے اور حج کرنے کا تصور کرتا ہے لیکن نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کا کوئی عزم نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ تہجد کی نماز اور جہاد کا تصور تو کرتا ہے لیکن محاذ جنگ پر جانے یا نماز تہجد پڑھنے کی تیاری بالکل نہیں کرتا۔ واضح ہے کہ ان تصورات کی حیثیت وہم و خیال اور سراب سے زیادہ نہیں اور ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے تصورات پر کسی کو ثواب اور جزا سے نہیں نوازتا

جو چیز ثواب و عقاب کا معیار ہے وہ دل کی گہرائیوں سے سچ مچ کی جانے والی ایسی حقیقی اور سنجیدہ نیت ہے جو انسان کو عمل کی جانب کھینچ کر لے جائے۔

ب :۔ یاد رہے کہ حقیقی نیت کی عملی طور پر دو صورتیں ہو سکتی ہیں پہلی یہ کہ انسان کو اپنی نیت میں کامیابی حاصل ہو اور دوسری یہ کہ نیت میں ناکامی ہو کیونکہ انسان اپنی نیت کو عملی جامہ پہنانے میں ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا ۔ لیکن دونوں صورتوں میں چونکہ نیت حقیقی ہوتی ہے اس لئے قابل قدر ہے ۔

ج :۔ یاد رہے کہ مومن کی نیت اس وقت قابل قدر ہے جب اس میں اخلاص ہو ۔ دوسرے لفظوں میں فاعل کی خوبی فعل کی خوبی سے زیادہ اہم ہے کیونکہ فاعل کی خوبی کی دو خاصیتیں ہیں ایک یہ کہ عمل کو پسندیدہ بناتی ہے اور دوسری یہ کہ فاعل کو نیکوکار بناتی ہے ۔ اس کے برخلاف فعل کی خوبی کا کوئی اثر فاعل پر نہیں ہوتا۔

چنانچہ ارشاد قرآنی ہے :

وَمَنْ اَرادَ الآخِرَةَ وَسَعىٰ لَهـا سَعْيَهـا وَهُوَ مُؤمِن ....(۱)

---

(۱) الاسراء / ۱۹ ۔

اور جو آخرت کا ارادہ کرے اور اس کی خاطر سعی و کوشش کرے بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو ......

یعنی نیت کے ساتھ سعی و کوشش اس وقت مفید ہے جب ایمان اور اخلاص بھی موجود ہوں۔

رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:

مَنْ سَئَلَ اللّٰہَ الشَّھَادَۃَ بِصِدْقٍ مِنْ قَلْبِہٖ بَلَّغَہُ اللّٰہُ مَنَازِلَ الشُّھَدَآءِ وَاِنْ مَاتَ عَلٰی فِرَاشِہٖ (۱)

جو شخص صدق دل سے اللہ سے شہادت کی دعا کرے اللہ اس کو شہداء والے درجات سے سرفراز فرمائے گا اگرچہ وہ اپنے بستر پر جان دے دے۔

حضرت امام علیؑ کا ارشاد ہے:

وَاِنَّ اللّٰہَ سُبْحَانَہٗ یُدْخِلُ بِصِدْقِ النِّیَّۃِ وَالسَّرِیْرَۃِ الصَّالِحَۃِ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہِ الْجَنَّۃَ (۲)

اللہ تعالی نیت کی سچائی اور باطن کی پاکیزگی کی بناء پر اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے جنت میں داخل فرمائے گا۔

جب مذکورہ بالا شرائط نیت کے اندر جمع ہوجائیں تو درج ذیل وجوہات کی بناء پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر کیوں ہے:

۱۔ نیت عمل کی بنیاد اور علت ہے اور واضح ہے کہ علت کا مرتبہ معلول سے بالاتر ہے۔

۲۔ نیت عمل کی روح اور جان ہے اور ظاہر ہے کہ روح کا مقام جسم سے بلند تر ہے۔

۳۔ نیت ریا سے پاک ہوتی ہے لیکن عمل میں ریا اور خودنمائی کا امکان ہوتا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ج/ ۲ ص ۱۰۳۔
(۲) نہج البلاغہ صبحی صالح حکمت نمبر ۴۲۔

۴ . ممکن ہے کہ کوئی مومن غلطی سے کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے خود اسے یا دوسروں کو نقصان پہنچے۔ اس صورت میں اس کے عمل میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی لیکن چونکہ اس کی نیت اچھی ہوتی ہے اس لئے وہ جزائے خیر پائے گا

۵ . مومن اپنی بلند ہمتی کی بناء پر ان چیزوں کی تمنا کرتا ہے جو اس کی طاقت سے بڑھ کر ہوں۔

پس مجموعی طور پر مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

رہا یہ سوال کہ کافر کی نیت اس کے عمل سے بدتر کیوں ہے تو اس کا راز یہ ہے کہ اگر چہ ممکن ہے کہ کافر کسی ایسے عمل کو انجام دے جو ذاتی طور پر اچھا اور مفید ہو لیکن چونکہ وہ عام طور پر اچھے کاموں کو بھی دکھاوے، ریا، دھوکہ بازی، مکر و فریب، اور ذاتی مفاد کے لئے انجام دیتا ہے بنابریں اس کا عمل اس کی نیت سے بہتر ہے کیونکہ اس کے عمل سے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن وہ خود نقصان اور وبال سے دوچار ہوگا۔ علاوہ ازیں کافر اپنے کفر کی بناء پر برے ارادوں کا حامل ہوتا ہے اگر چہ ان کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ ان وجوہات کی روشنی میں مجموعی طور پر کافر کی نیت اس کے ہاتھوں انجام پانے والے اعمال سے بدتر ہے۔

عبادت میں اخلاص

قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ اخلاص عبادت کی بنیاد اور روح ہے۔ در حقیقت اخلاص عبودیت و بندگی کی جان ہے۔ اخلاص کے بغیر عبادت بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔ اسی لئے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

وَ النِّیـةُ اَفْضَلُ مِنَ الْعَمَلِ اَلاَ وَ اِنَّ النِّیَّـةَ هِیَ الْعَمَلُ ..... (۱)

اور نیت عمل سے بہتر ہے۔ آگاہ رہو کہ نیت ہی عمل (کی روح) ہے۔

---

(۱) اصول کافی ج/۲ ص ۱۶ حدیث نمبر ۴۔

اخلاص کیا ہے ؟

اخلاص سے مراد ہے نیت کو شرک و ریا سے پاک کرنا ہے چونکہ اخلاص کا تعلق دل اور ضمیر سے ہوتا ہے بنابریں اسے ظاہری حسن اور کثرت عمل کی کسوٹی پر نہیں پرکھنا چاہیئے۔

حضرت امام صادقؑ نے فرمایا ہے :

لَیْسَتِ الصَّلاۃُ قِیَامَکَ وَ قُعُودَکَ۔ اِنَّما الصَّلاۃُ اِخْلَاصُکَ وَ اَنْ تُرِیدَ بِھَا اللّٰہُ وَحْدَہ (۱)

نماز قیام و قعود سے عبارت نہیں بلکہ نماز تو بس اخلاص اور اس کے ذریعے خدا کی رضا ڈھونڈنے کا نام ہے یعنی نماز کی روح در حقیقت نمازی کا اخلاص ہے اور اخلاص یہ ہے کہ فقط خدا کی رضا کی خاطر نماز پڑھی جائے۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام صادقؑ نے فرمایا :

وَ الْعَمَلُ الخَالِصُ الَّذی لاَ تُرِیْدُ اَنْ یَحْمَدَکَ عَلَیْہِ اَحَدٌ اِلاَّ اللّٰہُ عَزَّوَ جَلَّ (۲)

عمل خالص وہ ہے جس کے بارے میں تو اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے تعریف و ستایش کی توقع نہ رکھے۔

اخلاص کے درجات

اخلاص کے مختلف درجات ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ عبادت ریا اور دکھاوے سے پاک ہو۔ واضح ہے کہ جو شخص رضائے الٰہی کی خاطر نماز پڑھے، اللہ سے حاجت طلب کرے اور

---

(۱) شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۳۲۵۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۱۶۔

اللہ سے ہی جزا و ثواب کا طلبگار ہو وہ ریاکار محسوب نہیں ہوگا۔ البتہ ایسے شخص کا اخلاص کامل نہیں کہلایا جاسکتا۔ کیونکہ کامل اخلاص یہ ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی چیز کا طالب نہ ہو اور اس کے دل میں خدا کے سوا کوئی چیز نہ ہو جیسا کہ صادق آل محمدؑ کا ارشاد ہے:۔

اَلْقَلْبُ السَّلِیْمُ الَّذِیْ یَلْقَیٰ رَبَّہ وَ لَیْسَ فِیْہِ اَحَدٌ سِوَاہُ قَالَ وَ کُلُّ قَلْبٍ فِیْہِ شِرْکٌ اَوْ شَکٌّ فَھُوَ سَاقِطٌ (۱)

قلب سلیم وہ ہے جو اللہ سے اس حالت میں ملاقات کرے کہ اس کے اندر سوائے اللہ کے کوئی نہ ہو۔ پھر فرمایا ہر وہ دل جس میں شرک یا شک کا شائبہ ہو وہ تباہ و برباد ہے۔

اخلاص تمام عبادات کی بنیادی شرائط میں سے ایک شرط ہے۔ فقہاء نے اخلاص کو عمل کی درستگی کی شرط قرار دیا ہے، حکماء نے اسے عمل کی قبولیت کی شرط اور اہل عرفان نے اسے (خدا تک) رسائی کی شرط قرار دیا ہے۔

جب تک کوئی عمل خدائی اور غیبی رنگ میں رنگ نہ جائے خدا کی طرف اوپر نہیں جا سکتا اور محبوب حقیقی سے قرب کا باعث نہیں بن سکتا۔ قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

وَ مَا اُمِرُوْا اِلاَّ لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ (۲)

ان کو بس یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں خالص دین کے ساتھ۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ کَانَ یَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّہ فَلْیَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَ لَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖ اَحَداً (۳)

---

(۱) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۶ حدیث ۵۔

(۲) سورہ بینۃ / ۵۔

(۳) سورہ کہف / ۱۱۰۔

جو شخص اللہ سے ملاقات کی امید رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ وہ عمل صالح بجا لائے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

اس آیت کا آخری حصہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عمل صالح وہ ہے جس میں شرک و ریا کا شائبہ تک نہ ہو۔ پس اگر ہم عبادت خدا میں غیر کو شریک ٹھہرائیں تو اخلاص ختم ہوجاتا ہے اور اس کا فقط ظاہری ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔ اور جب عمل کی حقیقی روح مفقود ہوجائے تو اس کا کوئی نتیجہ ہاتھ نہیں آتا۔

اللہ کے مخلص بندے

اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کی توصیف و تعریف اخلاص کی صفت کے ساتھ فرماتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصاً وَ كَانَ رَسُولاً نَبِياً [1]

اور کتاب قرآن میں موسیٰ کا ذکر یاد کرو کیونکہ وہ میرے مخلص بندے اور رسول و نبی تھے۔

ایک دلچسپ اور قابل توجہ نکتہ

مخلَص (لام پر زبر کے ساتھ) اسم مفعول ہے اور اس سے مراد ہے خالص شدہ۔

اللہ تعالی حضرت موسیٰؑ کا تعارف کراتے ہوئے انہیں مخلص (خالص شدہ) کے نام سے یاد فرماتا ہے یاد رہے کہ مُخْلَصٌ (لام پر زبر کے ساتھ) اور مخلِص (لام پر زیر کے ساتھ) میں بہت فرق ہے۔ کیونکہ مُخلِصٌ (زیر کے ساتھ) کا لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو وقتی اور عارضی طور پر اخلاص کے حامل ہوں۔

---

(۱) سورہ مریم / ۵۱۔

مثلاً ان لوگوں کے بارے میں اخلاص کا لفظ استعمال ہوا ہے جو سمندر کی موجوں میں گھر جاتے ہیں اور مادی وسائل سے ناامید ہوکر خدا کو پکارتے ہیں۔

اس سلسلے میں قرآنی آیت کہتی ہے:

وَ اذا غَشِیَهُمْ مَوْج کَالظُّلَلِ دَعَوُ اللهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّیٰنهُمْ اِلَی الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَ مَا یَجْحَدُ بِآیَاتِنَا اِلّاَ کُلُّ خَتَّارٍ کَفُوْرٍ (۱)

جب سمندر کی موج کالی گھٹاؤں کی طرح ان کو گھیر لے تو وہ دین کے پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں لیکن جب اللہ ان کو نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتاہے تو ان میں سے کچھ ہی راہ اعتدال پر باقی رہتے ہیں (اور اپنے ایمان کو برقرار رکھتے ہیں جبکہ کچھ لوگ اللہ کو بھلاکر کفر کی روش اختیار کرتے ہیں) اور ہماری نشانیوں کا انکار سوائے غدار اور ناشکر افراد کے کوئی نہیں کرتا۔

اس آیت اور اس طرح کی دوسری آیات سے معلوم ہوتاہے کہ لفظ "مخلِص" (زیر کے ساتھ) ایک عام مفہوم کا حامل ہے جو اخلاص کے ابتدائی ترین مرحلے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی شامل ہے، لیکن مُخْلَص (زبر کے ساتھ) یعنی خالص شدہ کا لفظ صرف ان لوگوں کو شامل ہے جو اخلاص کے مدارج کو طے کرکے خلوص کے کامل درجے یعنی مقام عصمت تک پہنچ چکے ہوں۔

اخلاص احادیث کی روشنی میں

معصومینؑ کی احادیث میں اخلاص پر بہت زور دیا گیا ہے کیونکہ (جیسا کہ بیان ہوچکا) اخلاص کا مسئلہ ایک حساس اور نازک مسئلہ ہے اور اعمال کی [illegible]یت کا

---

(۱) سورہ لقمان / ۳۲۔

دار و مدار خلوص کے درجات پر ہے۔ جس قدر اخلاص بیشتر اور کامل تر ہوگا اسی قدر عمل کی قدر و قیمت زیادہ ہوگی۔ اخلاص ایک خیالی، تصوراتی اور زبردستی ٹھونسی جانے والی چیز نہیں جو خیال و تصور اور الفاظ کے ہیر پھیر کے ذریعے پیدا ہوسکے بلکہ یہ ایک باطنی حقیقت ہے جو صرف عنایت خداوندی اور نفسانی ریاضت کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ کتنے ہی افراد ایسے ہیں جو بزعم خویش مخلص ہیں لیکن حقیقت میں وہ اخلاص سے کوسوں دور اور خودپرستی اور ہوس پرستی کے سمندر میں غرق ہوتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھے خبر دی کہ اللہ نے فرمایا:

الاخْلاصُ سِرٌّ مِنْ اَسْرارِی اسْتَوْدَعْتُہُ قَلْبَ مَنْ اَحْبَبْتُ مِنْ عِبادِی (۱)

اخلاص میرے اسرار میں سے ایک سر ہے جسے میں اپنے محبوب بندوں کے دلوں میں بطور امانت رکھتا ہوں۔

قرآن کی اس آیت:

لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (۲)

تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کس کا عمل سب سے بہتر ہے۔

کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

لَیْسَ یَعْنی اَکْثَرَکُمْ عَمَلا وَ لٰکِنْ اَصْوَبَکُمْ عَمَلاً وَ اِنَّمَا الاِصَابَۃُ خَشْیَۃُ اللہِ وَ النِّیَّۃُ الصَّادِقَۃُ وَ الْخَشْیَۃُ۔ ثُمَّ قَالَ: الاِبْقاءُ عَلَی الْعَمَلِ حَتّٰی یَخْلُصَ اَشَدُّ مِنَ الْعَمَلِ .... (۳)

---

(۱) سورہ ملک / ۲۔

(۲) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج ۶۷ ص ۲۴۱۔

(۳) اصول کافی ج ۲/ ص ۱۶۔

"ایکم احسن عملا" سے اللہ کی مراد وہ شخص ہے جو زیادہ صحیح عمل بجا لائے۔ وہ شخص نہیں ہے جو زیادہ عمل کرے۔ صحیح عمل وہ ہے جو خدا کے خوف اور سچی نیت کے ساتھ بجا لایا جائے اس کے بعد فرمایا، عمل کو (آلودگیوں سے) محفوظ اور خالص رکھنا خود عمل سے بھی زیادہ سخت ہے۔

البتہ یاد رہے کہ اخلاص کا حصول اور اس کی شناخت بہت دشوار اور باریک مسئلہ ہے۔ اس وادی کے مسافر کے لئے زبردست ریاضت اور کوشش کی ضرورت ہے جیسا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

الشِّرکُ اَخفَیٰ فِیٔ امَّتِی مِنْ دَبِیبِ النَّمْلِ عَلَی الصَّفَا (۱)

میری امت کے اندر شرک سنگ خارا پر چونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہے۔

اخلاص کے بارے میں مروی احادیث کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

الف:۔ اخلاص کی علامات ب:۔ اخلاص کے اسباب ج:۔ اخلاص کے آثار و فوائد

حصہ اول

اخلاص کی علامات

یہاں ہم پہلے اس سلسلے میں مروی احادیث کا ذکر کریں گے اور بعد میں ان احادیث سے نتیجہ لیں گے۔

۱۔ رسول اللہؐ نے فرمایا:

فَامّا عَلامَةُ المُخلِصِ فَاَربَعَة يَسلَم قَلبُهُ وَ تَسلَمُ جَوارِحُه وَ بَذَلَ خَيرَه وكَفَّ شَرَّه (۲)

---

(۱) مستدرک الوسائل ج/۱ ص ۱۲۔

(۲) تحف العقول ص ۱۶۔

مخلص انسان کی چار علامات ہیں، اس کا دل پاک ہوتاہے، اس کے اعضاء و جوارح بے داغ ہوتے ہیں، وہ اپنی نیکیاں (دوسروں پر) عام کرتاہے اور اپنے شر سے (دوسروں کو) محفوظ رکھتا ہے۔

۲۔ امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا:

تَمَامُ الاِخْلَاصِ تَجَنُّبُ الْمَعَاصِی (۱)

کامل اخلاص گناہوں سے اجتناب ہے۔

۳۔ حضرت امام صادقؑ سے مروی ہے:

مَا بَلَغَ عَبْدٌ حَقِیْقَةَ الاِخْلَاصِ حَتّٰی لَا یُحِبُّ اَنْ یُحْمَدَ عَلٰی شَیءٍ مِنْ عَمَلٍ لِلّٰہِ (۲)

کوئی بندہ اس وقت تک اخلاص کی حقیقت کو نہیں پا سکتا جب تک وہ اس بات کو غیر پسندیدہ نہ سمجھے کہ لوگ اس کے کاموں کی تعریف کریں جنکو اس نے خدا کے لئے انجام دیا ہو۔

ضروری یاد دھانی

یہاں ایک نکتے کی یاد دھانی ضروری ہے اور وہ یہ کہ کسی کام پر لوگوں کی طرف سے تعریف و تمجید پر خوش ہونا اس صورت میں ریا و خودنمائی شمار ہوگا جب اس کام کی انجام دہی کی اصل وجہ لوگوں سے داد وصول کرنا ہو۔ لیکن اگر اس کار خیر کی انجام دہی کا اصلی مقصد رضائے الٰہی اور حکم خداوندی کی تعمیل ہو پھر لوگوں کے مشاہدے اور ان کی تعریف سے قدرتی طور پر خوشحال ہو تو یہ ریا اور خودنمائی کی علامت نہیں ہے۔

---

(۱) بحار الانوار ج ۷۴، ص ۲۱۳۔

(۲) عدة الداعی ص ۲۲۸۔

بدیہی امر ہے کہ انسان اپنی کامیابی اور نیک نامی کو فطرتاً پسند کرتا ہے اور اپنی بدنامی سے گریزاں ہوتا ہے ۔ بنابریں یہ کیفیت ریا اور خود نمائی کی دلیل نہیں ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ خدا سے دعا کرتے ہیں :

" وَ اجْعَلْ لِیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْآخِرِیْنَ " (۱)

اے اللہ ! آئندہ زمانے کے لوگوں کی زبانوں پر میرا ذکر خیر جاری فرما اور میری گفتگو کو دلپذیر قرار دے۔

البتہ اگر لوگوں کی طرف سے تعریف و تمجید یا مذمت و ملامت ہی کسی کام کو انجام دینے یا انجام دہی کی کیفیت میں مقصود ہو تو یہاں خود اخلاص کے متعلق شبہ ہے ۔

اخلاص اور قصد قربت کی شرط یہ ہے کہ عبادت ، خودنمائی اور ریا کے لئے نہ ہو ۔ رہے دوسرے نیک مقاصد مثلاً اچھے کاموں کی طرف دوسروں کو ترغیب دینے یا دین و مذہب کی ترویج) کا قصد کرنا تو یاد رہے کہ یہ امور اخلاص کے منافی نہیں ہیں بلکہ اس کی کیفیت میں اضافہ بھی کرتے ہیں ۔ عبید نامی شخص کا بیان ہے :

قُلْتُ لِأَبِیْ عَبْدِ اللهِ عَلَیْهِ السَّلَامُ، اَلرَّجُلُ یَدْخُلُ فِی الصَّلَاةِ فَیُجَوِّدُ صَلَاتَهُ وَ یُحَسِّنُهَا رَجَاءَ اَنْ یَسْتَجِرَّ بَعْضَ مَنْ یَرَاهُ اِلٰی هَوَاهُ قَالَ لَیْسَ هُوَ مِنَ الرِّیَاءِ (۲)

یعنی میں نے امام صادقؑ سے پوچھا اگر کوئی شخص نماز کو صحیح قرائت اور اچھے طریقے سے اس لئے بجا لائے تاکہ دیکھنے والوں کو ترغیب دلائے اور وہ اس کے طریقے کو اپنائیں تو اس کی نماز کیسی ہے؟ آپ نے فرمایا یہ ریا نہیں ہے ۔

---

(۱) سورہ شعراء / ۸۴ ۔

(۲) بحارالانوار ج ۶۹ ص ۳۰۱ ۔

اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ واجب عبادات اور صدقات کو ظاہراً دینا ان کو چھپانے سے بہتر ہے اور اس کے برعکس مستحب اعمال کا چھپانا ان کو ظاہر کرنے سے بہتر ہے کیونکہ واجبات میں ریا کا احتمال مستحبات کی نسبت کمتر ہوتا ہے۔ بنابریں کیا ہی بہتر ہے کہ آشکارا انجام پائیں تاکہ دوسروں کی بھی تشویق ہو اور وہ اپنی شرعی ذمہ داریاں مزید ذوق و شوق سے انجام دیں۔ مستحب اعمال میں چونکہ ریا کا احتمال زیادہ ہوتا ہے لہذا ان کو مخفی رکھنا بہتر ہے مگر یہ کہ انسان کو اپنے اخلاص پر مکمل اطمینان ہو اور وہ دوسروں کی تشویق و ترغیب کی خاطر اپنی عبادات کا اظہار کرے۔

حصہ دوم

اخلاص کے اسباب و عوامل

۱۔ سَبَبُ الاِخْلاَصِ الیَقِیْنُ (۱)

اخلاص کا سرچشمہ یقین ہے۔

۲۔ عَلیٰ قَدْرِ قُوَّۃِ الدِّینِ یَکُوْنُ خُلُوصُ النِّیَّۃِ (۲)

جتنا ایمان مضبوط ہوگا اتنا ہی اخلاص ہوگا۔

۳۔ ثَمَرَۃُ العِلْمِ اِخلاصُ العَمَلِ (۳)

اخلاص علم و معرفت کا پھل ہے۔

۴۔ اَوَّلُ الاِخْلاصِ اَلیَاسُ مِمَّا اَیْدِی النَّاسِ (۴)

اخلاص کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ (اللہ کے سوا) دوسروں کے پاس موجود اشیاء سے نظریں ہٹالی جائیں۔

---

(۱) فہرست موضوعی غرر الحکم ص ۴۳۳۔

(۲) فہرست موضوعی غرر ص ۹۳۔

(۳) فہرست موضوعی غرر ص ۹۲۔

(۴) فہرست موضوعی غرر ص ۴۲۰۔

۵۔ قَلِّلِ الآمالَ تَخْلُصْ لَکَ الأَعْمَالُ [1]

اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو کم کر تاکہ تمہارے اعمال خالص ہوں۔

۶۔ اَلاِخْلاَصُ ثَمَرَۃُ الْعِبَادَۃِ [2]

اخلاص عبادت کا پھل ہے۔

مختصر یہ کہ اخلاص قوت ایمان، علم، لوگوں سے بے نیازی، آرزوؤں میں کمی اور عبادت پروردگار کی پیداوار ہے۔

حصہ سوم

اخلاص کے آثار و فوائد

۱۔ دل کی بصیرت اور نورانیت (حکمت و معرفت)

رسول گرامیؐ اسلام کا ارشاد ہے:

مَا اَخْلَصَ عَبْدٌ للهِ عَزَّ وَجَلَّ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحاً اِلاّ جَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَۃِ مِنْ قَلْبِہِ عَلٰی لِسَانِہِ [3]

جو شخص چالیس دن تک اللہ کے ساتھ اخلاص کا ثبوت دیتا رہے حکمت و معرفت کے چشمے اس کے دل سے پھوٹ کر اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔

قدر دل و پایۂ جان یافتن — جز بہ ریاضت نتوان یافتن

جثہ خود پاک تر از جان کنی — چون کہ چہل روز بہ زندان کنی

مرد بہ زندان شرف آرد بہ دست — یوسف ازین روی بہ زندان نشست

---

(۱) فہرست موضوعی غرر ص ۴۲۰۔

(۲) ایضا صفحہ ۹۱۔

(۳) بحار الانوار ج/۶۷ ص ۲۴۲۔

۲۔ اللہ کی مدد سے ناکامی سے نجات

قال اللہ عزّ وَ جلَّ: لاَ أَطَّلِعُ عَلَىٰ قَلْبِ عَبْدٍ فَأَعْلَمَ مِنْهُ حُبَّ الاِخْلاَصِ لِطَاعَتِي وَ لِوَجْهِي وَ ابْتِغاءِ مَرْضَاتِيْ اِلاَّ تَوَلَّيْتُ تَقْوِيْمَهُ وَ سِيَاسَتَهُ (۱)

اللہ تعالی فرماتا ہے، جب میں اپنے کسی بندے کے دل میں اپنی اطاعت اور اپنی رضا طلب کے بارے میں جذبہ اخلاص پاتا ہوں تو میں اس کے کاموں کی ذمہ داری لے لیتا ہوں (اور اس کے کاموں کو دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتا۔

۳۔ خوش بختی و کامیابی

ا۔ ارشاد ہوتا ہے:

أَخْلِصُوا أَعْمَالَكُمْ تَسْعَدُوا (۲)

اپنے اعمال کو خالص کرو تاکہ سعادت و خوشبختی حاصل کرو۔

نیز فرمایا:

الاخلاص اعلیٰ فوزٌ (۳)

اخلاص سب سے بڑی کامیابی ہے۔

---

(۱) بحارالانوار ج/ ۸۲ ص ۱۳۶۔

(۲) فہرست موضوعی غرر ص ۹۳۔

(۳) فہرست موضوعی غرر ص ۹۱۔

۴۔ اعمال کے درجات کا بلند ہونا اور ان کی قبولیت

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

ایُّھَاالنَّاسُ، اَخْلِصُوا اَعْمَالَکُمْ لِلّٰهِ تَعَالیٰ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَقْبَلُ اِلَّا مَا خَلَصَ لَه (۱)

اے لوگو! اپنے اعمال کو اللہ کی خاطر خالص کرو۔ کیونکہ اللہ صرف ان اعمال کو قبول فرماتاہے جو فقط اس کی خاطر ہوں۔

۵۔ عبادت کی معراج

حضرت جواد الائمہؑ نے فرمایا ہے:

اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ الاِخْلَاص (۲)

سب سے افضل عبادت اخلاص ہے۔

یعنی حقیقی عبادت اخلاص ہے اور دیگر عبادات اخلاص کے سائے میں عبادت کامفہوم پیدا کرتی اور کامل ہوتی ہیں۔ یاد رہے کہ اخلاص کے اور بھی آثار و فوائد ہیں۔ صاحبان تحقیق اس سلسلے میں متعلقہ کتابوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

حاصل بحث

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوتاہے کہ اسلام عمل کی کیفیت پر کمیت سے زیادہ زور دیتاہے۔ دوسرے لفظوں میں جس چیز کو اللہ کے ہاں اہمیت حاصل ہے وہ صرف خلوص نیت ہے محض عمل کی کثرت خدا سے تقرب کا باعث نہیں ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتاہے کہ معصومینؑ کی سیرت کی ایک جھلک بھی پیش کی جائے۔ اس امید کے ساتھ کہ خدا ہم سب کو ان عظیم ہستیوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

(۱) تفسیر قرطبی ج/ ۵ ص ۱۸۰۔

(۲) بحار الانوار ج ۶۷ ص ۲۱۹۔

امیر المومنینؑ کے اخلاص کے چند نمونے

★ بستر رسول پر سونا

جب رسول اللہؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو امیرالمومنین حضرت علیؑ آنحضرتؐ کی جان کی حفاظت اور رضائے الہی کی خاطر بستر رسول پر سو گئے۔

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغاءَ مَرضَاتِ اللهِ واللهُ رَوُوف بِالْعِبَاد (1)

لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو رضائے الہی کے حصول کی خاطر اپنی جان کا سودا کرتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

★ سورہ ھل اتی کا نزول

اہلبیت رسولؐ کے اخلاص کے نتیجے میں سورہ ھل آتی نازل ہوئی جو یہ گواہی دیتی ہے:

وَ يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَ يَتِيماً وَّ اَسِيرا - اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللهِ لاَ نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلاَ شُكُوراً (2)

(اللہ کی محبت میں) وہ (رغبت اور بھوک کے باوجود) مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں (اور بزبان حال کہتے ہیں، ہم تمہیں صرف رضائے الہی کی خاطر کھلاتے ہیں اور تم سے کسی قسم کی پاداش یا شکریہ کی خواہش نہیں رکھتے۔

---

(1) سورہ بقرہ / ۲۰۷۔

(2) سورہ دہر / ۸، ۹۔

ہمارے ساتویں امام حضرت موسی کاظمؑ یہاں ایک لطیف نکتے کی طرف یوں اشارہ فرماتے ہیں:

اَمَا اِنَّ عَلِیاً لَمْ یَقُلْ فِی مَوْضِعٍ اِنَّمَا نُطعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لاَ نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَ لَا شُکُوراً وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ عَلِمَ اَنَّ فِی قَلْبِہِ اَنَّ مَا اَطْعَمَ لِلّٰہِ، فَاَخْبَرَہُ بِمَا یَعْلَمُ مِنْ قَلْبِہِ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَنْطِقَ بِہِ (۱)

یعنی امیر المومنینؑ نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ ہم خدا کی خاطر تمہیں کھانا کھلاتے ہیں اور تم سے کسی پاداش یا شکریے کی خواہش نہیں رکھتے۔ لیکن اللہ تعالی کو علم تھا کہ علیؑ نے خدا کی خاطر کھانا کھلایا تھا پس اللہ نے آپ کی دلی نیت کو ان الفاظ میں آشکار فرمایا۔

بہر حال اہل بیت کا کھانا کھلانا اس قدر اخلاص سے بھرپور تھا کہ:

عطار نیشاپوری کے بقول

گذشتہ زان جہان وصف سہ نانش   گذشتہ زین جہان وصف سنانش

اس دنیا میں ان کی برچھی کی توصیف نہیں ہوسکتی اور دوسرے جہاں میں ان کی تین روٹیوں کی توصیف نہیں ہوسکتی۔

ریا اور عمل کا بطلان

ریا انسان کے اعمال کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کی ۲۶۴ ویں آیت میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے۔ اللہ ریا کی خاطر مال خرچ کرنے کو اس انفاق کی طرح باطل قرار دیتا ہے جو دوسروں کو اذیت دینے اور ان پر منت جتلانے کے ساتھ ہو۔ فقہاء اور بزرگان سیر و سلوک، کسی چیز کو ریا سے زیادہ اعمال کی تباہی اور خسارہ کا باعث نہیں سمجھتے۔

---

(۱) تفسیر برہان ج۴ ص ۴۱۲۔

ریا جذام کے جراثیم کی طرح اندر ہی اندر سے اعمال کو خراب کردیتا ہے۔ ریا اور دکھاوے والا عمل اس درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں نہ ہوں اور جو ہوا کے ایک جھونکے سے اکھڑ جائے۔ پس خدا کے لیے ریا پر مشتمل اعمال سے پرہیز کیجیئے، اس معاملے میں ہمیشہ اللہ سے پناہ مانگیے اور توسل و آہ و زاری کے ساتھ اپنے آپ کو لغزشوں سے محفوظ رکھیئے۔ نیز ہمیشہ صحیفہ سجادیہ کے درج ذیل الفاظ کو دھراتے ہوئے اللہ کو پکاریئے:

ثُمَّ خَلِّصْ ذَالِکَ کُلَّہ مِنْ رِیَآءِ الْمُرَآئِیْنَ وَ سُمْعَۃِ الْمُسْمِعِیْنَ لاَ نُشْرِکُ فِیْہِ اَحَداً دُونَکَ وَ لاَ نَبْتَغِیْ فِیْہِ مُراداً سِوَاکَ[1]

(خدایا) ہماری عبادات کو ریا و خود نمائی سے پاک رکھ تاکہ ہم عبادت میں کسی کو تیرا شریک نہ ٹھہرائیں اور تیری ذات اقدس کے علاوہ کسی کو عبادت میں مقصود قرار نہ دیں۔

محمد بن عرفہ کہتا ہے کہ حضرت امام رضاؑ نے مجھ سے فرمایا:

وَیْحَکَ یَا بْنَ عَرَفَۃَ! اِعْمَلُوا بِغَیْرِ رِیَآءٍ وَ لاَ سُمْعَۃٍ فَاِنَّہ مَنْ عَمِلَ لِغَیْرِ اللّٰہِ وَکَلَہُ اللّٰہُ اِلیٰ مَا عَمِلَ[2]

وائے ہو تم پر اے فرزند عرفہ! ریا اور دکھاوے سے پاک عمل انجام دو کیونکہ جو شخص غیر اللہ کے لئے عمل انجام دے اللہ تعالی اس شخص کو اس عمل کے حوالے کر دیتا ہے۔

---

(۱) صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۴۴۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۲۹۴۔ حدیث نمبر ۵۔

رسول اللہؐ کی ایک حدیث میں مذکور ہے:

اِنَّ الْمَلَکَ لَیَصْعَدُ بِعَمَلِ الْعَبْدِ مُبْتَہِجاً بِہٖ فَاِذَا صَعِدَ بِحَسَنَاتِہٖ یَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اجْعَلُوْھَا فِیْ سِجِّیْنٍ اِنَّہٗ لَیْسَ اِیَّایَ اَرَادَ بِھَا (۱)

فرشتہ بندے کے عمل کو لے کر خوشی خوشی سے اوپر چلا جاتا ہے جب وہ اس کے نیک اعمال کو اوپر لے جاتا ہے تو اللہ تعالی فرماتا ہے انہیں سجّین (گناہگاروں) کے اعمال نامے میں شامل کرو کیونکہ اس نے یہ اعمال میری خاطر انجام نہیں دیے۔

عمل کے بعد ریا

فقہائے عالی مقام نیت کی بحث میں فرماتے ہیں کہ عمل کے بعد ریا کا مظاہرہ اس عمل کو باطل نہیں کرتا۔ یہ بات اصولی نقطہ نظر سے درست ہے کیونکہ جب عمل بجائے خود صحیح انجام پائے تو بعد والا ریا اس کی سابقہ حالت پر اثر انداز نہیں ہوتا لیکن بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسروں کے پاس اپنے اعمال کا تذکرہ کرنا اس کے ثواب میں کمی کا باعث بنتا ہے اور تکرار کی صورت میں ریا کی طرح عمل کو تباہ کر دیتا ہے۔

بنابریں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ معمولی لغزش کی بناء پر گذشتہ زحمات رائیگاں نہ جائیں۔

حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے:

اَلْاِبْقَاءُ عَلَی الْعَمَلِ اَشَدُّ مِنَ الْعَمَلِ۔ قِیْلَ وَمَا الْاِبْقَاءُ عَلَی الْعَمَلِ؟ قَالَ یَصِلُ الرَّحِمَ بِصِلَۃٍ وَیُنْفِقُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ فَکُتِبَتْ لَہٗ سِرّاً ثُمَّ یَذْکُرُھَا فَتُمْحٰی فَتُکْتَبُ لَہٗ عَلَانِیَۃً ثُمَّ یَذْکُرُھَا فَتُمْحٰی وَتُکْتَبُ لَہٗ رِئَاءً (۲)

---

(۱) مستدرک الوسائل ج/۱ ص ۱۲۔

(۲) وسائل الشیعہ ج/۱ ص ۵۵۔

عمل کی حفاظت اس کی انجام دہی سے زیادہ مشکل ہے۔ سوال ہوا عمل کو محفوظ رکھنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا، آدمی صلہ رحمی کرتا ہے اور خدائے واحد کی راہ میں خرچ کرتا ہے پس یہ عمل ایک پوشیدہ نیکی کے طور پر درج ہوجاتا ہے پھر جب وہ اس کا تذکرہ کرتا ہے تو پہلی والی بات مٹادی جاتی ہے اور وہ آشکارا عمل کے طور پر درج ہوتا ہے۔ جب وہ دوسری مرتبہ اس کا ذکر کرے تو وہ نامۂ عمل سے محو کیا جاتا ہے اور ریاء کی حیثیت سے اس عمل کا اندراج ہوتا ہے)۔

ریا گناہ کبیرہ ہے

ریا عمل کو فاسد کرنے کے علاوہ خود بھی ایک عظیم گناہ ہے کیونکہ ریا شرک کے مترادف ہے اور شرک کا شمار گناہان کبیرہ میں ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اکرمؐ سے منقول ہے:

انّ أخوفَ مَا اخافُ عَلَیْکُمُ الشّرکُ الاَصْغَرُ۔ قَالُوا وَمَا الشِّرْکُ الاَصْغَر یَارَسُولَ اللّٰہِ؟ قَالَ: اَلرِیَاء (۱)

بہ تحقیق مجھے تمہارے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ خوف ہے وہ شرک اصغر ہے۔ لوگوں نے پوچھا اے اللہ کے رسولؐ شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا اس سے مراد ریا ہے۔

خلاصہ بحث

مذکورہ باتوں کی روشنی میں ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ انسان کی خوشبختی و سعادت کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ کی خالص اور بے لوث اطاعت کی جائے۔ اگر کوئی شخص ایسا عمل انجام دے جس سے ریا اور دکھاوے کی بو آتی ہو تو اس کا ذرہ برابر فائدہ نہ ہوگا اور وہ عمل

---

(۱) وسائل الشیعہ ج/۱ ص ۲۳۰۔

اللہ کے ہاں مقبول قرار نہیں پائے گا۔ ایسا شخص قیامت کے دن خالی ہاتھ وادی محشر میں پہنچے گا کیونکہ اس کے پاس کوئی ایسا نیک عمل نہ ہوگا جسے وہ آخرت میں پیش کرکے ثواب حاصل کرسکے۔

اگر کوئی شخص چھپاکر کسی اچھے عمل کو انجام دے تو اللہ دنیا میں بھی لوگوں کی زبان پر اس کا ذکر خیر جاری فرمائے گا جیسا کہ ارشاد ہوا ہے "عَلَیکَ سَترُہ وَ عَلیَّ اِظھَارہ" [1] تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اپنے نیک کام کو چھپاؤ اور میری ذمہ داری ہے کہ اس کو آشکار کروں۔

---

(۱) عدۃ الداعی مطبوعہ بیروت ص ۲۳۰۔

چودھواں نکتہ

ریاضت اور نفس کے ساتھ جہاد

نفس کی مخالفت اور ریاضت بھی اخلاق کے ابتدائی مراحل میں سے ایک ہے۔ ریاضت سے مراد ہندوں اور اہل کلیسا والی رہبانیت اور ترک دنیا نہیں، نہ ہی صوفیوں اور اہل خانقاہ والی عزلت نشینی و گوشہ نشینی ہے بلکہ ریاضت سے مراد مسلسل مشق اور اپنے آپ کو واجبات کی ادائیگی، محرمات سے اجتناب اور دیگر اچھی باتوں یعنی اعمال صالحہ کا عادی بنانا ہے۔ انسان کا نفس فطری طور پر آرام و آسائش اور آزادی کا طالب ہوتا ہے۔ وہ شہوانی خواہشات کے زیر اثر شروع شروع میں فرایض کی ادائیگی سے بےاعتنائی برتتا ہے اور اس کے برعکس وہ گناہ کے ارتکاب اور قواعد و ضوابط کے حدود کو پامال کرنے پر زیادہ مائل ہوتا ہے۔ بنابرین نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرنے اور ان پر قابو پانے کے لئے زبردست جد و جہد کی ضرورت ہے تاکہ حیوانی جذبات اس کے تابع ہوجائیں۔ ریاضت کے تین مقاصد ہیں۔ پہلا مقصد رکاوٹوں کو دور کرکے حق تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ دوسرا مقصد عقل عملی کے سامنے نفس حیوانی کو جھکانا اور تیسرا مقصد نفس انسانی کو اللہ کی عنایات، اس کی رہنمائیوں اور غیبی عنایات سے بہرہ مند ہونے کے قابل بنانا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوا فِینَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۱)

جو لوگ ہماری خاطر مجاہدت کریں ہم ضرور بہ ضرور ان کو اپنی راہوں کی طرف راہنمائی کریں گے۔

اندرونی دشمن کا مقابلہ

انسان کا سب سے خطرناک دشمن نفس ہے۔ اس دشمن کا مقابلہ کرنا یقیناً نہایت سخت کام ہے۔ اس کام کے لیے مجاہدت اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ اسی لئے احادیث میں نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرنے پر کافی زور دیا گیا ہے۔ ان احادیث میں سے چند کا تذکرہ ہم یہاں کریں گے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

لَاعَدُوَّ اَعْدیٰ عَلَی الْمَرْءِ مِنْ نَفْسِه (۲)

انسان کے لئے اس کے نفس سے زیادہ کوئی خطرناک دشمن نہیں۔

ایک اور مقام پر حضرت امام علیؑ کا فرمان ہے:

نَفْسُکَ اَقْرَبُ اَعْدَائِکَ اِلَیْکَ (۳)

تمہارا سب سے قریبی دشمن تمہارا نفس ہے۔

بقول شاعر

دشمن تو نفس کافر کیش توست — واں ہوائے طبع بد اندیش توست

دشمن تو خود تو ئی اے تیرہ رو — دیگران را بے سبب دشمن مگو

یعنی تمہارا دشمن تمہارا کافر صفت نفس اور تمہاری ناعاقبت اندیش نفسانی خواہشات ہیں۔ تم خود اپنی ذات کے دشمن ہو۔ دوسروں کو بے جا اپنا دشمن مت کہو۔

---

(۱) سورۂ عنکبوت/ ۷۰۔

(۲) فہرست موضوعی غرر ص ۳۹۳۔

(۳) فہرست موضوعی غرر ص ۳۹۲۔

نیز آپؑ کا ارشاد ہے :

نَفسُکَ عَدُوٌّ مُحَارِب وَ ضِدٌّ مُواثِب اِنْ غَفَلتَ عَنْهَا قَتَلَتکَ (۱)

تمہارا نفس ایک ستیزہ کار دشمن اور ایک خونخوار مخالف ہے۔ اگر تم اس سے غافل ہو جاؤ گے تو وہ تمہیں ہلاک کر دے گا۔

نیز ارشاد ہے :

جَاهِدُوا اَهوائکُمْ کَمَا تُجَاهِدُونَ اَعْدَائکُمْ (۲)

اپنی خواہشات نفسانی کے ساتھ اسی طرح جنگ کرو جس طرح تم اپنے دشمنوں کے خلاف جہاد کرتے ہو۔

شیخ سعدی گلستان میں نقل کرتے ہیں: کسی عارف سے رسول اللہؐ کی اس حدیث کے متعلق پوچھا گیا کے متعلق پوچھا گیا کہ تمہارا نفس تمہارا سب سے بڑا دشمن اور تیرے لئے ہر چیز سے زیادہ خطرناک ہے" اس عارف نے جواب دیا جب تم کسی بھی دشمن کے ساتھ نیکی کرو گے اور اسے وہ چیز دو گے جس کی اسے خواہش ہو تو وہ تمہارا دوست بن جائے گا سوائے تمہارے نفس کے کیونکہ نفس کا جس قدر کہنا مانو گے اسی حساب سے اس کی عداوت بڑھتی چلی جائے گی۔ (۳)

ریاضت اور ہدایت

جو لوگ اللہ کی اطاعت و بندگی کو اپنا شیوہ" قرار دیتے ہیں اور اس راہ میں جدو جہد کرتے ہیں وہ شیطان کی غلامی اور بندگی سے آزاد ہونے کے علاوہ اللہ کی خصوصی عنایات سے بہرہ مند ہونگے انہیں رحمت کے فرشتوں کی امداد و راہنمائی حاصل ہو جائے گی۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:" وَ الَّذِیْنَ جَاهَدوا فِینا لَنَهْدِ یَنَّهُمْ سُبُلَنَا "یعنی جو لوگ ہماری راہ میں جد و جہد کرتے اور مشکلات کو برداشت کرتے ہم ان کے لئے اپنی راہوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

---

(۱) فہرست موضوعی غرر ص ۳۹۲۔ (۲) شرح نہج البلاغہ ج ۲۰ ص ۳۱۴۔

(۳) شہید مطہری کی کتاب انسان کامل ص ۱۲۷۔

ریاضت اور نفس کی اصلاح اس قدر اہم ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ اپنی عظمت و بزرگی کے باوجود فرماتے ہیں:

إِنَّمَا هِيَ نَفْسِيَ أَرُوضُهَا بِالتَّقْوَىٰ لِتَأْتِيَ آمِنَةً يَوْمَ الْخَوْفِ الأَكْبَرِ وَتَثْبُتَ عَلَىٰ جَوَانِبِ الْمَزْلَقِ لأَرُوضَنَّ نَفْسِي رِيَاضَةً تَهِشُّ مَعَهَا إِلَى الْقُرْصِ إِذَا قَدَرْتُ عَلَيْهِ مَطْعُوماً وَتَقْنَعُ بِالْمِلْحِ مَأْدُوماً[1]

میں اپنے نفس کو تقوی کے ذریعے تربیت دے کر رام کرتاہوں تا کہ جس دن خوف حد سے بڑھ جائے گا وہ مطمئن رہے اور پھسلنے کی جگہوں پر مضبوطی سے جما رہے۔ میں اپنے نفس کو ضرور بہ ضرور اس طرح سدھاروں گا کہ وہ کھانے میں ایک روٹی (جب وہ میرے ہاتھ لگے) پر راضی ہوجائے اور نمک پر بطور سالن اکتفا کرے۔

ریاضت اور صبر

سالک راہ حق کے کو چاہیئے کہ صابر رہے اور اس راہ میں صبر کی مختلف اقسام مثلاً اطاعت میں صبر، گناہ کے مقابلے میں صبر اور مصیبت پر صبر کا سہارا لے۔

حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

اَلصَّبْرُ ثَلاثَةٌ صَبْرٌ عِنْدَ الْمُصِيبَةِ وَصَبْرٌ عَلَى الطَّاعَةِ وَصَبْرٌ عَنِ الْمَعْصِيَةِ۔ فَمَنْ صَبَرَ عَلَى الْمُصِيبَةِ حَتَّى يَرُدَّهَا بِحُسْنِ عَزَائِهَا كَتَبَ اللهُ لَهُ ثَلاثَمِائَةَ دَرَجَةٍ مَا بَيْنَ الدَّرَجَةِ إِلَى الدَّرَجَةِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ إِلَى الأَرْضِ۔ وَمَنْ صَبَرَ عَلَى الطَّاعَةِ كَتَبَ اللهُ لَهُ سِتَّمِائَةَ

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح مکتوب نمبر ۴۵۔

دَرجةِ مَا بَيْنَ الدَّرَجَةِ الی الدَّرجةِ کَمَا بَيْنَ تَخُومِ الأَرضِ الی العَرش۔ وَمَنْ صَبَرَ عَلی المَعْصِيَةِ کَتَبَ اللهُ لَهُ تِسْعَماةَ دَرجةَ مَا بَيْنَ الدَّرَجَةِ الی الدّرجة کَمَا بَيْنَ تُخُومِ الأَرضِ الیٰ مُنْتَهی العَرْشِ (۱) و (۲)

صبر کی تین اقسام ہیں۔ مصیبت پر صبر، اطاعت میں صبر اور گناہ و معصیت کے مقابلے میں صبر۔ پس جو شخص مصیبت پر صبر کرے اور اسے اچھی طرح سے تحمل کرکے لوٹا دے تو اللہ تعالی اس کے لئے تین سو درجات لکھتاہے جن میں ایک درجے سے دوسرے درجے تک فاصلہ زمین سے آسمان کے فاصلے کے برابر ہے۔

---

(۱) جامع السعادات ج/ ۳ ص ۲۸۷۔

(۲) علمائے اخلاق نے صبر کی پانچ قسمیں بتائی ہیں:

۱۔ شہوات و خواہشات کے مقابلے میں صبر۔

۲۔ عبادات و طاعات میں صبر۔

۳۔ مصیبتوں پر صبر۔

۴۔ مستحبات و نوافل کی ادائیگی میں صبر

۵۔ ظالموں کے ظلم و آزار کے مقابلے میں صبر۔

واضح ہے کہ ظلم کے مقابلے میں صبر اچھی بات نہیں ہے کیونکہ ظلم پر خاموش رہنا حرام ہے اور انسان کو چاہیئے کہ اپنے اور دوسروں کے حقوق کا دفاع کرے۔ باقی چار میدانوں میں صبر قابل تحسین ہے۔ صبر ایمان کے نصف حصے کی تکمیل کرتاہے چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا ہے: الصَّبْرُ نِصْفُ الاِیْمانِ (دیکھئے جامع السعادات ج/ ۳ ص ۲۸۷)

اور جو اطاعت میں صبر کا مظاہرہ کرے اللہ اس کے لئے نو سو درجات لکھتا ہے جن میں سے ہر دو درجوں کا درمیانی فاصلہ اتنا ہے جتنا زمین کی گہرائیوں سے عرش کے آخری حصے تک ہے۔ اور جو بھی معصیت خدا پر صبر کرے (یعنی نفسانی خواہشات اور شہوات کے مقابلے میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے) خدا اس کے لیے نوسو درجات لکھتا ہے کہ جس میں ہر درجے کا فاصلہ دوسرے درجے سے عرش کی انتہاؤں سے زمین کی گہرائیوں تک ہے۔ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے:

میرے والد علی بن الحسینؑ (امام زین العابدینؑ) نے اپنی شہادت کے وقت مجھے سینے سے لگایا اور فرمایا: اے میرے بیٹے تجھے اس چیز کی نصیحت کرتاہوں جس کی نصیحت میرے والد نے اپنی شہادت کے وقت مجھ سے کی ہے۔

اور انہوں نے یہ وصیت اپنے والد علیؑ سے نقل کی ہے:

يَا بُنَيَّ اِصْبِرْ عَلَى الْحَقِّ وَ اِنْ كَانَ مُرّاً (۱)

اے میرے بیٹے حق کے معاملے میں ثابت قدمی اور صبر سے کام لو اگر چہ وہ تلخ ہو۔

البتہ ابتدائے امر میں صبر و ریاضت کچھ مشکل ہے لیکن جہد مسلسل کی صورت میں بہ تدریج یہ امر آسان ہوتا چلا جاتاہے۔

---

(۱) ایضاً ص ۹۱ حدیث ۱۳۰۔

پندرھواں نکتہ

نظم و ضبط
اور وقت کی تقسیم

کاموں کی پیشرفت میں بنیادی کردار ادا کرنے والے امور میں سے ایک نظم و ضبط ہے۔ شب و روز کو چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ انسان ہر کام کے لئے کوئی وقت مقرر کرے اور ہر امر کا کوئی آغاز و انجام مد نظر رکھے نیز وقت کی محدودیت اور امور کی اہمیت کے تناسب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان امور کو مقدم رکھے جن کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے۔ غیر ضروری و بے فائدہ کاموں کو اپنی زندگی کے پروگراموں سے حذف کرے۔ انسان کو چاہیئے کہ ماہ و خورشید اور روز و شب کی گردش سے نصیحت حاصل کرے اور قوانین فطرت سے درس زندگی حاصل کرے۔ اللہ تعالی زمانے سے بالا اور اس کا خالق ہے اس کے باوجود جب وہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر کرتا ہے تو وقت، روز و شب اور ماہ و سال کا تذکرہ فرماتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے لئے حرکت کے ایک خاص حصے کو وقت کے طور پر معین کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ہر چیز کو ایک خاص اندازے کے مطابق بناتا۔

اور ارشاد فرماتا ہے:

خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِیراً [1]

اس نے ہر چیز کو خلق کیا اور ایک خاص اندازے پر رکھا۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الاَرضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ [2]

جس (اللہ) نے آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے درمیان موجود اشیاء کو چھ دن میں خلق فرمایا۔

بہر حال اس قسم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس محدود عالم میں ہر چیز اور ہر کام کے لئے ایک معینہ وقت کی ضرورت ہے نیز وقت شناسی اور نظام الاوقات کی تعیین پر کائنات کے ایک بنیادی امر خدا کی توجہ رہی ہے۔

نظم و ضبط عقل و خرد کی علامت ہے

اولیائے الٰہی اپنے اوقات کی تقسیم اور نظام الاوقات کی تعیین پر ممکنہ توجہ دیتے تھے تاکہ دنیا کی محدود زندگی اور اس کے گران قیمت لمحات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کریں۔ اسی منصوبہ بندی اور منظم کوششوں کی بدولت وہ اپنے پیچھے بابرکت آثار چھوڑ گئے۔

---

(۱) سورہ فرقان / ۲۔

(۲) سورہ فرقان / ۵۹۔

حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

يَنْبَغِي لِلْمُسْلِمِ الْعَاقِلِ أَنْ يَكُونَ لَهُ سَاعَةٌ يُفْضِي بِهَا إِلَى عَمَلِهِ فِيمَا بَيْنَهُ وَ بَيْنَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَ سَاعَةٌ يُلَاقِي إِخْوَانَهُ الَّذِينَ يُفَاوِضُهُمْ وَ يُفَاوِضُونَهُ فِي أَمْرِ آخِرَتِهِ وَ سَاعَةٌ يُخَلِّي بَيْنَ نَفْسِهِ وَ لَذَّاتِهَا فِي غَيْرِ مُحَرَّمٍ فَإِنَّهَا عَوْنٌ عَلَى تِلْكَ السَّاعَتَيْنِ (1)

صاحب عقل مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنے اور اپنے رب کے مابین امور (عبادات و غیرہ) کی خاطر ایک وقت معین کرے نیز اپنے ان برادران دینی سے ملاقات کی خاطر ایک وقت مختص کرے جن کی وہ مدد کرتا ہے اور جو اس شخص کے اخروی امور میں اس کی حوصلہ افزائی اور مدد کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسے چاہیئے کہ اللہ کی عطا کردہ حلال لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے بھی ایک مخصوص وقت رکھے کیونکہ یہ حصہ ان دو حصوں کے لئے مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

---

(1) فروع کافی ج ۵ ص ۸۷۔

سولھواں نکتہ

فرصت کے لمحات کو غنیمت سمجھنا

ایک اور اہم چیز جس سے سالک راہ حق کو بھرپور طریقے سے استفادہ کرنا چاہیئے فرصت کے لمحات اور وہ مواقع و وسائل ہیں جو گاہے انسان کو نصیب ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو زندگی میں فرصت کے کچھ لمحات اور جلدی گزرنے والے مواقع ملتے ہیں جو ہمیشہ باقی نہیں رہتے۔

امام علیؑ کا ارشاد ہے:

انَّ الْفُرَصَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ فَانْتَهِزُوهَا اذا امْكَنَتْ فِي ابواب الْخَيْرِ... (۱)

بے شک فرصت کے لمحات بادل کی طرح جلدی گذر جاتے ہیں، پس جب بھی نیک کاموں کو انجام دینے کا کوئی موقع تجھے نصیب ہو تو اسے غنیمت سمجھو اور اس سے فائدہ اٹھاو۔

---

(۱) مستدرک الوسایل ج/ ۱۲ ص ۱۴۰۔

قرآن مجید لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نیک کاموں میں جلدی کریں اور ایک دوسرے سے آگے، بڑھنے کی کوشش کریں۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَ سَارِعُوا اِلیٰ مَغْفِرَةٍ مِن رَبِّکُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُها السَّمٰوٰتُ والاَرض (۱)

اپنے رب کی مغفرت و بخشش نیز آسمانوں اور زمین کے برابر جنت کی جانب سبقت کرو.....

نیز ارشاد ہوتا ہے:

فَاسْتَبِقُوا الخَیْرَاتِ (۲)

نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

رسول اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

انّ لِرَبِّکُمْ فِیْ اَیَامِ دَهْرِکُمْ نَفَحَاتٍ۔ اَلا فَتَعَرَّضُوا لَها (۳)

بے شک تمہاری عمر کے ایام میں پروردگار کی طرف سے رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں پس آگاہ رہو اور ان سے فائدہ اٹھاؤ۔

اگر چہ احتیاط اور سوچ سمجھ کر آہستہ کام کرنا عجلت پسندی سے بہتر ہے لیکن اس کے باوجود جب کوئی اچھی فرصت ہاتھ آئے تو عجلت اور جلد بازی بھی زیادہ پسندیدہ امر ہے۔ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ اچھے مواقع کو گنوا دینا غم اور پشیمانی کا باعث بنتا ہے۔

اضَاعَةُ الفرصة غُصَّةٌ (۴)

---

(۱) سورہ آل عمران / ۱۳۳۔

(۲) سورہ بقرہ / ۱۴۸۔

(۳) محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۱۵۔

(۴) فہرست موضوعی غرر ص ۳۰۳۔

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے:

مِنَ الْخُرقِ تَرکُ الْفُرصَةِ عِنْدَ الامْکَانِ (۱)

مناسب موقع گنوا دینا حماقت و نادانی کی علامت ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

یَا اَبَاذَر! نِعْمَتَانِ مَغْبُوْن فِیْهِمَا کَثِیْر مِنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَ الْفَرَاغُ

یَا اَبَاذَر اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ شَبَابَکَ قَبْلَ هَرَمِکَ وَ صِحَّتَکَ

قَبْلَ سُقْمِکَ وَ غِنَاکَ قَبْلَ فَقْرِکَ وَ فَرَاغَکَ قَبْلَ شُغْلِکَ وَ

حَیَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ (۲)

اے ابوذر دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بہت سارے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ وہ دو نعمتیں صحت اور فراغت ہیں (اس کے بعد فرمایا) اے ابوذر پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جان لو، بڑھاپے سے پہلے جوانی کو، بیماری سے پہلے صحت کو، فقر سے پہلے مالداری کو، کسی مصروفیت میں مبتلا ہونے سے پہلے فرصت کو اور موت سے پہلے زندگی کو۔

---

(۱) فہرست موضوعی غرر ص ۳۰۴۔

(۲) مستدرک الوسائل ج ۱۲ ص ۱۴۰۔

سترھواں نکتہ

بندگانِ خدا کی خدمت

ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور لوگوں کی خدمت خاص کر مومنین و صالحین کی خدمت اسلامی اخلاق کی رو سے نہایت اہمیت کی حامل ہیں اسلامی تعلیمات اور اولیاء ؑ کی سیرت سے ظاہر ہوتا ہے کہ واجبات کی ادائیگی کے بعد خدا کا قرب حاصل کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ یہی نیک صفت ہے۔

اولیاء اللہ ہمیشہ لوگوں کی خدمت کرتے تھے اور بہ نفس نفیس ان کی ضروریات پوری فرماتے تھے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی چیز پائیدار اور جاودان ہوتی ہے لیکن بے فائدہ چیز پانی کی بلبلوں کی طرح بہت جلد ختم ہوجاتی ہے اور اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

فَامَّا الزَّ بَدُ فَيَذْ هَبُ جُفَآءً وَ امَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الأَرْضِ كَذَالِكَ يَضْرِبُ اللهُ الأَمْثَالَ (۱)

---

(۱) سورہ رعد / ۲۔

رہے پانی کے بلبلے تو وہ ایک طرف ہو کر ختم ہو جاتے ہیں لیکن لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی چیز زمین میں باقی رہتی ہے (مثلاً پانی یا خالص تانبا) یوں اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں نازل ہونے والی قرآن کی آیت " وَ جَعَلَنِیْ مُبَارَکاً اَیْنَ مَا کُنْتُ "[1] کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں جَعَلَنِیْ مُبَارَکاً (اللہ نے مجھے مبارک بنایا) سے مراد جَعَلَنِی نَفَّاعاً ہے یعنی[2] اللہ نے مجھے بہت نفع پہنچانے والا بنایا معلوم ہوا کہ اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو لوگوں کے لئے بہت نفع پہنچانے والا بنایا تھا۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللہِ مَنْ نَفَعَ عِیَالَ اللہِ وَ اَدْخَلَ عَلیٰ اَهْلِ بَیْتٍ سُرُوراً[3]

مخلوقات اللہ کا کنبہ ہیں۔ پس اللہ کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو اللہ کے کنبے کو نفع پہنچائے اور کسی گھرانے کو خوش کرے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی ہے:

مَنْ طَافَ بِالْبَیْتِ اُسْبُوعاً کَتَبَ اللہُ عَزَّوَجَلَّ سِتَّةَ آلافِ حَسَنَةٍ وَ مَحَا عَنْهُ سِتَّةَ آلافِ سَیِّئَةٍ وَ رَفَعَ لَه سِتَّةَ آلافِ دَرَجَةٍ۔ وَفِیْ رِوَایَةِ اِسْحَاقِ بْنِ عَمَّارٍ وَ قَضیٰ لَه سِتَّةَ آلافِ حَاجَةٍ۔ ثُمَّ قَالَ قَضَاءُ حَاجَةِ الْمُؤمِنِ اَفْضَلُ مِنْ طَوَافٍ وَ طَوَافٍ حَتّٰی عَدَّ عَشْراً[4]

---

(۱) سورہ مریم / ۳۱۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۶۵۔

(۳) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۶۴ حدیث نمبر ۶۔

(۴) بحار الانوار ج/ ۷۱ ص ۳۲۶۔

جو شخص سات بار طواف بیت اللہ کرے اللہ تعالی اس کے نامہ اعمال میں چھ ہزار لکھتا اور اس کے چھ ہزار گناہ مٹاتا ہے اور اس کے لئے چھ ہزار درجات بلند فرماتا ہے۔ اسحاق بن عمار سے (مزید) مروی ہے (کہ امامؑ نے فرمایا) اور اللہ اس کی چھ ہزار حاجتیں پوری کرتا ہے۔ اس کے بعد امام صادقؑ فرماتے ہیں مومن کی حاجت کو پورا کرنا دس طوافوں سے افضل ہے۔

رسول گرامی اسلامؐ کا ارشاد ہے:

دَخَلَ عَبْدُ الْجَنَّةَ بِغُصْنٍ مِنْ شَوْكٍ كَانَ عَلَىٰ طَرِيقِ الْمُسْلِمِينَ فَامَاطَهُ عَنْهُ (۱)

خدا کے بندوں میں ایک بندہ مسلمانوں کے راستے میں پڑی ہوئی کانٹوں کی ایک شاخ ہٹانے کے باعث جنت میں داخل ہو گیا۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ عبادت سے مراد صرف نماز اور روزہ ہے۔ جبکہ کچھ لوگ تو اس حد تک غفلت و نادانی اور خود غرضی کے عالم میں غرق ہوتے ہیں کہ اگر ان کی آنکھوں کے سامنے لوگ بھوک کے مارے جان دے رہے ہوں تو بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اس قسم کے لوگ حج و زیارت جیسی عبادات کی خاطر سفر کے دوران بھی اپنا پورا وقت انفرادی زیارت، دعا اور مستحب اعمال میں گذار دیتے ہیں اور اپنے ہم سفر ساتھیوں کی کوئی مدد نہیں کرتے حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے درمیان کمزور و ناتوان افراد موجود ہیں جنہیں مدد کی سخت ضرورت ہے۔

---

(۱) سفینۃ البحار ج / ۲ ص ۸۲۔

رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے:

اَنسَکُ النَّاسِ نُسکاً اَنصَحُھُمْ جَیباً وَ اسلَمُھُمْ قَلباً لجمیع المُسلمِنَ (۱)

لوگوں میں سب سے عابد وہ ہے جو دوسروں سے زیادہ خیر خواہ اور تمام مسلمانوں کے معاملے میں سب سے زیادہ دل میں ہمدردی اور شفقت رکھتا ہو۔

بنابرین اگر آپ لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے والے ہوں تو آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ اللہ آپ کو پسند کرتا ہے۔ لیکن اگر آپ کے گھر یا دفتر کا دروازہ لوگوں کے لئے بند ہو اور لوگوں کی آپ تک رسائی نہ ہو تو جان لیں کہ آپ رحمت خدا وندی سے محروم ہو چکے ہیں۔ پس آپ کو خوش ہونے کے بجائے پریشان ہونا چاہیئے۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اِنَّما المؤمنُونَ فِی تَرَاحُمِھِمْ وَ تَعاطُفِھِم بِمَنزِ لَه الجَسَدِ الواحِد اذا اشْتَکیٰ مِنهُ عَضو واحِد تَداعیٰ لَه سَائِرُ الجَسَدِ بالحُمی وَ السَّھَرِ (۲)

مومنین تو بس اپنی باہمی ہمدردی اور محبت کے لحاظ سے ایک جسم کے مانند ہیں چنانچہ جب اس جسم کا ایک عضو درد میں مبتلا ہوتا ہے تو بدن کے تمام دیگر اعضاء بھی اس تکلیف میں اس کا ساتھ دیتے اور بخار و بے خوابی کا شکار ہوتے ہیں۔

---

(۱) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۶۳۔

(۲) سفینۃ البحار ج/ ۱ ص ۱۳۔

ممکن ہے کہ شیخ سعدی شیرازی نے اپنے یہ معروف اشعار اسی حدیث شریف کی روشنی میں کہے ہوں۔

بنی آدم اعضای یکدیگرند — که در آفرینش ز یک گوهرند
چو عضوی بدرد آورد روزگار — دگر عضوها را نماند قرار
تو کز محنت دیگران بی غمی — نشاید که نامت نهند آدمی (۱)

یعنی سارے انسان ایک بدن کے مختلف اعضاء ہیں کیونکہ ان کی خلقت ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے۔ جب بدن کا کوئی عضو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو دوسرے حصوں کا سکون بھی چھن جاتاہے۔ اگر تم دوسروں کی مشکلات سے بے فکر ہوجاؤگے تو تمہیں انسان کہہ کر پکارنا مناسب نہ ہوگا۔

احادیث سے معلوم ہوتاہے کہ جو شخص اللہ کی عطا کردہ نعمات کو اپنے دینی بھائیوں کی حاجت برلانے کے لئے استعمال نہ کرے وہ انہیں گناہ اور دشمنان خدا کی خاطر استعمال میں لائے گا۔

امام باقرؑ فرماتے ہیں:

مَنْ بَخِلَ بِمَعُوْنَةِ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ وَ الْقِيَامِ لَهُ فِي حَاجَتِهِ اِلاَّ ابْتُلِيَ بِمَعُوْنَةِ مَنْ يَاثِمُ عَلَيْهِ وَ لاَ يُوْجَرُ (۲)

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرنے اور اس کی حاجت پوری کرنے میں بخل سے کام لے وہ چار و ناچار کسی ایسے شخص کی مدد کرے گا جو اس کے ساتھ برائی کرے گا اور اسے کوئی اجر و صلہ بھی نہیں ملے گا۔

---

(۱) کلیات سعدی ص ۲۵۔

(۲) اصول کافی ص ۳۶۶، حدیث نمبر ۱۔

ایک اور روایت میں ابوبصیر حضرت امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

اَیُّمَا رجلٍ مِنْ شِیْعَتِنَا اَتیٰ رجُلاً مِنْ اِخْوانِہٖ فَاسْتَعَانَ بِہٖ فِیْ حَاجَتِہٖ فَلَمْ یُعِنْہُ وَ ھُوَ یَقْدِرُ اِلاّ ابْتَلَاہُ اللّٰہُ بِاَنْ یَقْضِیَ حَوائِجَ غَیْرِہٖ مِنْ اَعْدائِنَا یُعَذِّبُہُ اللّٰہُ عَلَیْھَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (۱)

اگر ہمارے شیعوں میں سے کوئی شخص اپنے کسی برادر دینی کے پاس جائے اور اس سے حاجت طلبی کرے لیکن وہ قادر ہونے کے باوجود اس کی مدد نہ کرے تو اللہ اسے اس مومن کے بجائے ہمارے دشمنوں کی مدد کرنے کی لعنت میں مبتلا کرے گا اور قیامت کے دن اللہ اس امر پر اسے عذاب میں بھی مبتلا کرے گا۔

رحمت خداوندی سے محرومی

حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

مَنْ کَانَتْ لَہُ دَارٌ فَاحْتَاجَ مُؤْمِنٌ اِلیٰ سُکْنَاھَا فَمَنَعَہُ اِیَّاھَا قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ یَا مَلَائِکَتِیْ اَبَخِلَ عَبْدِیْ عَلیٰ عَبْدِیْ بِسُکْنَی الدَّارِ الدُّنیَا وَعِزَّتِیْ وَ جَلَالِیْ لَا یَسْکُنُ جِنَانِیْ اَبدًا (۲)

جس کے پاس کوئی گھر ہو اور کسی مومن کو اس میں رہائش کی حاجت ہو لیکن وہ اسے اس گھر سے محروم رکھے تو اللہ تعالی فرمائے گا اے میرے فرشتو میرے (اس) بندے نے میرے (دوسرے) بندے کو اپنے دنیوی گھر میں رہائش کی اجازت دینے سے بخل کیوں کیا؟ مجھے قسم ہے اپنی عزت و جلال کی کہ اسے ہرگز میری جنت میں رہائش نصیب نہ ہوگی۔

---

(۱) اصول کافی ص ۳۶۶۔ حدیث نمبر۱۔ نیز وہی صفحہ اور حدیث نمبر۲ معراج السعادہ ص ۳۸۵۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۳۶۷ حدیث نمبر ۳۔

یہ احادیث اور اس قسم کی بہت ساری دوسری احادیث اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے برادر ایمانی کی حاجت پوری کرنے پر قادر ہونے کے باوجود کوتاہی کرے تو وہ اللہ تعالی کے غضب سے روبرو ہوگا اور اپنے ہاتھوں دنیا و آخرت کی ذلت و خواری کا سامان فراہم کرے گا۔

مومنوں کی حاجت روائی کا ثواب:

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

مَنْ قَضیٰ لاخیہِ الْمؤمِنِ حَاجَۃً قَضَی اللہُ عَزَّوجَلَّ لَہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِائَۃَ الفِ حَاجَۃٍ مِنْ ذَالِکَ اَوَّلُھا الجَنَّۃُ و مِنْ ذالِکَ اَنْ یَدْخلَ قَرابَتَہ وَ مَعارِفہ وَ اِخوانہ الْجَنَّۃَ بَعْدَ اَنْ لاَّ یَکُوْنُوا نُصابا (۱)

جو شخص اپنے برادر دینی کی ایک حاجت پوری کرے خداوند تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ایک لاکھ حاجتیں پوری فرمائے گا جن میں سے پہلی جنت ہے۔ اس کے علاوہ اس کے رشتہ داروں، دوستوں اور برادران دینی کو بھی جنت میں لے جائے گا بشرطیکہ وہ ناصبی نہ ہوں۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۱۹۳ حدیث نمبر ۱ (معمولی فرق کے ساتھ)۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ نے رسول اکرمؐ سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ :

مَنْ سَعیٰ فِی حَاجَةِ اَخِیْهِ الْمُؤْمِنِ فَکَاَنَّمَا عَبَدَ اللهَ تِسْعَةَ آلَافِ سَنَةٍ صَائِماً نَهَارَهُ قَائِماً لَیْلَهُ (۱)

جو شخص اپنے مومن بھائی کی حاجت روائی کی کوشش کرے گویا اس نے نو ہزار سال خدا کی عبادت اس طرح کی کہ دنوں میں روزے رکھ کر اور راتوں کو (عبادت کی خاطر) بیدار رہتے ہوئے۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ نے کمیل بن زیاد سے فرمایا :

یا کمیل ! مُرْ اَهْلَکَ اَنْ یَرُوحُوا فِیْ کَسْبِ الْمَکَارِمِ وَ یُدْلِجُوا فِیْ حَاجَةِ مَنْ هُوَ نَائِمٌ فَوَ الَّذِیْ وَسِعَ سَمْعُهُ الاَصْوَاتَ مَا مِنْ احدٍ اودعَ قَلْباً سُرُوراً اِلَّا وَ خَلَقَ اللهُ لَهُ مِنْ ذَالِکَ السُّرُورِ لُطْفاً فَاذا نَزَلَتْ بِهِ نَائِبَةٌ جَرٰی اِلَیْهَا کَالْمَاءِ فِی انحداره حَتّٰی یَطْرُدَهَا عَنْهُ کَمَا تُطْرَدُ غَرِیْبَةُ الاِبِلِ (۲)

اے کمیل اپنے گھرانے کو حکم دو کہ وہ دن کے وقت اچھی عادات و صفات اپنانے کی کوشش کریں ۔اور رات کے وقت سوئے ہوئے لوگوں کی حاجت روائی میں لگ جائیں ۔ قسم ہے اس ذات کی جو تمام آوازوں کو سنتاہے جو کوئی بھی کسی دل میں سرور داخل کرے اللہ اس سرور کے بدلے اس کے لئے اسباب لطف و مہربانی خلق فرماتاہے ۔ پس جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو اللہ کی مہربانی پانی کی طرح اس (مصیبت) کی طرف بڑھتی ہے تا کہ مصیبت سے اسکو نجات دے بالکل اسی طرح جیسے اجنبی اونٹ (اونٹوں کے گلے سے) دور کیا جاتاہے ۔

---

(۱) بحارالانوار مطبوعہ بیروت ج ۱۷، ص ۳۱۵ ۔

(۲) نہج البلاغہ فیض الاسلام حکمت نمبر ۲۴۹ ۔

خلاصہ یہ کہ دینی بھائیوں کی حاجت روائی کی اہمیت پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ اگر کوئی اپنے برادر دینی کی حاجت پورا کرنے کے لئے اقدام کرے لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہو تب بھی خدا اس کو بہت ثواب عنایت فرمائے گا۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں :

اوحَی اللہ عَزَّ وَ جَلَّ اِلٰی مُوسیٰ: اِنَّ مِنْ عِبَادِیْ مَنْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالْحَسَنَۃِ فَاُحَکِّمُہُ فِی الْجَنَّۃِ فَقَالَ مُوسیٰ یَا رَبِّ وَ مَا تِلْکَ الْحَسَنَۃُ؟ فَقَالَ: یَمْشِی مَعَ اَخِیْہِ الْمُؤْمِنِ فِی قَضَاءِ حَاجَتِہٖ قُضِیَتْ اَمْ لَمْ تُقْضَ (۱)

خداوند عالم نے موسیٰ پر وحی کی، بہ تحقیق میرے بندوں میں سے کوئی حسنہ (نیکی) کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس میں اسے جنت میں حاکم بناتا ہوں (بہشت کو اس کے حوالے کرتا ہوں) موسیٰ نے عرض کی پروردگارا وہ نیک کام کیا ہے؟ ارشاد ہوا: (وہ یہ ہے) کہ مؤمن اپنے دینی بھائی کی حاجت روائی کے لئے اس کے ساتھ چل پڑے خواہ وہ حاجت پوری ہو یا نہ ہو۔

ایک یاد دھانی

اسلامی تعلیمات کے اندر لوگوں کی حاجتوں کو نعمت و رحمت کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ بنابریں جو لوگ مالی استطاعت رکھتے ہوں یا معاشرے میں حیثیت رکھتے ہوں اور اس بناء پر لوگوں کے تقاضوں کی کثرت سے روبرو ہوتے ہوں وہ جان لیں کہ خدا کی رحمت کے دروازے ان کے اوپر کھل گئے ہیں۔ اور کسی بھی شخص کو نعمتوں کی فراوانی سے نہیں اکتانا چاہیئے۔

---

(۱) الجواہر السنیہ ص ۱۴۱ نیز اصول کافی ج ۲ ص ۱۹۵ حدیث ۱۲۔

اسی بناء پر حضرت امام حسین علیہ السلام کا ارشاد ہے:

اِنَّ حَوائجَ النّاسِ اِلَیکُمْ مِنْ نِعَمِ اللهِ عَلَیکُمْ فَلاَ تَمِلُّوا النِّعَمَ (۱)

لوگوں کا اپنی حاجتیں لے کر تمہارے پاس آنا تمہارے اوپر اللہ کی ایک نعمت ہے پس ان نعمتوں سے بیزار اور دل تنگ نہ ہونا۔

بنابریں ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ خدا کی ان رحمتوں اور نعمتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرے اور حاجت مندوں کی حاجت روائی حتی الامکان کوشش کرے۔ اگر ایسا کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہو تو کم از کم ایک حوصلہ افزا بات کے ذریعے اس کا جواب دے کیونکہ یہ رسول اللہ کی روش تھی۔

روایت ہے:

مَنْ سَألَهُ حاجَةً لَم یَرُدَّه اِلاّ بِها اَوْ بِمَیْسُورٍ مِنَ القَوْلِ (۲)

یعنی آنحضرت کسی سائل کی حاجت کو رد نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ یا تو اس کے تقاضے کو پورا فرماتے تھے یا (ایسا کر نہ سکنے کی صورت میں) حوصلہ افزا بات کے ذریعے اس کا جواب دیتے تھے۔

اے دوست تا کہ دسترسی داری	حاجت بر آر اہل تمنا را
زیرا کہ جستن دل مسکینان	شایان سعادت است توانا را

اے دوست جبتک تجھے دسترسی حاصل ہے حاجتمندوں کی حاجت روائی کر کیونکہ غریبوں کی حاجت روائی صاحب استطاعت شخص کے لئے باعث سعادت ہے۔

---

(۱) بحار الانوار ج ۱۷ ص ۳۱۸۔

(۲) المحجۃ البیضاء ج ۴ ص ۱۶۱۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَ اِمَّا تُعرِضَنَّ عَنۡهُمُ ابۡتِغَاءَ رَحۡمَةٍ مِّن رَّبِّکَ تَرجُوهَا فَقُلۡ لَّهُم قَولاً مَّیۡسُوراً[1]

اور جب رحمت خداوندی کا انتظار کرتے ہوئے ان (ناداروں) سے رخ پھیرو (یعنی مشکلات کی وجہ سے ان کی مدد نہ کر سکو) تو (کم از کم) ان کے ساتھ محبت آمیز گفتگو کرو۔

اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہؐ کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی آپؐ سے کچھ مانگتا اور آپؐ کے پاس کوئی چیز (دینے کو) نہ ہوتی تو فرماتے تھے:

"یَرۡزُقُنَا اللّٰهُ وَ اِیَّاکُمۡ مِنۡ فَضۡلِهٖ"[2]

یعنی امید ہے اللہ ہم آپ کو اپنے فضل و کرم سے روزی عطا فرمائے گا۔

لوگوں کے درمیان صلح کروانا

سماجی خدمات میں سے ایک اہم خدمت لوگوں میں صلح صفائی کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے جد و جہد کرنا اخلاقی تعلیمات کا ایک حصہ ہے۔ قرآن مجید اور احادیث اہل بیتؑ میں اس بات کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ یہاں ہم ان آیات و احادیث میں سے بعض کا تذکرہ کریں گے۔

قرآن اور اصلاح بین الناس

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُونَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوا بَیۡنَ اَخَوَیۡکُمۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُونَ[3]

---

(۱) سورہ اسراء / ۲۸۔

(۲) تفسیر مجمع البیان طبع اسلامیہ ج ۳ ص ۴۱۱۔

(۳) سورہ حجرات / ۱۰۔

مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

احادیث میں لوگوں کے درمیان صلح صفائی کا بیان

احادیث میں آپس میں صلح صفائی کرانے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور لوگوں کو مختلف طریقوں سے کہیں اسے بہترین صدقہ اور کہیں بہترین عبادت وغیرہ کہہ کر اس امر کی ترغیب دی گئی ہے۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

اَفْضَلُ الصَّدَقَۃِ اِصْلاَحُ ذَاتِ الْبَیْنِ (۱)

بہترین صدقہ آپس میں صلح کرا دینا ہے۔

خصوصی فنڈ

مومنین کے درمیان صلح برقرار کرنا رہبران دین کی نظر میں اس قدر اہم ہے کہ حضرت امام صادقؑ شیعوں کے مالی اختلافات کو دور کرنے کی خاطر اپنے اموال کا ایک حصہ مختص فرماتے تھے تاکہ اس کی ادائیگی کے ذریعے نزاع کا خاتمہ ہو۔

چنانچہ آپؑ نے اپنے ایک صحابی مفضل سے فرمایا:

اِذَا رَاَیْتَ بَیْنَ اِثْنَیْنِ مِنْ شِیْعَتِنَا مُنَازَعَۃً فَافْتَدِهَا مِنْ مَالِي (۲)

یعنی جب تم ہمارے دو شیعوں کے درمیان (مالی) نزاع کا مشاہدہ کرو تو میرے مال سے اس کا ازالہ کرو۔

---

(۱) کنز العمال ج ۳ ص ۵۸۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۲۰۹۔

سب سے بڑی عبادت:

امیر المؤمنین حضرت علیؑ کی نظر میں لوگوں کے درمیان صلح کرانا سب سے بڑی عبادت ہے۔ آپؑ نے بستر شہادت پر اپنے بیٹوں کو وصیتیں کرتے ہوئے فرمایا:

فَاِنّی سَمِعْتُ جَدَّکُمَا صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ صَلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ اَفْضَلُ مِنْ عَامَّةِ الصَّلَاةِ وَالصِّیَام (۱)

میں نے آپ دونوں کے ناناؐ کو یہ فرماتے سنا ہے، کہ لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرا دینا تمام نمازوں اور روزوں سے افضل ہے۔

اصلاح کی خاطر جھوٹ:

اگر چہ قرآن اور احادیث میں جھوٹ بولنے کی بہت مذمت ہوئی ہے اور اس کا شمار گناہان کبیرہ میں ہوا ہے لیکن اگر کوئی جھوٹ کے ذریعے دو افراد میں صلح و صفائی برقرار کر سکتا ہو تو لوگوں میں صلح کرانے کی اہمیت کے پیش نظر اس جھوٹ کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ حضرت امام علیؑ ایک حدیث میں یوں فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللهِ لَا یَصْلُحُ الْکِذْبُ اِلَّا فِیْ ثَلٰثَةِ مَوَاطِنَ ....

وَکِذْبُ الرَّجُلِ یَمْشِیْ بَیْنَ الرَّجُلَیْنِ لِیُصْلِحَ بَیْنَهُمَا (۲)

یعنی رسول اللہؐ نے فرمایا، جھوٹ بولنا اچھی بات نہیں مگر تین موقعوں پر جن میں سے ایک اس شخص کا جھوٹ ہے جو دو افراد کے درمیان صلح کی کوشش کر رہا ہو۔

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح ص ۴۲۱۔

(۲) اشعثیات ص ۱۷۱۔

دین سے خارج ہونے کا خطرہ

دینی بھائیوں کے درمیان صلح و صفائی کا برقرار رہنا اس قدر ضروری اور اہم ہے کہ اگر دو مسلمان تین دن سے زیادہ ایک دوسرے سے ناراض رہیں تو وہ اسلام کے دائرے سے نکل جاتے ہیں۔

چنانچہ رسول اللہؐ سے منقول ہے:

اَیُّمَا مُسْلِمَیْنِ تَهَاجَرَا فَمَکَثَا ثَلَاثاً لَا یَصْطَلِحَانِ اِلَّا کَانَا خَارِجَیْنِ مِنَ الاِسْلَامِ وَلَمْ یَکُنْ بَیْنَهُمَا وِلَایَة فَاَیُّهُمَا سَبَقَ اِلٰی کَلَامِ اَخِیْهِ کَانَ السَّابِقَ اِلٰی الجَنَّةِ یَوْمَ الْحِسَابِ (۱)

جو بھی دو مسلمان ایک دوسرے سے تعلقات توڑ لیں اور تین دن صلح کئے بغیر اسی حالت پر رہیں وہ دونوں اسلام سے خارج ہوجائیں گے اور ان دونوں کے درمیان (دینی) رشتہ باقی نہیں رہے گا۔ پھر ان دونوں میں سے جو اپنے بھائی سے بات کرنے میں پہل کرے وہ قیامت کے دن پہلے جنت میں جائے گا۔

شیطان کی خوشنودی

شیطان چاہتاہے کہ مسلمانوں کے درمیان عداوت پیدا ہو جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُوقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ ..... (۲)

شیطان تو بس یہی چاہتاہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور کینہ پیدا کرے۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۳۴۵ حدیث ص ۵۔

(۲) سورۃ مائدہ / ۹۱۔

یہی وجہ ہے کہ جب دو مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور عداوت پیدا ہوجائے تو شیطان خوش ہوتاہے اور یہ کوشش کرتاہے کہ وہ دونوں اسی حالت پر باقی رہیں۔

چنانچہ حضرت امام باقرؑ فرماتے ہیں:

انَّ الشَّیْطَانَ یُغْرِیْ بَیْنَ الْمُؤمِنِیْنَ مَا لَمْ یَرجِعْ احَدهُمْ عَنْ دِیْنِہ فَاذا فَعَلُوا ذالکَ اسْتَلْقیٰ عَلٰی قَفَاہُ وَ تَمَدَّ دَ ثُمَّ قَالَ فُزتُ فَرحَمَ اللہ امْرءاً اَ اَلَّفَ بَیْنَ وَلیَّینِ لَنَا یَامَعْشَرَ الْمُؤمِنِینَ تَاَلَّفُواوَ تَعَاطفوا (۱)

شیطان مومنین کے درمیان اس وقت تک عداوت کے بیج بوتا رہتاہے جب تک ان میں سے کوئی اپنے دین سے پھر نہیں جاتا پس جب وہ ایسا کرتے ہیں (دین سے پھر جاتے ہیں) تو شیطان پیٹھ کے بل لیٹ جاتا (اور سکھ کا سانس لیتاہے) اور کہتاہے میں کامیاب ہوگیا۔ پس اللہ رحم کرے اس شخص پر جو ہمارے دو دوستوں کے درمیان الفت کا رشتہ برقرار کرے۔ اے مومنو! آپس میں مہر و محبت کا رشتہ قائم رکھو۔

اس قدر تاکید کیوں؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتاہے کہ اسلام نے لوگوں کے مابین صلح و صفائی برقرار کرنے کو اتنی اہمیت کیوں دی ہے، یہاں تک کہ رسول اکرمؐ نے تین دن سے زیادہ عرصے تک دو مسلمانوں کے درمیان اختلاف کو ناجائز قرار دیاہے اور فرمایا ہے:

لاَ هِجْرَةَ فَوْقَ ثَلاَثٍ (۲)

تین دن سے زیادہ ایک دوسرے سے ناراض رہنا جائز نہیں؟

---

(۱) اصول کافی ج/ ۲ ص ۳۴۵ حدیث ۶۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲۔ حدیث ۲ ص ۳۴۴ نیز صحیح مسلم ج/ ۲ ص ۲۷۹۔

نیز اگر دو آدمی ایک دوسرے سے ناراض ہونے کے سبب قطع تعلق کریں تو لعنت خداوندی کے مستحق کیوں ٹھہرتے ہیں جیسا کہ مفضّل نے امام صادقؑ سے نقل کیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لا یَفْتَرِقُ رَجُلَانِ عَلَی الْهِجْرَانِ اِلاّ اسْتَوْجَبَ اَحَدُهُمَا الْبَرَآئَةَ وَ اللَّعْنَةَ وَ رُبَّمَا اسْتَحَقَّ ذٰلِکَ کِلاَهُمَا (۱)

جب بھی دو آدمی ایک دوسرے سے ناراض ہو کر الگ ہو جاتے ہیں تو ان میں سے ایک خدا کی لعنت کا مستحق قرار پاتا ہے اور گاہے وہ دونوں اس کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

اور یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت امام صادقؑ نے اپنے مال کے ایک حصے کا اختیار مفضل کو کیوں دیا تا کہ وہ امامؑ کے شیعوں کے درمیان اختلاف پڑنے اور صلح کی کوئی اور راہ نہ ہونے کی صورت میں اس مال سے ان کے درمیان صلح برقرار کرے؟ کیا وجہ ہے کہ باہمی اختلاف کو مٹانا مستحب روزوں اور نمازوں سے بہتر قرار پایا؟ اگر چہ ان سوالوں کا جواب (کامیابی اتحاد کے سائے میں) کی بحث کے تحت دیا جا چکا ہے، لیکن یاد دہانی کے طور پر دوبارہ دہرا رہے ہیں کہ اگر کوئی اس بارے میں غور و فکر کرے تو جان لے گا کہ کسی قوم کی عظمت، شان و شوکت، سربلندی اور سرفرازی کے اسباب تب فراہم ہوتے ہیں جب اس قوم کے افراد کے درمیان مکمل اتحاد و یگانگت اور محبت موجود ہو، اور وہ ایک دوسرے کے تعاون سے مشکلات پر قابو پالیں۔ لیکن اگر معمولی اختلافات حل نہ ہوں اور کوئی ان کی اصلاح کی فکر نہ کرے تو عداوت و دشمنی کی جڑیں بتدریج دلوں میں گہری ہوتی جاتی ہیں اور معاشرے کا اتفاق افتراق میں بدل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی معاشرے کا اختلاف و افتراق اس معاشرے کے زوال اور اس کی بدبختی کی علامت ہی تو ہے۔

---

(۱) اصول کافی ج/ ۲ ص ۳۴۴ حدیث ۱۔

یتیموں کی سرپرستی

اخلاقی خوبیوں میں سے ایک یتیموں کی سرپرستی اور ان کے ساتھ لطف و مہربانی کا مظاہرہ کرنا ہے انسانوں کی زندگی میں ایسی مشکلات اور محرومیاں ہوتی ہیں جن کا علاج صرف الفت و محبت کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے۔ ان انسانوں کے درمیان یتیم بچے زیادہ پیار و محبت کے نیازمند ہیں ۔ کیونکہ یہ بچے اپنے باپ یا ماں سے محروم ہونے کی وجہ سے مہر و محبت کے ایک سرچشمہ سے دور ہوگئے ہیں لھذا سب سے زیادہ یہ بچے محبت و شفقت کے محتاج ہیں یہ بات۔ واضح ہے کہ ہر معاشرے میں ایسے افراد ضرور موجود ہوتے ہیں کیونکہ کوئی بھی معاشرہ ایسے ناگوار حادثات سے خالی نہیں خصوصاً اسلامی معاشرہ جس میں جہاد اور دفاع اہم واجبات میں سے ہونے کی بناء پر کچھ لوگ اپنے والدین سے محروم ہوکر بے سرپرست رہ جاتے ہیں بنابرین اسلام نے یتیموں کے مسئلے کو ایک اہم اور بنیادی مسئلہ قرار دیا ہے اور مسلمانوں پر ان کی زندگی کے بارے میں ہر لحاظ سے اقتصادی ، نفسیاتی ، تعلیمی ، تربیتی اور دیگر ضروریات کے لحاظ سے ذمہ داری عاید کی ہے ۔

یہاں بات صرف یہی نہیں کہ ان کی معاشی ضروریات کیسے پوری کی جائیں کیونکہ انسانی ضروریات صرف خوراک اور لباس سے عبارت نہیں ۔ انسان محبت کا بھی پیاسا ہوتا ہے اور وہ جذبات و عواطف سے بھی سرشار ہوتا ہے۔ وہ انسان جس کی فطرت میں مہرو محبت رکھی گئی ہو ۔ وہ مہر و محبت سے خالی زندگی کیسے گزار سکتا ہے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مہر و محبت کے علاوہ کوئی چیز ماں باپ کے فقدان سے پیدا ہونے والے خلا کو پر نہیں کر سکتی ۔ اگر ہر گھرانہ ایک یا دو یتیموں کی کفالت و سرپرستی قبول کرے اور ان کی صرف معاشی ضروریات پوری کرنے پر ہی اکتفا نہ کرے تو کتنی اچھی بات ہے۔ یتیم خانوں کی تعمیر اور اس قسم کے اداروں کی مالی اعانت بہت اچھی بات ہے لیکن یہ کام والدین کے فقدان کے خلا کو پورا نہیں کر سکتا کیونکہ بچہ ہر چیز سے زیادہ مہربان والدین کا خواہاں ہوتا ہے ۔

پیغمبر اسلامؐ جو پیامبر رحمت اور رحمت للعالمین ہیں نے بذات خود یتیمی کی تلخی کو چکھا تھا۔ آپؐ نے یتیموں کے مسئلے میں تاکیدی حکم فرمایا ہے۔ حضورؐ نے مختلف الفاظ میں مختلف موقعوں پر مسلمانوں کو یتیموں کا احترام کرنے کی ترغیب اور ان کی سرپرستی کرنے کا حکم دیا اور خود بھی بنفس نفیس یتیموں کی سرپرستی اور مدد فرماتے رہے۔

ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے:

اَحَبُّ الْبُیُوتِ بَیْتٌ فِیْہِ یَتِیْمٌ مُکْرَمٌ [1]

سب سے زیادہ پسندیدہ گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم
عزت و احترام کی زندگی گزارتا ہو۔

مذکورہ باتوں کی روشنی میں اس نکتے کی یاد آوری ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے یتیموں کے مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ آدمی یتیم بچوں کو اپنے گھرانے میں اس طرح شامل کرلے کہ یتیم خود کو اس گھرانے کا ایک فرد خیال کرے۔ نیز یتیموں کی مدد اس قدر عزت و احترام کے ساتھ ہو کہ وہ سرافرازی اور سربلندی کے ساتھ زندگی گزاریں اور انہیں اپنے بارے میں حقارت، بے چارگی اور بے کسی کا ہرگز احساس نہ ہو! آئیے یہاں بعض آیات و احادیث کا ذکر کریں تاکہ ان کی روشنی میں ہمیں اس عظیم دینی، انسانی اور اخلاقی ذمہ داری سے متعلق مزید حاصل ہو۔

---

(۱) تفسیر مراغی ج ۳ ص ۱۴۹۔

قرآن میں یتیموں کا ذکر

قرآن میں یتیموں کے بارے میں متعدد آیات موجود ہیں ۔ بعض آیات میں یتیموں سے بے اعتنائی کو کفر و نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

ارأيتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّین فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ (۱)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روز قیامت کو جھٹلاتا ہے ؟ یہی وہ شخص ہے جو یتیم کو دھتکارتا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے :

کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُونَ الْیَتِیْمَ وَ لَا تَحَاضُّونَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۲)

ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ تم یتیموں کا احترام نہیں کرتے ہو اور ایک دوسرے کو مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے ہو ۔

اللہ تعالی اپنے رسول کو ان کی یتیمی کی یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے :

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْماً فَآوٰی (۳)

کیا اس نے تم کو یتیم پاکر پناہ نہیں دی ؟

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے :

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ (۴)

پس اب تم یتیم پر قہر نہ کرنا۔

احادیث پر ایک نظر

یتیموں کے حقوق کے بارے میں رسول خداؐ اور ائمہ معصومینؑ سے کافی احادیث

---

(۱) سورہ ماعون / ۱ و ۲۔

(۲) سورہ فجر / ۱۷، ۱۸۔

(۳) سورہ الضحیٰ / ۶۔

(۴) سورہ الضحیٰ / ۹۔

مروی ہیں۔ ان احادیث میں یتیموں کے ساتھ نیکی کی ہدایت کے ساتھ ساتھ اس کام کے اچھے آثار اور عظیم ثواب کی نوید بھی سنائی گئی ہے۔ یہاں ہم صرف چند احادیث کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

بہشت کی خوشخبری

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

مَنْ کَفَّلَ یَتِیْماً و نَفَقَتَہ کُنْتُ انا و ھُوَ فِی الْجَنَّۃِ کَھَاتَیْنِ وَ قَرَنَ بَیْنَ اصبعَیہ المسبّحۃ وَ الْوُسْطیٰ (۱)

جو شخص کسی یتیم کی سرپرستی کرے اور اس کا خرچ برداشت کرے میں اور وہ جنت میں یوں ساتھ ہوں گے۔ یہ کہکر حضورؐ نے اپنی دو انگلیوں یعنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو ساتھ ملایا۔

دل کی نرمی اور حاجت روائی

یتیم نوازی کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ انسان کا دل نرم ہوتا ہے اور اس کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا:

اَتُحِبُّ اَنْ یَلِیْنَ قَلْبُکَ وَ تُدْرِکَ حَاجَتَکَ ؟ اِرْحَمِ الْیَتِیْمَ وَ امْسَحْ راسَہ وَ اَطْعِمْہُ مِنْ طَعَامِکَ یَلِیْنَ قَلْبُکَ وَ تُدْرِکَ حَاجَتَکَ (۲)

کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا دل نرم ہو جائے اور تمہاری حاجت روا ہو جائے؟ یتیم پر رحم کرو اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرو اور اپنے کھانے میں سے اسے کھلاؤ اس صورت میں تیرا دل نرم ہو جائے گا اور تیری حاجت پوری ہوگی۔

---

(۱) قرب الاسناد ص ۴۵۔

(۲) العمال ج ۳ ص ۱۶۹۔ حدیث نمبر ۶۰۰۔

درجات میں اضافہ اور گناہوں کی بخشش

ایک حدیث نبوی کے الفاظ یہ ہیں :

وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لاَ یَلِیْ مُسْلِم یَتِیْماً فَیُحْسِنُ وَ لاَ یَتَہٗ وَ یَضَعُ یَدَہٗ عَلٰی رَاسِہٖ اِلاَّ رَفَعَہُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ بِکُلِّ شَعْرَۃٍ دَرَجَۃً وَ کَتَبَ لَہٗ بِکُلِّ شَعْرَۃٍ حَسَنَۃً وَ مَحیٰ عَنْہُ بِکُلِّ شَعْرَۃٍ سَیِّئَۃً (۱)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جو مسلمان کسی یتیم کی سرپرستی کرے اور اچھے طریقے سے اس کی سرپرستی سے عہدہ برآں ہو اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ کے دائرے میں آئے ہوئے ہر بال کے بدلے اس کے مقام میں ایک درجے کا اضافہ فرماتاہے ایک نیکی لکھنے کے ساتھ ایک گناہ کو محو فرماتاہے۔

یتیم کو پناہ دینے کا ثواب بہشت میں سکونت

حدیث میں مذکور ہے کہ جو لوگ بے گھر یتیموں کو پناہ دیں اور اپنے گھر میں ان کی آؤ بھگت کریں اللہ تعالیٰ ان کو بہشت میں سکونت سے نوازے گا۔

حضرت امام باقرؑ کا ارشاد ہے :

اَرْبَعٌ مَنْ کُنَّ فِیْہِ بَنَی اللّٰہ لَہ بَیْتاً فِی الْجَنَّۃِ مَنْ آوَی الْیَتِیْمَ وَ رَحِمَ الضَّعِیْفَ وَ اشْفَقَ عَلٰی وَالِدَیْہِ وَ رَفِقَ بِمَمْلُوکَۃ (۲)

جس شخص کے اندر یہ چار خصلتیں پائی جائیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بناتاہے جو کسی یتیم کو پناہ دے ، کمزور پر رحم کرے ، اپنے والدین کے ساتھ شفقت سے پیش آئے اور اپنے غلام سے نرمی کرے۔

---

(۱) کنز العمال ج ۳ ص ۶۰۳۰۔

(۲) خصال صدوق ج/ ۱ ص ۲۱۱۔

یتیم کو چپ کرانے کا ثواب

یتیم بچوں کی پریشانی اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ رسول اللہ فرماتے ہیں:

اذا بَکَی الیَتِیمُ وَقَعَتْ دُمُوعُہُ فِی کَفِّ الرَّحمٰنِ وَ یَقُولُ تَعَالیٰ مَنْ اَبْکَیٰ ھٰذا الیَتِیمَ الّذِیْ وَارَیْتُ وَالِدَہُ فِی التّراب؟ مَنْ اَسْکَتَہُ فَلَہُ الجَنّۃُ۔ (۱)

جب یتیم روتاہے تو اس کے آنسو خداوند رحمان کی ہتھیلی میں جا گرتے ہیں اور وہ فرماتاہے، کس نے اس یتیم کو جس کے باپ کو میں نے مٹی کے نیچے چھپایا لایا ہے؟ جو شخص اسے خاموش کرائے اس کے لئے بہشت ہے۔

بہر حال جو مسلمان اس بات کا مدعی ہو کہ وہ اخلاق حسنہ کا مالک ہے اسے چاہیئے کہ اس دعوی کو عملی جامہ پہنائے۔ اسے چاہیئے کہ یتیم بچوں اور بے سرپرست گھرانوں کی سرپرستی کرے، ان کی خبر لے اور امیرالمومنین حضرت علیؑ کی اس وصیت کو پیش نظر رکھے۔ جو آپؑ نے اپنی شہادت سے ذرا پہلے کی اور فرمایا:

اللہ اللہ فِی الاَیتَامِ فَلاَ تُغبُّوا اَفْوَاھَھُمْ وَلاَ یَضِیْعُوا بِحَضْرَتِکُمْ (۲)

خدارا! خدارا! یتیموں کا خیال رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم انہیں کبھی سیر اور کبھی بھوکا رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری موجودگی میں تلف ہو جائیں۔

---

(۱) تفسیر فخر رازی ج / ۳۱ ص ۲۲۰۔

(۲) نہج البلاغہ صبحی صالح ص ۴۲۱ وصیت ۴۷۔

اٹھارھواں نکتہ

اللہ پر توکل اور اعتماد

عملی اخلاق کے ابتدائی مراحل میں سے ایک مرحلہ نیز ایمان اور عادات حسنہ کا ایک اور مظہر اللہ پر توکل و اعتماد ہے۔ قرآن کریم اور احادیث معصومینؑ میں توکل کے بارے میں غیر معمولی اور گرانقدر نکات مذکور ہیں۔ اس کتاب میں ہم ان کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کریں گے۔

قرآن میں توکل کا بیان

قرآن مجید متعدد مقامات پر توکل کو مومنوں کی صفت قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَ عَلَى اللهِ فَتَوَكَّلُوا اِنْ كُنْتُمْ مُؤمِنِينَ (۱)

اگر تم لوگ مومن ہو تو اللہ پر توکل کرو۔

وَ عَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمؤمِنُونَ (۲)

ایمان والوں کو چاہیئے کہ وہ فقط اللہ پر توکل کریں۔

قرآن کی رو سے توکل کی اہمیت آپ پر واضح ہوگئی اب ہم توکل کے مفہوم کی طرف آپ کی توجہ مبذول کریں گے۔

---

(۱) سورہ مائدہ / ۲۳۔

(۲) آل عمران / ۱۲۲۔

توکل کیا ہے؟

سال النَّبِیُّ جِبْرَئیلَ مَا التَّوَکُّلُ عَلَی اللهِ عَزَّوَ جَلَّ ؟ فَقَالَ الْعِلْمُ بِانَ الْمَخْلُوقَ لاَ یَضُرُّ وَ لاَ یَنْفَعُ وَ لاَ یُعْطِیَ وَ لاَ یَمْنَعُ واسْتِعْمالُ الیَاسِ مِنَ الْخَلْقِ - فَاذا کَانَ الْعَبْدُ کَذٰ الِکَ لَمْ یَعْمَلْ لِاَ حَدٍ سِوَ ی اللهِ وَ لَم یَرْ جُ وَ لَمْ یَخَفْ سِوَ ی اللهِ وَ لَمْ یَطْمَعْ فِی احَدٍ سَوی اللهِ فَھذا ھُوَ التَّوَ کُّلُ (۱)

رسول اللہؐ نے جبریل سے پوچھا کہ اللہ پر توکل کا مفہوم کیا ہے؟ جبریل نے جواب دیا اس سے مراد اس بات کا یقین ہے کہ مخلوق نہ ضرر پہنچا سکتی ہے نہ فائدہ۔ نہ کچھ دے سکتی ہے اور نہ روک سکتی ہے نیز توکل یہ ہے کہ مخلوق سے کوئی امید نہ رکھی جائے۔ پس جب کوئی بندہ اس حالت کو پہنچ جائے تو وہ اللہ کے سوا کسی کے لیے عمل انجام نہیں دے گا کسی پر امید اور کسی کا خوف نہیں رکھے گا اور کسی کو اپنی خواہشات کا محور قرار نہیں دے گا یہی توکل کا مطلب ہے۔

مختصر یہ کہ انسان کو چاہیئے کہ ہر چیز کا محور اللہ کو قرار دے اور اپنے آپ کو اس کی قدرت لایزال سے وابستہ سمجھے نیز اسی ربط کے طفیل پانی کے اس قطرے کی طرح جو سمندر کا حصہ بنتا ہے مشکلات کے متلاطم سمندر میں کود پڑے اور کسی چیز سے نہ ڈرے کیونکہ

قطرہ چون متصل بہ دریا شد　　　　تو دگر قطرہ اش مخوان دریاست

جب پانی کا قطرہ سمندر کا حصہ بن جائے تو اس کے بعد اسے قطرہ مت کہو کیونکہ اب وہ قطرہ نہیں سمندر ہے۔

---

(۱) بحارالانوار مطبوعہ بیروت ج ۶۸ ص ۱۳۸۔

توکل کے بارے میں علامہ طباطبائی کا بیان

علامہ طباطبائی مرحوم (قدس سرہ) فرماتے ہیں: حقیقت یہ ہے کہ مادی دنیا میں ارادے کو عملی جامہ پہنانے اور مقصد تک رسائی کے لئے مادی اور روحانی اسباب و علل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب انسان میدان عمل میں اتر تا ہے اور ضرورت کے تمام ظاہری و مادی اسباب فراہم کرتا ہے تو اب مقصد تک رسائی کی راہ میں صرف چند معنوی و روحانی عوامل (مثلاً عزم و ارادے کی سستی، ڈر، غم و اندوہ، عجلت پسندی، بے اعتدالی، بے وقوفی، بے تجربہ کاری اور علل و اسباب کی تاثیر کے بارے میں بدگمانی وغیرہ) حائل ہوتے ہیں۔

اس حالت میں اگر کسی کو اللہ تعالی پر توکل ہو تو اس کا عزم و ارادہ قوی اور روحانی رکاوٹیں توکل کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دیتی ہیں کیونکہ انسان توکل کی صورت میں مُسَبِّبُ الاَسْبَاب (جو تمام اسباب کو پیدا کرنے والا ہے) کے ساتھ مربوط ہوجاتاہے اور اس ارتباط کی موجودگی میں کسی قسم کی پریشانی اور تشویش کی گنجائش نہیں رہتی۔ یوں وہ شخص عزم راسخ کے ساتھ رکاوٹوں کا مقابلہ کرتاہے تاکہ منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ علاوہ ازیں توکل کا دوسرا پہلو اس کا غیبی اور ماوراء الطبعی پہلو ہے یعنی اللہ تعالی صاحب توکل انسان کی غیبی امداد اس طرح سے کرتاہے کہ جس کا اسے گمان بھی نہ ہو۔

بظاہر یہ آیت و من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ اسی قسم کی مدد کی نوید سناتی ہے۔ توکل کے بارے میں معصومینؑ کی بعض احادیث سے بھی علامہ طباطبائی کے کلام کی تائید ہوتی ہے۔

مثلاً امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

" مَنْ تَوَكَّلَ عَلَى اللهِ ذَلَّتْ لَهُ الصِّعَابُ وَ تَسَهَّلَتْ عَلَيْهِ الأسْبَابُ وَ تَبَوَّءَ الْخَفْضَ وَ الْكَرَامَةَ " (۱)

جو شخص اللہ پر توکل کرے اس کے لئے مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔ اسباب و وسائل کی راہ ہموار ہوتی ہے اور وہ عزت و سکون حاصل کرتا ہے (زندگی آرام و سکون سے گزرتی ہے۔

اس حدیث میں ان روحانی و معنوی عوامل کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر علامہ طباطبائی کے کلام میں ہوا یہ حدیث واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صاحب توکل انسان اس قسم کی مشکلات پر غالب آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طِیَرَہ یعنی بدشگونی (جو ایک منفی درونی عامل ہے اور بہت سے لوگوں کے اذہان پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی قوت عمل متاثر ہوتی ہے) کا اثر توکل کرنے والوں پر نہیں ہوتا۔

رسول گرامیؐ اسلام کا فرمان ہے:

الطِّيَرَةُ شِرْكٌ وَ مَا مِنَّا إِلَّا، وَلَكِنَّ اللهَ يُذْهِبُهُ بِالتَّوَكُّلِ (۲)

طیرہ (فال بد لینا) شرک ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی اس میں مبتلا ہے لیکن اللہ تعالیٰ توکل کے باعث اس (کی نحوست) کو بر طرف فرماتا ہے۔

---

(۱) شرح غرر ج ۵ ص ۴۲۵۔

(۲) سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۷۰۔

یہ دنیا عالم اسباب ہے اور انسان اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے ذرائع و اسباب کا سہارا لینے اور لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھنے پر مجبور ہے لیکن بنیادی اور اہم نکتہ یہ ہے کہ اگر چہ انسان اپنی دنیوی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے وسائل و اسباب کا محتاج ہے لیکن اسے چاہیئے کہ وہ " مُسَبِّبُ الاَ سْباب "کو فراموش نہ کرے بلکہ وسائل و اسباب کو ذات احدیت اور اس کے ارادے کا ایک پرتو سمجھے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مخلوق کو خالق اور قادر کو مقہور و مغلوب سمجھنے لگے۔

کیونکہ:

وَ مَنْ یَتَوَکَّلْ عَلَی اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۔ اِنَّ اللهَ بَالِغُ اَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللهُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدرا (۱)

جو کوئی اللہ پر توکل کرے اللہ اس کے لئے کافی ہے۔ بہ تحقیق اللہ اپنے فرمان کو انجام تک پہنچاتاہے اور اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

توکل کے آثار قرآن کی زبانی

اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ توکل عجیب اثرات کا حامل ہے۔ یہ اثرات انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ توکل کے آثار اس قدر عظیم ہیں کہ جب تک انسان اس وادی میں قدم نہ رکھے اس وقت تک وہ اس کی اصل حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہاں ہم قرآن مجید کی روشنی میں توکل کے بعض آثار کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

---

(۱) سورہ الطلاق / ۳۔

۱۔ قوت فیصلہ

فاذا عَزَمتَ فتَوَکَّلْ عَلَی اللہِ اِنَّ اللہَ یُحِبُّ الْمُتوَکِّلِیْنَ (۱)

جب تم عزم و ارادہ کر چکو تو اللہ پر توکل کرو۔ کیونکہ اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتاہے۔

۲۔ شجاعت

وَ لاَ تُطِعِ الْکَافِرِیْنَ وَ الْمُنَافِقِیْنَ ودَعْ اَذٰیھُمْ وَ تَوَکَّلْ عَلَی اللہِ وَ کَفٰی بِاللہِ وَکِیْلاً (۲)

اور کافروں اور منافقوں کی پیروی نہ کر نیز ان کی اذیتوں کی پرواہ نہ کرو اور اللہ پر توکل کرو۔ اللہ کی حمایت تمہارے لئے کافی ہے (یعنی توکل کے سائے میں کسی سے نہ ڈرو)۔

۳۔ ترک گناہ اور شیطان کے غلبہ سے رہائی

اِنَّہ لَیْسَ لَہ سُلْطَانٌ عَلَی الَّذِیْنَ آمَنُوا وَ عَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (۳)

یعنی شیطان کو ان لوگوں پر کوئی تسلط حاصل نہیں جو ایمان لے آئے ہیں اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔

پس جس قدر آپ کا ایمان و توکل محکم ہوگا اسی حساب سے آپ شیطان کے قابو سے آزاد ہوں گے۔ نتیجتاً آپ گناہ و انحراف سے بچے رہیں گے۔

---

(۱) سورہ آل عمران / ۱۵۹۔

(۲) سورہ احزاب / ۴۸۔

(۳) سورہ نحل / ۹۹۔

۴۔ لوگوں کی حمایت و مخالفت سے بے نیازی اور حادثات سے لاپروائی

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلاً [1]

آپ ان سے اعراض کریں (ان کی سازشوں سے نہ ڈریں) اور اللہ پر بھروسہ کریں۔ اللہ اس کام کو ذمہ لینے کے لئے کافی ہے۔

توکل کے آثار احادیث کی روشنی میں

معصومینؑ کی احادیث میں توکل کے اچھے آثار بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ قوت اور شجاعت

حدیث نبوی ہے:

مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَكُوْنَ اَقْوَى النَّاسِ فَلْيَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ [2]

جو شخص لوگوں میں سب سے زیادہ طاقتور بننے کا خواہشمند ہو اسے چاہیئے کہ اللہ پر توکل کرے۔

۲۔ توکل اور بلند ہمت

حضرت جواد الائمہؑ فرماتے ہیں:

اَلثِّقَةُ بِاللّٰهِ تَعَالٰى ثَمَنٌ لِكُلِّ غَالٍ وَ سُلَّمٌ اِلٰى كُلِّ عَالٍ [3]

اللہ پر توکل و اعتماد ہر قیمتی چیز کی قیمت اور تمام بلندیوں (تک پہنچنے کی) سیڑھی ہے۔

---

(۱) سورہ نساء / ۸۱۔

(۲) مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۲۸۸۔

(۳) بحارالانوار ج ۷۵ ص ۳۶۴۔

۲۔ توکل اور ذوق عمل

رایَ رسُولُ اللهِ قَوْماً لاَ یَزْرَعُونَ قالَ مَا اَنْتُمْ ؟ قَالُوا نَحْنُ الْمُتَوَکِّلُونَ قَالَ بَلْ اَنْتُمُ المتکلون (۱)

رسول اللہؐ نے ایک جماعت کو دیکھا جو کھیتی باڑی نہیں کرتی تھی۔ آپؐ نے فرمایا تم کیا ہو؟ بولے ہم اللہ پر توکل کرنے والے ہیں۔ فرمایا تم اللہ پر توکل نہیں کرتے بلکہ دوسروں پر بوجھ ہو۔

خلاصہ یہ کہ مومن اور تربیت شدہ افراد اپنے کاموں کو خدا کے حوالے کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے تمام مراحل میں اسے ہی اپنا پشت پناہ سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت امام سجادؑ خداوند متعال سے ایسا توکل مانگتے ہیں جو صدق و حقیقت سے بھرپور ہو۔

وَهَبْ لِیْ صِدْقَ التَّوَکُّلِ عَلَیْکَ۔

اگر کوئی توکل کے اس مرتبے تک پہنچ جائے کہ زندگی کے سخت ترین حالات میں (جب بظاہر نجات کے تمام دروازے بند نظر آتے ہیں) بھی صرف اللہ پر توکل کرے اور صرف اسے ہی اپنا کارساز سمجھے تو ایسا شخص یقیناً توکل کے بلند ترین مرتبے کا حامل ہوگا۔

خدا پر عدم اعتماد کا نتیجہ

مذکورہ بیانات کی روشنی میں اللہ پر توکل اور اعتماد کی اہمیت واضح ہوگئی۔ ہم اس بحث کے آخر میں اللہ کو چھوڑ کر لوگوں پر اعتماد کرنے کا نتیجہ حضرت امام صادقؑ کی ایک حدیث کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔

حسین بن علوان کا بیان ہے: میں ایک ایسی محفل میں بیٹھا ہوا تھا جس میں ہم علم و دانش حاصل کرنے کے لئے شریک تھے۔

---

(۱) مستدرک الوسائل ج/ ۲ ص ۲۸۸۔

میرا سفر خرچ ختم ہوچکا تھا۔ اس محفل کے حاضرین میں سے کسی نے کہا اس مشکل مسئلے میں تمہیں کسی سے مدد کی امید ہے؟ میں نے جواب دیا فلاں سے۔ اس نے کہا اللہ کی قسم تیری حاجت پوری نہیں ہوگی اور تم اپنی آرزو حاصل نہ کر سکو گے۔

میں نے پوچھا تم کیسے جانتے ہو؟ کہا میں نے حضرت امام صادقؑ سے سنا کہ آپؑ نے فرمایا: میں نے ایک کتاب[1] میں یہ پڑھا ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے مجھے قسم ہے اپنی عزت و عظمت، بزرگی اور تمام اشیاء پر اپنے تسلط کی کہ جو شخص بھی میرے علاوہ دوسروں سے اپنی تمنائیں وابستہ کرے گا میں اس کی آرزوؤں کو ناکام بنادوں گا، اور اسے ذلت و خواری کا لباس پہنا دوں گا۔ کیا وہ مجھے چھوڑ کر دوسروں سے امید رکھتا ہے اور دوسروں کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے حالانکہ تمام بند دروازوں کی چابیاں میرے پاس ہیں؟ کون ہے جس نے پریشانیوں میں مجھ سے امید باندھی ہو اور میں نے اسے مایوس کردیا ہو؟ کون ہے جس نے عظیم مشکلات میں میرا سہارا ڈھونڈا ہو اور میں نے اسے ناامید کردیا ہو؟

---

(۱) اس سے مراد کسی آسمانی کتاب میں اس بات کا تذکرہ ہے۔

انیسواں نکتہ

لوگوں کے ساتھ حسن سلوک

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے تزکیہ نفس کے سلسلے کا ایک نقطۂ آغاز لوگوں کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک ہے اس مسئلے کو اسلامی اخلاق کے اندر خاص مقام حاصل ہے۔ چنانچہ رسول خداؐ سے مروی ہے:

افاضلکم احسنکم اخلاقاً الموطئون اکنافاً الذین یالفون و یولفون (۱)

تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جن کا اخلاق تم میں سب سے اچھا ہو اور وہ دوسروں کی خدمت پر آمادہ ہوں اور جو لوگوں کے ساتھ الفت و محبت کی زندگی گزاریں۔

یہاں ایک تمہیدی نکتے کا بیان فائدے سے خالی نہیں اور وہ یہ کہ اگر چہ حسن خلق کا تعلق روحانی و معنوی کمالات مثلاً عدل، شجاعت، تواضع، سخاوت، جذبہ ایثار و قربانی سے ہے

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۱۰۲۔

لیکن لوگوں کے ساتھ اچھے سلوک کو بھی حسن خلق کہتے ہیں ۔ جو افراد دوسرے لوگوں کے ساتھ نیک سلوک اور اچھا برتاؤ کرتے ہیں وہ بھی نیک اخلاق والے کہلائے جاتے ہیں کیونکہ یہ صفت (لوگوں سے حسن سلوک) روح کی پاکیزگی اور معنوی کمال کی مرہون منت ہوتی ہے اور اس کا ایک اخلاقی سہارا بھی ساتھ میں ہوتا ہے ۔ لوگوں سے اچھا سلوک کسی شخص کی عظمت ، بلند شخصیت ، تواضع ، اور جذبہ قربانی و فداکاری کی دلیل ہے نیز اس کے معنوی کمال اور روحانی پاکیزگی کی بھی دلیل ہے ۔

واجب اور غیر واجب اخلاقی مسائل

اسلامی تعلیمات میں فقہی ، قانونی ، اور اخلاقی مسائل نیز عبادات و معاملات الغرض تمام انفرادی و اجتماعی امور سے متعلق بہت سارے آداب و رسوم کا بیان ہوا ہے ۔ ان میں سے بہت سے آداب کو غیر واجب اخلاقی آداب قرار دیا گیا ہے حالانکہ اخلاقی مسائل کو بھی دو حصوں (واجب اور غیر واجب) میں تقسیم کرنا چاہیئے ۔ صرف ایک مسئلے کے سنت یا اخلاقیات کے زمرے میں داخل ہونے کی وجہ سے سارے اخلاقیات کو غیر واجب نہیں ٹھرایا جائے ۔ مثلاً عہد کی پابندی، جذبہ ایثار و قربانی اور نیکی و احسان و غیرہ وہ مسائل ہیں جو بعض صورتوں میں یقیناً واجب ہوجاتے ہیں ۔ اگر چہ یہ اخلاقی موضوعات کے زمرے میں آتے ہیں لیکن ان کی رعایت واجب ہے ۔ در حقیقت اس قسم کی صفات دوسرے واجبات و فرائض کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو چیز واجبات و فرائض کے لئے ممد و معاون ثابت ہو وہ خود مستحب ہو ؟

علاوہ ازیں ممکن ہے کہ بہت سارے اخلاقی آداب و رسوم انفرادی طور پر واجب نہ ہوں لیکن اجتماعی و معاشرتی نقطہ نظر سے یعنی معاشرتی آداب کے لحاظ سے لازم العمل بن جائیں کیونکہ جو معاشرہ انسانی و اسلامی اقدار میں داخل ہونے نیز پاک و پاکیزہ اور خدا کو پسند طریقہ زندگی کو اپنانے کا خواہشمند ہو اسے چاہیئے عملی طور پر اس قسم کے آداب کی

لازماً پابندی کرے ۔ اگر انسانی اور اسلامی اصولوں کے مطابق اجتماعی زندگی گزارنی ضروری ہے (اور ایسا ہے) تو پھر اس کے آداب کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے ۔

یاد رہے کہ جس طرح نماز، روزہ، حج، خمس، زکات، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسی عبادات ظاہری اور باطنی آداب کی حامل ہیں اور ان آداب کی رعایت کے بغیر یہ عبادات حقیقت کا روپ دھار نہیں لیتیں بلکہ عبادات کا صرف بے روح ڈھانچہ ہی رہ جاتاہے ، اسی طرح لوگوں کے ساتھ روابط، معاملات اور معاہدوں کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں جن کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں مفاد پرستی پر مشتمل صرف ظاہری حرکات باقی رہ جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان معاشرتی اور انسانی آداب و رسوم کو چھوڑنے کی صورت میں انسان یا معاشرہ ایک بے روح مشین بن کررہ جاتاہے اور زندگی ایک حیوانی اور مشینی زندگی کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور آدمی ایک درندہ حیوان یا آٹومیٹیک مشین میں تبدیل ہوجاتاہے۔ اتنے سارے معاشرتی اصولوں اور اخلاقی آداب میں لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کو اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں خاص مقام حاصل ہے ۔ قرآن کی آیات اور احادیث کے مطالعے سے ہمارا کا یہ دعوی بالکل واضح ہوجاتاہے ۔ ان تمام اخلاقی تعلیمات میں انسانیت کی عزت اور اس کا احترام زیادہ اہمیت کا حامل ہے ۔ ارشاد قرآنی ہے :

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَ حَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَ فَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلاً (۱)

اور بہ تحقیق ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ہے ۔ انہیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے ۔ انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے ۔ اور ان کو اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے ۔

---

(۱) سورہ اسراء / ۷۰ ۔

اگر چہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں ان آداب و روایات کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے جن کا تعلق براہ راست تزکیہ نفس اور روحانی تربیت سے ہے لیکن چونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور زندگی بہر حال روحانی ارتقاء و تکامل کا ایک ذریعہ ہے جس بناء پر انسان کی زندگی کا کوئی گوشہ اس کی روحانی زندگی سے علیحدہ نہیں لہذا اسلام تزکیہ کے مسئلے کو وسیع تر اور جامع تر نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام انسان کو اس کی معاشرتی و اجتماعی زندگی میں حقایق سے دور فضاؤں میں سرگردان نہیں چھوڑتا یہ تصور کہ معاشرتی پہلو اور روحانی و معنوی پہلو ایک دوسرے سے جدا ہیں ایک گمان باطل سے بڑھکر کچھ نہیں۔ بنابریں زندگی کے آداب اور لوگوں سے حسن سلوک ایک خداپرست اور حقیقی مسلمان کی خصوصیات میں شامل ہیں نیز اسلامی معاشرے کے ارتقاء و تکامل کا ذریعہ ہیں۔

آداب و روایات بھی معاشرتی پہلو کے ساتھ ساتھ معنوی اور جذباتی پہلو کے بھی حامل ہیں مثلاً ایک خوش اخلاق مسلمان دوسروں کو سلام میں پہل کرکے دوسروں کا احترام بھی بجا لاتا ہے اور فروتنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی روح سے تکبر اور غرور کے زنگ کو دور بھی کرتا ہے۔ یوں وہ ایک تیر سے دو شکار کر لیتا ہے۔ علاوہ ازیں باہمی روابط مستحکم ہوتے ہیں نیز خود غرضی کا بت بھی پاش پاش ہوجاتا ہے۔ اسی طرح تمام آداب و رسوم میں دونوں مذکورہ پہلوؤں کو مناسب شرائط کی موجودگی میں مد نظر رکھا جا سکتا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ انسان اسلام کو اپنی زندگی کے ہر شعبے کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات سمجھے۔ یاد رہے کہ قانون اور اخلاق کے میدان میں اسلامی آداب و روایات کا دامن اتنا وسیع ہے کہ ان سب کا تذکرہ کرنے کے لئے طویل اور مفصل بحث کی ضرورت ہے جس کی اس کتاب میں گنجائش نہیں بنابریں ہم یہاں زیادہ اہمیت کے حامل چند پہلوؤں کی

طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے ۔

۱)۔ رشتہ داروں کے حقوق (صلہ رحمی)۔

۲)۔ دینی بھائیوں کے حقوق۔

۳)۔ ہمسایوں کے حقوق اور ہمسائیگی کے آداب۔

۴)۔ بیماروں کی عیادت کے آداب۔

۵)۔ گفتگو کے آداب اور زبان کی آفات۔

۶)۔ بزرگان دین کے ساتھ گفتگو کے آداب۔

۷)۔ علم سیکھنے اور سکھانے کے آداب (استاد اور شاگرد کے حقوق)۔

۸)۔ اجتماعی و معاشرتی امور میں مشورت کے آداب۔

۹)۔ لوگوں کے گھروں میں داخل ہونے کے آداب۔

۱۰)۔ عوامی محافل اور نشستوں میں شرکت اور ملاقات کے آداب۔

۱۱)۔ لباس پہننے اور زیب و زینت کے آداب۔

۱۲)۔ عفو و درگذر۔

۱۳)۔ اتحاد و اتفاق۔

۱۴)۔ عہد و پیمان کی پابندی۔

صلہ رحمی

صلہ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ نیکی اور ان کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھنے کا عمل) حسن اخلاق کی ایک اور علامت، اسلام کے پسندیدہ آداب کا ایک حصہ اور لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کی ایک دلیل ہے۔ یہاں چند نکات پر بحث ضروری ہے۔

پہلا نکتہ "رحم" سے کیا مراد ہے ؟

رشتہ داری کی دو قسمیں ہیں: ۱، نسبی ۲، سببی

نسبی رشتہ داری سے مراد وہ رشتہ ہے جو نطفہ، خون اور بطن کی وحدت سے وجود میں آئے۔ اس قسم کے رشتہ داروں کو رَحِم کہتے ہیں۔ سببی رشتہ داری وہ ہے جو شادی و نکاح کے ذریعے حاصل ہو مثال کے طور پر میاں بیوی اور ان دونوں کے رشتہ داروں کا آپس میں رشتہ۔

دوسرا نکتہ صلہ رحمی کیا ہے ؟

صلہ رحمی سے مراد خویش و اقارب سب کے ساتھ نیکی کرنا اور ان کا خیال رکھنا ہے ان لوگوں کا حق دوسروں کی نسبت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ میں نسبی رشتہ داروں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے چنانچہ اگر کسی شخص کے اوپر مالی واجبات ہوں اور اس کے رشتہ داروں میں مستحق افراد موجود ہوں تو انہیں دوسروں پر مقدم رکھنا چاہیئے۔ قرآن مجید نے رشتہ داروں کی مدد کرنے کو مالداروں کی مالی ذمہ داریوں میں شامل قرار دیا ہے۔ خویش و اقارب کی مدد کا تذکرہ کرتے وقت اسے واجب حق کے طور پر ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ آتِ ذَا الْقُرْبیٰ حَقَّه وَ الْمِسْكِينَ وَ ابْنَ السَّبِيلِ وَ لاَ تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا (۱)

اور قریبی رشتہ دار کا حق ادا کرو (اسی طرح) مسکین اور بے چارے مسافر کا بھی حق ادا کرو۔ اور اسراف و تبذیر سے کام نہ لو۔

---

(۱) سورہ اسراء / ۲۶۔

تیسرا نکتہ : قرآن و حدیث میں صلہ رحمی کا بیان

قرآن کی نظر میں صلہ رحمی کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اللہ تعالی اپنی عبادت کے ساتھ اس کا ذکر فرماتا ہے :

ارشاد ہوتا ہے :

وَ اتقُوا اللهَ الَّذِی تَسَائَلُونَ بِهِ والأَرحَامَ انَّ اللهَ کَانَ عَلَیکُم رَقِیباً (۱)

اور اللہ سے ڈرو (جس کی عظمت کے تم سب قائل ہو اور) جس کا نام تم ایک دوسرے سے کوئی چیز مانگتے وقت لیتے ہو ۔ نیز اپنے رشتہ داروں سے قطع تعلق نہ کرو کیونکہ اللہ تمہارے اوپر نظر رکھے ہوئے ہے ۔

جمیل ابن دراج نامی راوی کا بیان ہے : میں نے اس آیت میں مذکور لفظ " ارحام " کے بارے میں امام صادقؑ سے سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا :

فقال یَعنِی اَرحَامَ النَّاسِ ـ ان الله عَزَّ وَ جَلَّ اَمَرَ لِصِلَتِهَا و عَظَّمَهَا اَلَم تَرَ اَنَّ اللهَ جَعَلَهَا مَعَه (۲)

فرمایا ، اس سے مراد لوگوں کے خویش و اقارب ہیں ۔ اللہ تعالی نے ان کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے اور ان کی عزت افزائی فرمائی ہے ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے ان کا نام اپنے نام کے ساتھ لیا ہے (۳)

قرآن مجید میں صلہ رحمی کی اس قدر تاکید اور مذکورہ آیت میں خداوند متعال کے نام کے بعد خویش و اقارب کا ذکر اسلام کی نظر میں صلہ رحمی کی اہمیت کی دلیل ہے اس قدر زیادہ تاکید سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فریضے کو ترک کرنا برے نتائج کا باعث بنتا ہے ۔

---

(۱) سورہ نساء کی پہلی آیت ۔

(۲) تفسیر برھان ج ۱ ص ۳۳۸ ۔

(۳) نسبی رشتہ داروں کے ساتھ عملی طور پر رشتہ توڑ لینا گناہ کبیرہ ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں ۔

چوتھا نکتہ: صلہ رحمی کے فوائد

الف :- عمر کا طولانی ہونا

صلہ رحمی کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے عمر طولانی ہوتی ہے۔ اس بارے میں یہ حدیث ملاحظہ ہو جس میں امام ہشتم حضرت علی بن موسی الرضاؑ فرماتے ہیں:

یَکُونُ الرَّجُلُ یَصِلُ رَحِمَہ فَیَکُونُ قَدْ بَقِیَ مِنْ عُمْرِہ ثَلاَثُ سِنِیْنَ فَیُصَیِّرُ ھَا اللّٰہُ ثَلاَثِیْنَ سَنَۃً وَ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (۱)

گاہے کوئی شخص صلہ رحمی کرتا ہے جبکہ اس کی عمر تین سال رہ گئی ہو لیکن اللہ (صلہ رحمی کے باعث) اسے تیس سال میں بدل دیتا ہے۔ اور اللہ جو چاہے انجام دیتا ہے۔

ب :- رزق میں اضافہ

صلہ رحمی کا ایک اور فائدہ رزق میں اضافہ ہے۔ اس بارے میں ہم یہاں ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔

حضرت امام سجادؑ رسول اللہؐ سے روایت فرماتے ہیں:

مَنْ سَرَّہُ اَنْ یَمُدَّ اللّٰہُ فِی عُمْرِہِ وَ اَنْ یَّبْسُطَ اللّٰہُ فِی رِزْقِہِ فَلْیَصِلْ رَحِمَہ (۲)

جسے یہ بات پسند ہو کہ اللہ اس کی عمر دراز کرے اور اس کے رزق میں اضافہ فرمائے تو اسے چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے۔

ج :- اعمال کا پاکیزہ ہونا

ایک حدیث میں صلہ رحمی کا ایک فائدہ یہ بیان ہوا ہے کہ اس سے اعمال پاک ہوجاتے ہیں۔

---

(۱) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۵۰۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۵۶۔

چنانچہ حضرت امام باقرؑ کا ارشاد ہے:

صِلَۃُ الْاَرحَامِ تُزَکّی الْاَعْمَالَ و تَدْفَعُ الْبَلْوی وَ تُنْمِی الْاَمْوَالَ وتُنْسِیُ لَہ فِیْ عُمْرِہ وَتُوَسّعُ فِی رِزْقِہ و تُحَبّبُ فِی اَھْلِ بیتِہ فَلْیَتَّقِ اللّٰہِ وَلْیَصِلُ رَحِمَہ (۱)

صلہ رحمی کے باعث اعمال پاک ہوجاتے ہیں، بلائیں دور ہوتی ہیں، اموال میں برکت آتی ہے، عمر طولانی ہوتی ہے، رزق میں اضافہ ہوتاہے اور آدمی اپنے گھرانے میں محبوب بن جاتاہے پس اس چاہیئے کہ اللّٰہ سے ڈرے اور اپنے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرے۔

د :۔ قیامت کے دن حساب میں آسانی

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے:

صِلَۃُ الرَّحِم تُھَوّنُ الْحِسَابَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَ ھِیَ مَنْسَاۃٌ فِی الْعُمْرِ وَتَقِیُ مَصَارِعَ السُّوءِ (۲)

صلہ رحمی کی وجہ سے قیامت کے حساب میں آسانی ہوجاتی ہے۔ عمر طولانی ہوجاتی ہے اور بری موت سے محفوظ رہتاہے۔

ھ :۔ شہروں کا آباد و شاد ہونا

ارشاد ہے:

صِلَۃُ الرَّحِمِ وَحُسْنُ الْجِوارِ یَعْمُرَانِ الْدیارَ وَ یَزِیْدانِ فِی الاَعْمَارِ (۳)

صلہ رحمی اور ہمسایوں کے ساتھ حسن سلوک شہروں کو آباد اور عمروں میں اضافہ کرتے ہیں۔

---

(۱) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۵۲۔

(۲) بحارالانوار ج/ ۱۷ ص ۱۰۴۔

(۳) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۲۲۔

و :- صلہ رحمی دین کا جزء ہے

حدیث ہے:

أُوصِي الشَّاهِدَ مِنْ أُمَّتِي وَ الْغَائِبَ مِنْهُمْ وَ مَنْ فِي أَصْلَابِ الرِّجَالِ وَ أَرْحَامِ النِّسَاءِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَنْ يَصِلَ الرَّحِمَ وَ إِنْ كَانَتْ مِنْهُ عَلَىٰ مَسِيرِ سَنَةٍ فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنَ الدِّينِ[1]

میں اپنی امت کے حاضرین و غائبین کو نیز ان کو جو مردوں کے صلب اور عورتوں کے ارحام میں ہیں قیامت تک کے لئے یہ وصیت کرتاہوں کہ وہ صلہ رحمی کریں اگرچہ وہ (رشتہ دار) ایک سال کی مسافت کے فاصلے پر ہوں کیونکہ یہ دین کا حصّہ ہے۔

یہ تھی صلہ رحمی کے آثار و فوائد کی ایک جھلک۔ آیئے اب ہم رشتہ داروں سے صلہ رحمی نہ کرنے (قطع رحم) کے نتائج کا جائزہ لیں۔

پانچواں نکتہ: قطع رحم کے برے اثرات

رشتہ داروں سے قطع رحمی یقیناً گناہ کبیرہ اور عذاب اخروی کا موجب ہے۔ قرآن مجید میں اس سے سخت منع کیا گیا ہے۔ اس عمل کے کچھ آثرات یہ ہیں۔

الف :- لعنت خداوندی کا موجب ہے

چنانچہ ارشاد قرآنی ہے:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَ تُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ[2]

---

(۱) مشکوۃ الانوار ص ۱۶۵۔

(۲) سورہ محمدؐ / ۲۲۔۲۳۔

تو کیا تم سے کچھ بعید ہے کہ اگر تم روگردان ہوجاؤ تو زمین میں فساد برپا کرو اور اپنے قرابت داروں سے قطع تعلق کرلو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔

ب:۔ خویش و اقارب سے رشتہ توڑنے والا فاسق اور خسارے میں ہے

ایک اور مقام پر اللہ تعالی ان لوگوں کو جو اس کے عہد کو توڑتے اور رشتہ داروں سے تعلقات قطع کرتے ہیں زیانکار قرار دیتاہے اور فرماتاہے:

الَّذِیْنَ ینقضون عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِهِ وَ یَقْطَعُونَ مَا اَمَرَ اللهُ بِهٖ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الاَرْضِ اولٰئکَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ (۱)

(فاسق وہ ہیں) جو اللہ کے ساتھ عہد کو پکا کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں اور اس رشتے کو قطع کرتے ہیں جسے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یہی لوگ خسارے میں ہیں۔

ایک اہم نکتہ

شاید کچھ لوگ خیال کریں کہ صلہ رحمی کے بارے میں اس قدر تاکید صرف ان لوگوں سے مختص ہے جو کافی مال و ثروت رکھتے ہوں۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ۔ اسلام ہمیں یہ حکم دیتاہے کہ یہ عظیم فریضہ انہیں ایک گھونٹ پانی پلاکر یا ان کو نہ ستا کر یا ایک دوسرے کو سلام کرکے بھی نبھایا جا سکتاہے اور اس طرح صلہ رحمی کا ثواب حاصل کیا جاسکتاہے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے:

صِلْ رَحِمَکَ وَلَوْ بِشُرْبَةٍ مِنْ مَاءٍ وَاَفْضَلُ مَا یُوصَلُ بِهِ الرَّحِمُ کَفُّ الاَذٰی عَنْهُ (۲)

---

(۱) سورہ بقرہ / ۲۷۔

(۲) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج/ ۷۱ ص ۸۸۔

اپنے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرو اگر چہ ایک گھونٹ پانی کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو
اور صلہ رحمی کی بہترین راہ یہ ہے کہ رشتہ داروں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔

امیر المومنین حضرت علیؑ اس بارے میں فرماتے ہیں:

صِلُوا اَرْحَامَکُمْ وَلَوْ بِالتَّسْلِیْمِ (۱)

اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرو اگر چہ سلام کرنے کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو۔

چھٹا نکتہ: رشتہ داروں سے قطع تعلق احادیث کی روشنی میں

رشتہ داروں سے قطع تعلق کرنے اور کرنے اور صلہ رحمی نہ کرنے کے بارے میں احادیث ہیں جن کے چند نمونے یہاں ملاحظہ ہوں۔

الف :- یہ شرک کا ہم پلہ ہے۔

قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہ علیہ و آلہ و سلم: اَیُّ الْاَعْمَالِ اَبْغَضُ اِلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ فَقَالَ الشِّرْکُ بِاللّٰہِ قَالَ ثُمَّ مَاذا؟ قَالَ قَطِیْعَۃُ الرَّحِمِ .... (۲)

کسی شخص نے نبی کریمؐ سے سوال کیا کہ کونسا عمل اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے؟ فرمایا، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینا۔ عرض کیا اس کے بعد؟ فرمایا رشتہ داروں سے تعلقات توڑلینا۔

---

(۱) اصول کافی ج / ۲ ص ۱۵۵۔

(۲) سفینۃ البحار ج/ ۱ ص ۵۱۶۔

ب :- خدا کی رحمت سے دوری

امام زین العابدینؑ نے اپنے فرزند ارجمند امام محمد باقرؑ سے اپنی وصایا میں فرمایا :

وَ اِیَّاکَ وَ مُصَاحَبَةُ الْقَاطِعِ لِرَحِمِهٖ فَاِنِّی وَجَدْتُهُ مَلْعُوناً فِی کِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ فِی ثَلَاثَةِ مَوَاضِعَ (۱)

(اے میرے فرزند) ان لوگوں کی مصاحبت سے احتراز کرو۔ جو اپنے رشتہ داروں سے ناطہ توڑ لیتے ہیں (اور ان سے اچھا سلوک نہیں کرتے) کیونکہ میں نے ان کو قرآن میں تین مقامات پر ملعون پایا ہے۔ پھر امامؑ نے سورہ محمد کی چوبیسویں اور پچیسویں آیت نیز سورہ رعد کی پچیسویں آیت اور سورہ بقرہ کی ستائیسویں آیت کی تلاوت فرمائی۔

ج :- بہشت سے محرومی

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے :

ثَلَاثَةٌ لَا یَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ مُدْمِنُ خَمْرٍ وَ مُدْمِنُ سِحْرٍ وَ قَاطِعُ رَحِمٍ (۲)

تین قسم کے لوگ جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ شرابی۔ جادوگر اور رشتہ داروں سے حسن سلوک نہ کرنے والا (قطع رحمی کرنے والا)۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص اخلاق حسنہ کو اپنانے کا دعویدار ہو اسے چاہیئے کہ وہ اس اصول پر جسے اسلام نے بڑی اہمیت دی ہے سنجیدگی سے عمل پیرا ہو کیونکہ اس سے بے اعتنائی باعث تباہی ہے۔

---

(۱) اصول کافی ج/۲ ص ۶۴۱۔

(۲) خصال شیخ صدوق ج/۱ ص ۱۷۷۔

بیماروں کی عیادت

حسن اخلاق اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی ایک اور نشانی بیماروں کی عیادت ہے۔ اسلام نے اس بارے میں بہت تاکید کی ہے۔ بیماروں کی عیادت مسلمانوں کے باہمی حقوق میں سے ایک ہے اور ہر مسلمان اس فریضے کی ادائیگی کا پابند ہے۔

حضرت امام علیؑ رسول گرامیؐ اسلام سے یوں نقل فرماتے ہیں:

لِلْمُسْلِمِ عَلیٰ اخِیْـهِ ثَلَاثُونَ حَقـاً لاَ بَرائة له مِنْهَـا الاّ بِالاداۤء اوِ الْعَفْوِ یَغْفِـرُ زَلّتَـه وَ یَـرْحَـمُ عَبْـرَ تَـه ...... وَ یَعُـودُ مَـرْ ضَتَـهُ ......(۱)

ہر مسلمان کی گردن پر دوسرے مسلمان کے تیس حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے۔ ان حقوق سے رہائی تب ممکن ہے جب وہ ان کو ادا کرے یا اس کا مسلمان بھائی اسے بخش دے .... (ان حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ) بیماری کے وقت اس کی عیادت کرے۔

رسول اللہؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مِنْ حَقِّ الْمُسْلِـمِ عَلیٰ الْمُسْلِـمِ اذا لَقِیـهِ انْ یُسَلّـمْ عَلَیْـهِ وَ اذا مَرِضَ ان یَّعُـودَ ہ و اذا مَـاتَ انْ یَّشیـع جِنَازَ تُـه (۲)

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان کے اوپر یہ حق ہے کہ جب اس سے سامنا ہو تو اسے سلام کرے، جب وہ مریض ہو تو اس کی عیادت کرے اور جب وہ مرجائے تو اس کی تشییع جنازہ میں شریک ہو۔

---

(۱) بحارالانوار مطبوعہ بیروت ج ۷۱ ص ۲۳۶۔

(۲) مکارم الاخلاق مطبوعہ بیروت ص ۳۵۹۔

بیماروں کی عیادت کا ثواب

بیماروں کی عیادت کے بارے میں مروی احادیث میں سے یہاں ہم ایک حدیث بطور نمونہ نقل کرتے ہیں۔

حضرت امام ہشتمؑ کا ارشاد ہے:

اَیُّمَا مُؤمِنٍ عَادَ اَخَاهُ فِی مَرَضِهِ فَاِنْ کَانَ حِیْنَ یُصْبِحُ شَیَّعَهُ سبعون اَلفُ مَلَک۔ فَاِذا قَعَدَ عِنْدَهُ غَمَرَتْهُ الرَّحْمَةُ وَ اسْتَغْفَرُوا لَهُ حَتّٰی یُمْسِیَ۔ وَاِنْ کَانَ مَسَاءً کَانَ لَهُ مِثلُ ذَالِکَ حَتّٰی یُصْبِحَ (۱)

جو مومن اپنے برادر ایمانی کی عیادت صبح کے وقت کرے تو ایک ہزار فرشتے اس کی مشایعت کریں گے اور جب وہ اس کے پاس بیٹھ جائے تو (اللہ کی) رحمت اس کو گھیر لے گی اور وہ صبح تک اس کے لئے طلب مغفرت کرتے رہیں گے۔ اگر شام کے وقت عیادت کو جائے تو صبح تک یہی اجر و ثواب اس کو ملتا رہے گا۔

بیمار کی عیادت سے حاجت روائی ہوتی ہے۔

بعض احادیث کی رو سے بیمار کے سرہانے کی جانے والی دعا قبولیت کے مرتبہ سے نزدیکتر ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالی کا لطف و کرم شکستہ دلوں کے شامل حال ہوتا ہے اور بیمار مؤمن اس خصوصیت کا حامل ہوتا ہے۔

---

(۱) مکارم الاخلاق مطبوعہ بیروت ص ۳۶۱۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

يُعَيِّرُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَبْداً مِّنْ عِبَادِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَقُولُ، عَبْدِيْ مَا مَنَعَكَ اِذْ اَمْرَضْتُ اَنْ تَعُودَنِيْ؟ فَيَقُولُ، سُبْحَانَكَ اَنْتَ رَبُّ الْعِبَادِ لَاتَأْلَمُ وَ لَا تَمْرَضُ۔ فَيَقُولُ، مَرِضَ اَخُوكَ الْمُؤْمِنُ فَلَمْ تَعُدْهُ وَ عِزَّتِيْ وَ جَلَالِيْ لَوْ عُدْتَّهُ لَوَجَدْتَّنِيْ ثُمَّ لَتَكَفَّلْتُ بِحَوَائِجِكَ فَقَضَيْتُهَا لَكَ وَ ذَالِكَ مِنْ كَرَامَةِ عَبْدِيَ الْمُؤْمِنِ وَ اَنَا الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۱)

اللہ تعالی قیامت کے دن اپنے بندوں میں سے کسی بندے کی ملامت کرے گا اور فرمائے گا، اے میرے بندہ جب میں مریض ہوا تو تونے میری عیادت کیوں نہیں کی؟ وہ عرض کرے گا پروردگارا منزہ ہے تیری ذات تو تمام بندوں کا رب ہے۔ تو نہ درد میں مبتلا ہوتا ہے نہ بیماری میں۔ پس اللہ فرمائے گا، تیرا مومن بھائی بیمار ہوا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔ مجھے قسم ہے اپنی عزت و جلال کی اگر تم اس کی عیادت کرتے تو مجھے (اس کے پاس) پاتے اور میں تمہاری حاجتوں کو اپنے ذمے لیتا اور پوری کرتا۔ یہ میرے مومن بندے کو (میرے نزدیک) حاصل احترام کے باعث ہے۔ اور میں رحمان و رحیم ہوں۔

بیمار کی عیادت کے آداب

بیماروں کی عیادت کے کچھ آداب ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔ ان آداب میں سے ایک تحفہ دینا ہے۔ اس سلسلے میں ہم ایک حدیث نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

---

(۱) سفینۃ البحار ج/۲ ص ۵۳۴۔

رسول اللہؐ کا فرمان ہے:

مَنْ اَطْعَمَ مَرِیضاً شَهْوَتَهُ اَطْعَمَهُ اللهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ (۱)

جو کوئی کسی مریض کو اس کی پسند کی چیز کھلائے اللہ اسے جنت کے پھلوں میں سے کھلائے گا۔

بیمار کے لئے دعا

رسول اللہؐ نے فرمایا:

عُودُوا الْمَرضیٰ وَ اتَّبِعُوا الجنائزَ یُذَکِّرکُم الآخِرةَ وَ تدعُوا لِلْمَرِیْضِ فَتَقُولُ اللّٰهُمَّ اشْفِهِ بِشِفَائِکَ وَ داوِهِ بِدَوائِکَ وَ عَافِهِ مِنْ بَلَائِکَ (۲)

بیماروں کی عیادت کرو اور جنازوں کی تشییع میں شرکت کرو۔ یہ کام تمہیں آخرت کی یاد دلائے گا۔ نیز بیماروں کے لئے دعا کرو اور کہو اے اللہ تو اسے صحت یاب فرما اور اسے اپنی بلا سے محفوظ رکھ۔

حوصلہ دینا

بیماروں کی عیادت کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ بیمار سے ایسی گفتگو کی جائے جس سے اسے ذہنی آسودگی اور سکون و اطمینان حاصل ہو مثلاً اس سے کہا جائے: آپ کی بیماری جلد ہی ٹھیک ہوجائے گی اور اللہ آپ کو جلد صحت یاب فرمائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض افراد بیماری کے دوران حوصلہ ہار جاتے ہیں یہاں تک کہ زندگی سے مایوس ہوجاتے ہیں۔ بنابریں ان کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔

---

(۱) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج/ ۷۸، ص ۲۲۴۔

(۲) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج/ ۷۸، ص ۲۲۴۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

اذا دَخَلْتُمْ عَلَى الْمَرِيْضِ فَنَفِّسُوا له فِي الاَجَلِ فَاِنَّ ذَالِكَ لاَ يَرُدُّ شَيئاً وَ هُوَ يُطَيِّبُ النَّفسَ (۱)

جب تم مریض کے پاس جاؤ تو اسے زندگی کی نوید دو۔ یہ چیز اگر چہ قضا و قدر کو نہیں بدل سکتی لیکن اس سے روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرتؐ سلمان فارسی کی عیادت کو تشریف لے گئے تو وہاں سے رخصت ہوتے وقت فرمایا:

يَا سَلْمَانُ كَشَفَ اللهُ ضُرَّكَ وَ غَفَرَ ذَنْبَكَ وَ حَفِظَكَ فِي دِيْنِكَ وَ بَدَنِكَ اِلىٰ مُنْتَهىٰ اَجَلِكَ (۲)

اے سلمان اللہ تیری تکلیف کو برطرف کردے، تیرے گناہ بخش دے اور تیری زندگی کے آخری لمحات تک تیرے دین اور بدن کی حفاظت فرمائے۔

ملاقات کو طول نہ دینا

بیمار کی عیادت کے وقت یہ نکتہ بھی نظر میں رہے کہ بیمار کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا اچھی بات نہیں مگر یہ کہ مریض خود چاہے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

انَّ مِنْ اَعْظَمِ الْعُوّادِ اَجْراً عِنْدَ اللهِ لِمَنْ اِذَا عَادَ اَخَاهُ خَفَّفَ الْجُلُوسَ اِلاَّ اَنْ يَكُوْنَ الْمَرِيْضُ يُحِبُّ ذَالِكَ وَ يُرِيْدَهُ (۳)

بیماروں کی عیادت کرنے والوں میں اس شخص کا ثواب سب سے زیادہ ہے جو اپنے برادر دینی کی عیادت کے وقت کم ٹھہرے مگر یہ کہ خود مریض چاہتا ہو کہ وہ زیادہ دیر ٹھہرے۔

---

(۱) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج/ ۸، ص ۲۲۵۔

(۲) مکارم الاخلاق ص ۳۶۱۔

(۳) وسائل الشیعہ ج / ۲ ص ۶۴۲۔

کامل عیادت

عیادت کے آداب میں سے ایک جس کی رعایت ضروری ہے یہ ہے کہ مریض کے ساتھ محبت و ہمدردی کا اظہار کیا جائے ۔ اس سلسلے میں مروی احادیث میں سے ایک رسول اللہؐ کی یہ حدیث ہے:

تَمَامُ عِیَادَۃِ الْمَرِیْضِ اَنْ یَضَعَ یَدَہٗ عَلَیْہِ وَ یَسْئَلَہٗ کَیْفَ ھُوَ (۱) و (۲)

کامل عیادت یہ ہے کہ (عیادت کرنے والا) اپنا ہاتھ بیمار کے اوپر رکھے اور اس کا حال پوچھے۔

مریض سے خاطر تواضع کی توقع نہ رکھنا

مریض کی عیادت کا مقصد اس سے اظہار محبت و ہمدردی، اخوت کا حق ادا کرنا اور اجر و ثواب کا حصول ہے۔ بنابریں جو شخص بیمار کی عیادت کو جائے اسے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ اس کی خاطر مدارت کی جائے۔ کیونکہ بیمار تو خود بیماری کے ہاتھوں گرفتار ہے اور اس کے گھر والے اس کی تیمارداری میں مشغول ہوتے ہیں۔ بنابریں عیادت کے لیے جانے والوں کو چاہیئے کہ وہ خود ان کی مدد کریں نہ یہ کہ ان کے لئے باعث زحمت بنیں۔

---

(۱) میزان الاعتدال ذھبی ج ۳ ص ۷ ۔

(۲) یاد رہے کہ یہ احادیث ان صورتوں سے متعلق ہیں جب مریض کسی پرانی یا خطرناک بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ وگرنہ حفظان صحت کے اصولوں کے پیش نظر احتیاط و اجتناب لازمی ہے۔

روایت ہے کہ:

نَهَی رَسُولُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ اَنْ یَاْکُلَ الْعَائِدُ عِنْدَ الْعَلِیلِ فَیُحْبِطَ اللهُ اَجْرَ عِیَادَتِهِ (۱)

رسول اللہؐ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ عیادت کرنے والا مریض کے ہاں کچھ کھائے کیونکہ اس صورت میں اللہ اس کو عیادت کے ثواب سے محروم رکھے گا۔

کشادہ روئی

لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی ایک اور علامت کشادہ روئی ہے۔

جو شخص اخلاق حسنہ کا مالک ہو وہ غمگین اور پریشان ہونے کے باوجود دوسروں کے سامنے پریشانی کا اظہار نہیں کرتا چنانچہ امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد گہربار ہے:

اَلْمُؤْمِنُ بِشْرُهُ فِي وَجْهِهِ وَحُزْنُهُ فِي قَلْبِهِ ...... (۲)

مومن کی خوشی اس کے چہرے پر نمایاں اور اس کا غم و اندوہ اس کے دل (کی گہرائیوں) میں پنہاں ہوتا ہے۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

اِنَّکُمْ لَنْ تَسَعُوا النَّاسَ بِاَمْوَالِکُمْ فَالْقَوْهُمْ بِطَلَاقَةِ الْوَجْهِ وَحُسْنِ الْبِشْرِ (۳)

تم لوگ اپنے اموال سے سب لوگوں کی مشکلات کو حل نہیں کر سکتے پس ان کے ساتھ کشادہ روئی اور خندہ پیشانی سے پیش آؤ۔

---

(۱) دعائم الاسلام ج/۱ ص ۲۱۸۔

(۲) نہج البلاغۃ فیض الاسلام ص ۱۲۴۳ حکمت ۳۲۵۔

(۳) مشکواۃ الانوار ص ۱۸۰۔

گشادہ روئی محبت اور قرب خداوندی کی باعث ہے

چنانچہ حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا:

اَلبِشْرُ الحَسَنِ وَ طَلَاقَۃُ الوَجْہِ مَکسَبۃ لِلمَحَبَّۃِ وَ قُربۃ مِنَ اللہِ عَزَّوَ جَلَّ وَ عَبُوسُ الوَجْہِ وَ سوءِ البِشْرِ مَکسَبَۃ لِلمَقتِ وَ بُعْد مِنَ اللہِ (۱)

گشادہ روئی اور خندہ پیشانی (لوگوں کے ہاں) محبوبیت اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور (اس کے برعکس) ترش روئی نفرت اور خدا سے دوری کی باعث ہے۔

مذاق اور خوش طبعی

خوش طبعی اور مزاح حسن سلوک کا ایک انداز ہے لیکن یاد رہے کہ زبان کی آفات میں سے ایک جو زبان کی دیگر آفات کی طرح خطرناک اور برے نتائج کی حامل ہے مذاق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی تعلیمات میں مذاق اور خوش طبعی کے حدود معین کئے گئے ہیں جن سے تجاوز کی صورت میں نقصان دہ نتائج سامنے آتے ہیں۔ بنابرین انسان کو چاہیئے کہ اپنی زبان پر قابو رکھے اور مزاح و خوش طبعی کے دوران اس کے مثبت و منفی نتائج کو مدنظر رکھے اور حتی الوسع بذلہ گوئی سے احتراز کرے کیونکہ ہر بات کا ایک موقع و محل اور ہر کام کا ایک مقام ہوتا ہے۔

واضح ہے کہ جو شخص ہنسی مذاق کا عادی ہوجائے وہ حقیقت پسندی کی حس کو کھو دیتا ہے اور حقیقتوں کا ادراک کما حقہ نہیں کرتا نیز دوسرے لوگ بھی اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔

---

(۱) مشکواۃ الانوار ص ۱۷۹۔

ان تمہیدی نکات کی روشنی میں یہاں چند سوال سامنے آتے ہیں :

۱۔ کیا مزاح ہر صورت میں غیر پسندیدہ عمل ہے ؟

۲۔ پیغمبرؐ اور ائمہ معصومینؑ کی سیرت کیا کہتی ہے ؟

۳۔ کیا دینی تعلیمات میں مزاح کے مثبت پہلو بھی دیکھنے میں آتے ہیں ؟

ان سوالوں کے جواب میں یہ کہنا چاہیئے کہ معصومینؑ کی احادیث کی روشنی میں مزاح اور خوش طبعی ایک حد تک اچھی بات ہے :۔ کیونکہ ہمارے دینی پیشواؤں نے معقول مزاح سے مکمل طور پر منع نہیں کیا ہے بلکہ بعض حالات میں اس کی تعریف کی ہے یہاں تک کہ یہ ہستیاں کبھی کبھی خود بھی مزاح کرتی تھیں۔

چنانچہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے۔

اِنّی لَاَ مْزَحُ وَ لاَ اَقُوْلُ اِلاّ حَقّاً [۲]

میں مزاح کرتاہوں البتہ صرف حق پر مبنی باتیں کرتاہوں۔

پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کی سیرت

یاد رہے کہ رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ بھی مزاح فرمایا کرتے تھے ۔ اور لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت امام صادقؑ نے ایک شخص سے فرمایا :

کَیْفَ مُداعبة بَعْضِکُمْ بَعْضاً؟ قُلْتُ: قَلیْل ۔ قَالَ فَلاَ تَفْعَلُوا فَانَّ الْمُداعَبَةَ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ وَ انَّکَ لَتدخِلُ بِهَا السُّرُوْرَ عَلیٰ اخِیْکَ وَ لَقَدْ کَانَ رَسُوْل اللهِ صَلَّی اللهِ عَلَیْه و آله وسلَّم یُداعِبُ الرجُلَ یرید انْ یَسُره [۱]

---

(۱) المحجۃ البیضا ج/۵ ص ۲۳۲۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۶۶۳۔

تم لوگوں کے درمیان مزاح کی کیا صورتحال ہے؟ (وہ شخص کہتاہے) میں نے کہا ہم مزاح کم کیا کرتے ہیں. فرمایا ایسا نہ کرو. کیونکہ خوش طبعی حسن خلق کا ایک حصہ ہے اور تم خوش طبعی کے ذریعے اپنے (دینی) بھائی کے دل کو مسرور کر سکتے ہو اور بہ تحقیق رسول اللہ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ان سے مزاح فرمایا کرتے تھے)

امیر المومنین حضرت علیؑ سے مروی ہے:

كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وآلِهِ وَسَلَّم لَيَسُرُّ الرَّجُلَ مِنْ أَصْحَابِهِ اذا رآه مَغْمُوماً بِالْمُدَاعَبَةِ (۱)

جب رسول اللہ اپنے کسی صحابی کو مغموم دیکھتے تو مزاح کے ذریعے اس کو شاد فرماتے تھے.

مزاح کے منفی اثرات

مذکورہ بالا احادیث سے مزاح کا مثبت پہلو ایک حد تک واضح ہوگیا۔ اب ہم بعض احادیث کا ذکر کرتے ہیں جو مزاح کے منفی پہلوؤں کو بیان کرتی ہیں۔

مذاق سے شخصیت خراب ہوتی ہے

حمران بن اعین کہتاہے: میں حضرت امام صادقؑ کی خدمت میں پہنچا اور آپؑ سے عرض کیاکہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔

آپؑ نے تقوی کی نصیحت کرنے کے بعد فرمایا:

وَإِيَّاكَ وَالْمِزَاحَ فَإِنَّهُ يُذْهِبُ هَيْبَةَ الرَّجُلِ وَمَاءَ وَجْهِهِ (۲)

مذاق سے اجتناب کرو. کیونکہ یہ انسان کا وقار اور رعب و دبدبہ ختم کردیتاہے۔

---

(۱) مستدرک الوسائل ج/ ۲ ص ۶۷۔

(۲) وسائل الشیعہ ج/ ۸ ص ۴۸۱۔

مذاق سے لوگ جری ہو جاتے ہیں

مذاق کا ایک نقصان یہ ہے کہ لوگ مذاق کرنے والے کے مقابلے میں جری ہوجاتے ہیں اور اس کی اہمیت کے قائل نہیں ہوتے۔

امام جعفر صادقؑ کا اس بارے میں ارشاد ہے:

لَا تُمَازِحْ فَيُجْتَرَأ عَلَيْكَ (۱)

مذاق نہ کیا کرو۔ وگرنہ لوگ تیرے مقابلے میں جری ہو جائیں گے۔

مذاق عداوت کو جنم دیتا ہے

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

اِيَّاكُمْ وَ الْمِزَاحَ فَانَّهُ يَجُرُّ السَّخِيمَةَ وَ يُورِثُ الضَّغِينَةَ وَ هُوَ السَّبُّ الْاَصْغَر (۲)

مذاق سے احتراز کرو کیونکہ وہ کینہ و عداوت کو جنم دیتا ہے اور وہ چھوٹی گالی ہے۔

مذاق ایمان کے نور کو ختم کر دیتا ہے

امیر المومنینؑ سے مروی ہے:

اِيَّاكَ وَ الْمِزَاحَ فَاِنَّهُ يَذْهَبُ بِنُورِ اِيمَانِكَ وَ يَسْتَخِفُّ بِمُرُوتِكَ (۳)

مذاق سے بچو کیونکہ وہ تیرے ایمان کے نور کو ختم اور تیری مردانگی کو کم کر دیتا ہے۔

---

(۱) وسائل الشیعہ ج/ ۸ ص ۴۸۱۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۶۶۴۔

(۳) اصول کافی ج/ ۲ ص ۶۶۵ حدیث نمبر ۱۹۔

مذاق اور عقل میں کمی

امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

مَا مَزَحَ امْرُؤٌ مَزْحَةً اِلاَّ مَجَّ مِنْ عَقْلِهِ مَجَّةً[1]

انسان کے ہر مذاق کے ساتھ اس کی عقل کا ایک حصہ چلا جاتا ہے۔

نتیجہ بحث

مذکورہ بالا احادیث سے ہم مجموعی طور پر یہ نتیجہ لیتے ہیں کہ مذاق کی خوبی اور بدی ایک نسبی امر ہے اور اس کے بارے میں آنکھ بند کر کے ایک ہی قسم کا فیصلہ کرنا درست نہیں۔

ایک طرف سے یہ امر ضروری ہے کہ مسلمان ایک دوسرے سے کشادہ روئی اور زندہ دلی کے ساتھ ملیں اور دوسری طرف سے یہ بھی لازم ہے کہ ایک دوسرے سے ملنے کا انداز مودبانہ اور سنجیدہ ہو۔ ان دونوں باتوں کی رعایت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔

کیونکہ اگر کوئی شخص دینی آداب کا خوگر ہو اور فن گفتگو کے حدود اربعہ سے خوب آگاہ ہو تو وہ معاشرتی اور گھریلو معاملات میں نہ اس قدر خشک، پھیکا اور بے ذوق ہوگا کہ دوسروں کے لئے باعث ملال ہو اور نہ اس حد تک آزاد یا لاپرواہ کہ غیر پسندیدہ ہنسی مذاق اور فضول باتوں سے اپنی شخصیت کو بھی گرائے اور دوسروں کو بھی آزردہ خاطر کرے۔

خلاصہ یہ کہ مؤمن کو ہشاش بشاش اور زندہ دل رہنا چاہیئے لیکن اس کے باوجود اسے سنجیدگی، وقار اور ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے پس رسول اللہؐ کے

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح حکمت ۴۵۰۔

اس ارشاد کو ہرگز فراموش نہ کیجئے کہ میں مزاح کرتا ہوں لیکن کوئی بات حق سے ہٹ کر نہیں کرتا۔

انصاف

حسن اخلاق اور معاشرتی آداب کی ایک اہم نشانی انصاف ہے۔ بہت سے لوگ عدل و انصاف کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب عمل کا مرحلہ آتا ہے تو انصاف کے تقاضوں کی رعایت کرنے والے بہت کم ملتے ہیں۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

فَالْحَقُّ اَوْسَعُ الْاَشْیَاءِ فِی التَّوَاصُفِ وَاَضْیَقُهَا فِی التَّنَاصُفِ ...... (1)

یعنی تعریف و توصیف کے وقت حق کا دائرہ سب سے زیادہ وسیع لیکن (حق کے مطابق) عمل کے مرحلے میں اس کا دائرہ ہر چیز سے زیادہ تنگ ہو جاتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں بہت سے لوگ گفتگو کے وقت حق کی خوب توصیف کرتے ہیں لیکن عمل کے وقت اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں اور آسانی سے اس بات پر حاضر نہیں ہوتے کہ حق کو حق دار کے حوالے کریں۔

انصاف کیا ہے؟

اگر چہ انصاف کا مفہوم واضح ہے لیکن اس نکتے کا بیان فائدے سے خالی نہیں کہ انصاف کا لفظ نَصف (زبر کے ساتھ) یا نُصف (ضمّہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے یعنی کسی چیز کو نصف کرنا یا اسے نصف تک پہنچانا۔ دوسرے الفاظ میں معاشرتی امور میں اپنے اور دوسروں کے درمیان سود و زیاں کو برابر تقسیم کرنا اور مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت فریقین کو مساوی نظر سے دیکھنا۔

---

(1) نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۲۱۶۔

خلاصہ یہ کہ انصاف کی بنیاد ایثار کے جذبے اور دوسروں کے حقوق کے احساس پر مبنی ہے ۔ منصف یا با انصاف شخص وہ ہے جو دوسروں کے ساتھ مساوی حقوق کا قائل ہو اور زندگی کی سہولتوں کو اپنے اور دوسروں کے درمیان برابر تقسیم کرے ۔

قرآن میں انصاف کا تذکرہ

کچھ لوگ گفتگو کرتے وقت یا عدالت میں گواہی دیتے وقت اگر اپنے یا اپنے خویش و اقارب کے مفادات کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہیں تو آسانی سے حقیقت بیانی پر آمادہ نہیں ہوتے۔

چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے :

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا کُونُوا قَوَّامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدآءَ لِلّٰہِ وَ لَوْ عَلیٰ اَنْفُسِکُم اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْراً فَاللّٰہُ اَوْلیٰ بِھِما فَلاَ تَتَّبِعُوا الْھَویٰ اَنْ تَعْدِلُوا وَ اِنْ تلووا اَوْ تُعْرِضُوا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِیْراً (۲)

اے ایمان والو عدل و انصاف کے ساتھ سختی سے قیام کرو ۔ اور اللہ کے لئے گواہی دو ۔ اگر چہ یہ (گواہی) تمہارے اپنے نقصان میں یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو ۔ جس کے لئے گواہی دینا ہے وہ غنی ہو یا فقیر اللہ ان دونوں کے لئے تم سے زیادہ حمایت کرنے کا سزاوار ہے ۔ پس خواہشات کی اتباع نہ کرو تاکہ انصاف کر سکو ۔ اور اگر تم نے (حق میں توڑ مروڑ کیا یا (اس سے) کنارہ کشی اختیار کرلی تو یاد رکھو کہ اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

---

(۱) سورہ نساء / ۱۳۵ ۔

احادیث کی روشنی میں انصاف:

احادیث میں بھی انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ان میں سے چند ایک کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

انصاف ایمان کی علامت ہے

رسول اکرمؐ انصاف کو حقیقی مومن کی ایک نشانی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

مَنْ وَاسَی الْفَقِیرَ وَاَنْصَفَ النَّاسَ مِنْ نَفْسِهِ فَذَاکَ الْمُؤمِنُ حَقّاً (۱)

جو کوئی فقیر سے ہمدردی اور لوگوں کے ساتھ انصاف کرے وہ حقیقی مومن ہے۔

انصاف حصول عزت کا ذریعہ ہے

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

مَنْ یُنْصِفُ النَّاسَ مِنْ نَفْسِهِ لَمْ یَزِدْهُ اللّٰهُ اِلاَّ عِزّاً (۲)

جو شخص لوگوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کرے اللّٰہ اس کی عزت میں اضافہ ہی فرمائے گا۔

مالک اشتر کے نام امیر المومنینؑ کا فرمان

آپؑ نے مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں تحریر فرمایا:

اَنْصِفِ اللّٰهَ وَ اَنْصِفِ النَّاسَ مِنْ نَفْسِکَ وَ مِنْ خَاصَّةِ اَهْلِکَ وَ مَنْ لَکَ فِیْهِ هَویً مِنْ رَّعِیَّتِکَ فَاِنَّکَ اِلاَّ تَفْعَلْ تَظْلِمْ وَ مَنْ ظَلَمَ عِبَادَ اللّٰهِ کَانَ اللّٰهُ خَصْمَهُ دُونَ عِبَادِهِ وَ مَنْ خَاصَمَهُ اللّٰهُ اَدْحَضَ حجته وَ کَانَ لِلّٰهِ حَرْباً حَتّٰی یَنْزِعَ اَوْ یَتُوْبَ ... (۳)

---

(۱) خصال شیخ صدوق ج ۱ ص ۸۷۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۱۴۴ حدیث ۴۔

(۳) نہج البلاغہ صبحی صالح مکتوب نمبر ۵۳۔

اپنے نفس، اپنے خاص گھروالوں اور اپنے دوستوں اور طرفداروں کے مقابلے میں اللہ اور لوگوں کے حق میں انصاف برتو، کیونکہ اگر تم ایسا نہ کروگے تو یہ ظلم ہوگا اور جو شخص اللہ کے بندوں پر ظلم کرے اللہ اس کا دشمن ہوگا اور اللہ جس سے دشمنی کرے اس کی دلیل کو باطل کرے گا (اس کا عذر قبول نہیں کرے گا)۔ ایسا شخص خدا کے ساتھ حالت جنگ میں ہے یہاں تک کہ وہ ظلم سے دست بردار ہو اور توبہ کرے۔

سخت ترین شرعی ذمہ داری

انصاف اللہ کے احکام میں سب سے سخت حکم ہے چنانچہ حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

الاَ اُخبِرُکُمْ بِاَشَدِّ مَا فَرَضَ اللّٰہُ عَلٰی خَلْقِہٖ فَذَکَرَ ثَلاثَۃَ اَشیاءَ اَوَّلُہَا اِنْصَافُ النَّاسِ مِنْ نَفْسِکَ (۱)

کیا میں تمہیں بندوں پر اللہ کے سب سے زیادہ سخت حکم سے آگاہ نہ کروں؟ اس کے بعد آپ نے تین چیزوں کا ذکر فرمایا جن میں سے پہلی بات اپنے مقابلے میں لوگوں کے ساتھ انصاف برتنا ہے۔

فیصلہ کرنے میں انصاف

انسانی زندگی میں انصاف کی رعایت کے کچھ مرحلے ہیں۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ اپنے مخصوص حالات کے مطابق انصاف کا ثبوت دے۔ انصاف سے دوری کے ذریعے سے انسان کی دنیا و آخرت تباہ ہوسکتی ہے۔ انصاف کا سب سے اہم مرحلہ قضاوت کے وقت انصاف برتنا ہے۔ جو شخص قضاوت کی کرسی سنبھالتا ہے اسے چاہیئے کہ حق اور حقیقت کے علاوہ کسی چیز کو مد نظر نہ رکھے۔ اگر وہ دوسری چیزوں کے زیر اثر ہو یا رشتہ داری اور دوستی وغیرہ کی بنیاد پر مقدمے کے کسی ایک فریق کی طرف جھکاؤ پیدا کرے تو وہ یقیناً عدل و انصاف کے

---

(۱) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۴۵ حدیث ۶۔

راستے سے منحرف قرار پائے گا اور اس کا فیصلہ حکم خداوندی کے برخلاف ہوگا۔ اور جو حکم خداوندی کے برخلاف حکم کرے وہ ظالم، فاسق اور کافر قرار پائے گا کیونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَ مَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۱)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں پس وہی لوگ ظالم ہیں۔

وَ مَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ (۲)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔

وَ مَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (۳)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں۔

البتہ یہ بات یاد رہے کہ جب قضاوت، جج کی شرائط اور اسلام کی نظر میں قضاوت کی اہمیت کی بات ہوتی ہے تو انسان کا ذہن قضاوت کے بلند عہدوں پر فائز جج کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ لیکن حکم اور قضاوت کا کام امام یا نائب امام کی طرف سے نصب شدہ ججوں تک محدود نہیں کیونکہ "حکم" ان مواقع کو بھی شامل ہے جو ہماری نظر میں معمولی اور چھوٹے ہوں۔

ان باتوں کی روشنی میں اخلاق حسنہ سے متصف انسان کو چاہیئے کہ زندگی کے تمام مراحل میں انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور جو چیز اپنے لئے پسند نہ کرے اسے دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

---

(۱) سورہ مائدہ / ۴۵۔

(۲) سورہ مائدہ / ۴۷۔

(۳) سورہ مائدہ / ۴۸۔

دوسروں کے حدود کا احترام

دوسروں کے حریم اور ان کی شخصیت کا احترام بھی اخلاق حسنہ اور معاشرتی آداب کے تقاضوں میں سے ایک ہے ۔دوسرے الفاظ میں انسان کو چاہیئے کہ دوسروں کے حدود خاص میں ان کی اجازت اور رضامندی کے بغیر مداخلت نہ کرے ۔

یاد رہے کہ یہاں بات صرف ایک قانونی اور فقہی حکم کی نہیں مثلاً یہ کہ دوسروں کی املاک میں ان کی رضایت کے بغیر تصرف جائز ہے یا نہیں ؟ بلکہ سوال ایک اخلاقی، انسانی اور معاشرتی معاملے کا ہے جس کی حدود قانونی حدود سے زیادہ وسیع ہیں ۔ یہاں سوال انسان کی عزت، آبرو ، حیثیت ، آزادی اور اس کی حفاظت کا ہے ۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس اخلاقی اصول سے بے اعتنائی کا گناہ اس ۔کے قانونی و فقہی حکم سے لاپرواہی کی نسبت زیادہ سنگین ہے ۔ ان امور میں سے ایک لوگوں کے گھروں اور ان کی چار دیواری کا احترام ہے ۔ مالکیت کے نقطہ نظر کے علاوہ لوگوں کی معنوی حیثیت اور انسان کی بلند شخصیت کے حوالے سے بھی اس اصول کا احترام ضروری ہے ۔ ان حدود کو پامال کرنے کا مطلب خود انسان کی حیثیت کے ساتھ تجاوز شمار ہوتا ہے نہ کہ انسان سے متعلق چیزوں مثلاً اموال و املاک کے ساتھ۔ یعنی یہاں خود انسان کی عزت و آبرو کا مسئلہ در پیش ہے نہ کہ اس کی مالکیت و اموال کی حیثیت کا ۔

سورہ نور کی اکثر آیات انسان کی معنوی حیثیت وغیرہ سے مربوط ہیں ۔ اس سورہ میں اسی بارے میں قابل توجہ احکام بیان ہوئے ہیں جن میں سے بعض کی طرف یہاں اشارہ کیا جارہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَدْخلوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُم حَتَّى تَسْتَانِسُوا وَ تُسَلِّمُوا عَلَىٰ اَهْلِهَا ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ فَاِنْ لَمْ تَجِدُوا فِيْهَا اَحَداً فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ اَزْكَىٰ لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيم (۱)

اے ایمان لانے والو اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں اجازت لینے اور ان گھروں کے مکینوں پر سلام کرنے سے پہلے داخل نہ ہونا۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے شاید کہ تم نصیحت حاصل کرسکو۔ اگر تم وہاں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں داخل نہ ہونا جب تک تمہیں اجازت نہ دی جائے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو پھر لوٹ جاؤ۔ یہ کام تمہارے لئے زیادہ پاکی کا باعث ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے

دین مقدس اسلام اس قسم کے امور میں اس قدر باریک بینی سے کام لیتا ہے کہ اگر کوئی کسی دوسرے شخص کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہے تو اسے چاہیئے کہ ایک جانب کھڑے ہوکر دروازہ کھٹکھٹائے۔

پیغمبر اکرمؐ نے اپنے ایک صحابی ابو سعید سے جو رسول اللہؐ کے گھر کے دروازے پر اذن دخول کی خاطر کھڑا تھا فرمایا:

لَا تَسْتَاذِنْ وَاَنْتَ مُسْتَقْبِلُ الْبَابِ (۲)

یعنی دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اجازت نہ مانگو۔

اسلام نے اس مسئلے کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اگر کوئی والدین یا اولاد کے گھر میں بھی داخل ہونا چاہے تو اسے پہلے اجازت لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل احادیث کی طرف توجہ فرمائیے:

---

(۱) سورہ نور / ۲۷، ۲۸۔ (۲) تفسیر فخرالدین رازی ج ۲۳ ص ۱۹۸۔

اِنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ: اَسْتَاذِنُ عَلٰی اُمِّی؟ فَقَالَ: نَعَمْ۔ قَالَ اِنَّھَا لَیْسَ لَھَا خَادِمٌ غَیْرِی اَفَاَسْتَاْذِنُ عَلَیْھَا کُلَّمَا دَخَلْتُ؟ قَالَ اَتُحِبُّ اَنْ تَرَاھَا عُرْیَانَۃً؟ قَالَ الرَّجُلُ: لاَ۔ قَالَ: فَاسْتَاْذِنْ عَلَیْھَا۔ (۱)

ایک شخص نے رسول اللہؐ سے عرض کیا، کیا مجھے اپنی والدہ کے ہاں جانے کے لئے اجازت لینی چاہیئے؟ فرمایا ہاں۔ اس نے عرض کیا، میرے سوا اس کا کوئی خدمت گزار نہیں۔ کیا پھر بھی اس کے ہاں داخل ہوتے وقت اجازت لوں؟ فرمایا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اسے عریاں دیکھو؟ اس شخص نے کہا، نہیں۔ فرمایا، پس اس سے اجازت لو۔

احادیث میں مذکور ہے کہ جب رسول اکرمؐ اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر میں داخل ہونا چاہتے تو پہلے اجازت لیتے اور پھر داخل ہوتے تھے (۲)

مذکورہ باتوں سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ رسول خداؐ جو انسانیت کے لئے نمونہ عمل تھے ان نکات کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ پس ہمیں (جو ان کے پیرو کار ہیں) بھی چاہیئے آپؐ کی سیرت پر چلتے ہوئے ان اہم اور باریک نکات سے غفلت نہ برتیں۔ بنابریں جو شخص کسی دوسرے کے مکان یا چار دیواری اور حریم میں داخل ہونا چاہے اسے اجازت لینی چاہیئے۔

اولاد کا اخلاقی فریضہ

قرآن کریم میں ماں باپ کے ساتھ زندگی گزارنے والی اولاد کی ذمہ داری بیان ہوئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ وہ اجازت کے بغیر والدین کے کمرے میں داخل نہ ہوں۔

---

(۱) تفسیر مجمع البیان مطبوعہ صیدا ج/ ۴ ص ۱۳۵۔

(۲) تفسیر نور الثقلین ج/ ۳ ص ۵۸۷۔

یہ حکم اسلام کی نظر میں اس مسئلے کے اخلاقی پہلو کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ (۱) کیونکہ اس کے باوجود کہ قرآن کریم میں عام طور پر جزئیات کا تذکرہ نہیں ہوتا گھریلو زندگی کے آداب سے مربوط مسائل کا ذکر اس بحث کی اہمیت کی دلیل ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ آداب کی رعایت اخلاق حسنہ کی نشانی ہے۔ والدین کو بھی چاہیئے کہ ان باریک اور لطیف نکات سے اپنی اولاد کو آگاہ کریں اور ان سے غفلت نہ برتیں کیونکہ ان امور سے چشم پوشی بسا اوقات مستقبل میں بچوں کی زندگی کو اخلاقی انحرافات اور نفسیاتی مشکلات سے دوچار کر سکتی ہے۔

جمال پسندی

حسن و جمال سے لگاؤ انسان کے فطری تقاضوں کا حصہ ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق اچھائی، محبت کے جذبے، تجسّس و تحقیق کے جذبے اور مذہبی جذبے سے مل کر انسان کے چار معنوی پہلو تشکیل پاتے ہیں۔ قرآن کریم اس حقیقت کی تائید کرتا ہے کہ انسان جمالیات کا عاشق ہے اور زندگی کی پر نشاط سرگرمیوں اور فعالیتوں کا اہم ترین سرچشمہ یہی جذبہ ہے۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَ الْبَنِينَ وَ الْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ (۲)

لوگوں کی فطرت میں دنیا، عورتوں، اولاد اور سونے چاندی کے ڈھیر ......(و غیرہ) کی سے محبت زینت دی گئی ہے۔

---

(۱) سورہ نور / ۵۸۔۵۹۔

(۲) سورہ آل عمران / ۱۴۔

نیز ارشاد خداوندی ہے:

اَلْمَالُ وَ الْبَنُونَ زِینَۃُ الْحیاۃِ الدُّنیا وَ الْبَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ......(۱)

مال اور اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہ جانے والی نیکیاں پروردگار کے ہاں ثواب اور امید دونوں کے لحاظ سے بہتر ہیں۔

قرآن نے انسان کے جمالیاتی حسن کو ہرگز ختم یا ممنوع قرار نہیں دیا بلکہ وہ بہانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے عطا کردہ زینت اور لذت کے اسباب اصولی اور بنیادی طور پر اللہ کے نیک اور صالح بندوں کے لیے ہیں اور دوسرے لوگ مومنین کے دسترخوان کے ریزہ خوار ہیں۔ البتہ اللہ کی نعمتوں سے استفادہ کی کیفیت اور اندازے کے متعلق بعض ضوابط اور پابندیوں کی رعایت سالک راہ حق کے لئے ضروری ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِینَۃَ اللہِ الَّتِی اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ قُلْ ہِیَ لِلَّذِینَ آمَنُوا فِی الْحَیَاۃِ الدُّنیَا خَالِصَۃً یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْآیَاتِ لِقَوْمٍ یَعْلَمُونَ (۲)

اے پیغمبر کہہ دیجیئے کہ اللہ کی زینتوں کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اور پاکیزہ رزق کو کس نے حرام قرار دیا ہے؟ کہہ دیجیئے کہ یہ دنیا میں ایمان لانے والوں کے لئے ہیں (اگر چہ دوسرے لوگ بھی ان سے استفادہ کرتے ہیں لیکن) قیامت کے دن یہ صرف مومنوں کے لئے ہیں۔ ہم اس طرح اپنی آیات آگاہ لوگوں کے لئے کھول کر بیان کرتے ہیں۔

---

(۱) سورہ کہف / ۴۶۔

(۲) سورہ اعراف / ۳۲۔

عبادت کے وقت زینت

اللہ تعالی فرماتا ہے:

یَا بَنِی آدَمَ خُذُوا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ [1]

اے اولاد آدم ہر مسجد کی طرف جاتے وقت اپنی زینت کا سامان ساتھ لیتے جاؤ۔

لباس، زینت کا ایک ذریعہ

اگر چہ حقیقی زینت اور حسن، روح کو معنوی کمالات سے مزین کرنے سے عبارت ہے لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ زینت کا دائرہ معنوی کمالات تک محدود نہیں بلکہ جسمانی اور ظاہری زینتوں کو بھی شامل ہے۔

زینت کا ایک مظہر انسان کا لباس ہے۔ اس بارے میں معصومینؑ کے بعض فرامین کتابوں میں مذکور ہیں۔ جناب بحرانی قرآن کی آیت خذوا زینتکم ..... کی تشریح میں یوں نقل کرتے ہیں:

حضرت امام حسن مجتبیٰؑ نماز کے وقت اپنا بہترین لباس پہنتے تھے۔ جب آپؑ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپؑ نے فرمایا "اللہ تعالی صاحب جمال ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے اسی لئے میں اپنے پروردگار کی خاطر اپنی زینت کا سامان تیار کرتا ہوں جیسا کہ اس کا فرمان ہے کہ "عبادت کے وقت اپنی زینت کا سامان کرو۔"

پس اللہ تعالی کو یہ پسند ہے کہ میں اپنا بہترین لباس زیب تن کروں"

---

(۱) سورہ اعراف / ۳۱۔

لوگوں سے ملاقات کے وقت رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ

اس بارے میں طبرسی مرحوم نے حضرت امام صادقؑ سے ایک حدیث نقل کی ہے جسے آپؑ نے اپنے والد گرامی امام محمد باقرؑ سے نقل کیا ہے وہ حدیث یہ ہے:

وَقَفَ رَجُلٌ عَلیٰ بَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ یَسْتَأْذِنُ عَلَیْهِ قَالَ فَخَرَجَ النَّبِی صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وآله فَوَجَدَ فِیْ حُجْرَته رَکْوَةً فِیْهَا مَاءٌ فَوَقَفَ یُسَوِّی لِحْیَتَهُ وَیَنْظُرُ اِلَیْهَا فَلَمَّا رجعَ دَاخِلاً قَالَتْ لَهُ عَایِشَةُ: یَارَسُولَ اللهِ اَنْتَ سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَرَسُولُ ربِّ الْعَالَمِیْنَ وَقَفْتَ عَلَی الرَّکْوَةِ تَسْتَوِیْ لِحْیَتَکَ وَراسَکَ۔ قَالَ: یَا عَایِشَةُ اِنَّ اللهَ یُحِبُّ اِذَا خَرَجَ عَبْدُهُ الْمُؤمِنُ اِلیٰ اَخِیْهِ اَنْ یَتَهَیَّالَهُ وَاَنْ یَتَجَمَّلَ(۱)

ایک شخص نے درِ رسولؐ پر ملاقات کی اجازت چاہی۔ پس رسول اللہؐ اپنے کمرے میں موجود پانی کے برتن کے پاس کھڑے ہو گئے اور اس میں دیکھ کر اپنی ریش مبارک سنوارنے لگے۔ جب رسول اللہؐ باہر جاکر واپس تشریف لائے تو عائشہ نے پوچھا اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ بنی آدم کے سردار اور رب العالمین کے پیامبر ہیں۔ آپ کو (پانی کے) برتن کے پاس کھڑے ہو کر اپنی ریش مبارک اور سر کے بال سنوارنے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ رسول اللہ نے فرمایا اے عائشہ! اللہ کو یہ پسند ہے کہ جب اس کا مومن بندہ اپنے بھائی سے ملاقات کے لئے جانے لگے تو وہ بن سنور کر اور تیار ہو کر نکلے۔

---

(۱) مکارم الاخلاق مطبوعہ بیروت ص ۹۶۔

رسول اکرمؐ دوسروں کو بھی صفائی اور صاف ستھرا رہنے کا حکم دیتے تھے۔[1]

چند اہم نکات

یہاں چند نکات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے جو یہ ہیں۔

الف :۔ میانہ روی اور اعتدال

قرآن کریم ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ انسان کو ہر حالت میں اعتدال اور میانہ روی کا خیال رکھنا چاہیئے اور اسے اللہ کے وضع کردہ آداب کے بہانے اسراف اور تعیشات کا غلام بن کر نہیں رہنا چاہیئے :

كُلُوا وَ اشْرَ بُـوا وَ لاَ تُسْرِ فُـوا اِنَّـهُ لاَ يُحِبُّ الْمُسْرِ فِيْـنَ [2]

کھاؤ پیو اور فضول خرچی سے کام نہ لو کیونکہ وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ب :۔ حلال اور حرام کا خیال رکھنا

حضرت امام صادقؑ کا فرمان ہے :

فَالبَسْ وَ تَجَمَّلْ فَانَّ اللهَ جَمِيْل يُحِبُّ الْجَمَالَ وَ لِيَكُنْ مِنْ حَلاَلٍ [3]

اچھا لباس پہنو اور بن سنور کر رہو، کیونکہ اللہ صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ تمہارے لباس کا تعلق مال حلال سے ہو۔

---

(۱) اتيتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ و آله وَ سَلَّمَ وَ اَ نَا قَشِفُ الْهَيْئَةِ ۔ قَالَ هَلْ لَکَ مِنْ مَالٍ ؟ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ مِنْ اَ یِّ الْمَالِ ؟ قُلْتُ مِنْ کُلِّ الْمَالِ مِنَ الاِ بِلِ وَ الرَّقِيقِ وَ الْخيلِ وَ الْغَنَمِ قَالَ فَا ذَا اَ تَاکَ اللهُ مَالاً فَلْيُرَ عَلَيْکَ ۔
راوی کہتا ہے کہ میں نبی کریمؐ کے پاس آیا جبکہ میں نے میلا کچیلا لباس پہنا ہوا تھا۔ فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی مال ہے ؟ میں نے کہا ہاں۔ فرمایا کس قسم کا مال ؟ میں نے عرض کیا ہر قسم کا مال ہے جن میں اونٹ، غلام، گھوڑے اور بھیڑ بکریاں شامل ہیں۔ فرمایا: جب اللہ تمہیں کوئی مال دے تو تمہارے جسم پر اس کے آثار نظر آنے چاہیئں۔

(۲) سورہ الاعراف / ۳۱ ۔ (۳) بحارالانوار مطبوعہ بیروت ج/ ۷۶، ص ۳۰۶۔

لباس میں شہرت پسندی سے اجتناب

رسول اللہؐ نے فرمایا:

مَنْ لَبِسَ فِی الدُّنْیا ثَوْبَ شُھرَۃٍ اَلْبَسَہُ اللہُ ثَوْبَ مَذَلَّۃٍ [1]

جو شخص دنیا میں شہرت کا لباس پہنے اللہ اسے ذلت کا لباس پہنا دیتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے:

کَفیٰ بِالْمَرءِ خِزیاً اَنْ یَلْبَسَ ثَوباً یَشْھَرہ اَوْ یَرکَبَ دَابَّۃً یَشْھَرہ [۲،۳]

آدمی کی ذلت و خواری کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ایسا لباس پہنے یا ایسی سواری پر سوار ہو جائے جو اس کی شہرت کا باعث ہو۔

عفو و درگذر

عفو و درگذر اور دوسروں کی غلطیوں سے چشم پوشی اخلاق کے اعلیٰ اصولوں اور معاشرتی آداب میں سے ایک ہے، معاشرتی زندگی میں بہت کم ایسے افراد ملتے ہیں جن کا کوئی حق ضائع نہ ہوا ہو اور دوسروں نے ان کے کسی حق کو پامال نہ کیا ہو۔ بنابریں معاشرتی زندگی گزارنے کے لئے عفو و درگذر کے بغیر چارہ نہیں ہے کیونکہ اگر سب لوگ اپنے ضائع شدہ حقوق کے حصول کے لئے سخت رویہ اپنائیں اور معمولی لغزشوں سے بھی چشم پوشی نہ کریں تو زندگی بہت تلخ ہو جائے گی اور معاشرے سے باہمی الفت و محبت اور دوستانہ فضا کا مکمل طور پر جنازہ اٹھ جائے گا یوں ان کے درمیان باہمی تعاون، ایک دوسرے کی مدد اور انس ناممکن ہو کر رہ جائیں گے۔

---

(۱) المجازات النبویہ ص ۱۱۹۔

(۲) وسائل الشیعہ ج ۳ ص ۳۵۴۔

(۳) شہرت کے لباس سے مراد وہ لباس ہے جو اپنی قیمت، بُناوٹ، رنگ اور سلائی کے باعث دیکھنے والوں کی نگاہوں کا مرکز بن جائے آنکھوں کو خیرہ کرے اور لوگوں کی انگشت نمائی کا باعث بن جائے۔

قرآن میں عفو و درگذر

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر حکم دیا گیا ہے کہ لوگ اس مستحسن طریقے (عفو و درگذر) کو اپنائیں یعنی اگر اپنے براور دینی سے کسی لغزش یا غلطی کا مشاہدہ کریں تو اس سے درگذر کریں۔

ارشاد ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (۱)

عفو و درگذر کو اپنا شیوہ قرار دو، نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کشی کرو (ان سے مت جھگڑو)۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۲)

اور پرہیزگار وہ ہیں جو راحت اور سختی دونوں میں انفاق کرتے ہیں، غصہ کو پی جاتے ہیں،، لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

سورہ نور میں فرمایا گیا:

وليَعْفُوا وَ لْيَصْفَحُوا الا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ واللّٰهَ غَفُوررحيمٌ (۳)

ہر ایک کو عفو و درگذر سے کام لینا چاہیئے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ خدا تمہیں بخش دے اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

---

(۱) سورہ اعراف/ ۱۹۹۔

(۲) سورہ آل عمران/ ۱۳۴۔

(۳) سورہ سورہ نور/ ۲۲۔

احادیث میں عفو کا ذکر

جناب رسول خداؐ عفو اور درگذر کو دنیا و آخرت میں بہترین صفت قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

أَلاَ أَدُلُّكُمْ عَلىٰ خَيْرِ أَخْلاَقِ الدُّنْيَا وَ الآخِرَةِ؟ تَصِلُ مَنْ قَطَعَكَ وَ تُعْطِيْ مَنْ حَرَمَكَ وَ تَعْفُوا عَمَّنْ ظَلَمَكَ (۱)

کیا میں تمہیں دنیا و آخرت کے بہترین اخلاق سے آگاہ نہ کروں؟ وہ یہ ہے کہ تم اس شخص کے ساتھ رابطہ استوار کرو جو تمہارے ساتھ قطع تعلق کرے اور اس شخص کو کچھ دو جس نے تجھے محروم کیا ہو اور اس شخص کو بخش دو جس نے تمہارے اوپر ظلم کیا ہو۔

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

عَلَيْكُم بِالْعَفْوِ فَانَّ الْعَفْوَ لاَ يَزِيْدُ الْعَبْدَ الاّ عِزّاً فَتَعَافُوا يُعِزُّكُمُ اللّٰهُ (۲)

عفو و درگذر کا شیوہ اختیار کرو کیونکہ عفو و بخشش سے انسان کی عزت میں ہی اضافہ ہوتا ہے۔ پس ایک دوسرے کے ساتھ عفو کا سلوک کرو تا کہ اللہ تمہیں عزت دے۔

عفو کی اہمیت بیان کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ عفو اللہ کی بہترین صفات میں سے ایک ہے۔ حضرت امام زین العابدینؑ اللہ کی حمد و ثنا فرماتے ہوئے اس صفت کا یوں تذکرہ فرماتے ہیں:

وَ اَنْتَ الَّذِيْ سَمَّيْتَ نَفْسَكَ بِالْعَفْوِ فَاعْفُ عَنِّيْ (۳)

تیری ذات وہ ہے جس نے اپنا نام بخشنے والا رکھا ہے پس مجھ سے درگذر فرما۔

---

(۱) بحار الانوار ج/ ۶۸ ص ۳۹۹۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۰۸۔

(۳) صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۱۶۔

چند قابل توجہ نکات

پہلا نکتہ

یاد رہے کہ عفو و درگذر ذاتی اور انفرادی امور میں اچھی اور پسندیدہ بات ہے لیکن اجتماعی و معاشرتی امور اور حقوق اللہ کے معاملے میں عفو اور چشم پوشی نہ صرف یہ کہ اچھی بات نہیں بلکہ مذموم اور غلط ہے۔ ان امور میں عفو و درگذر سے کام نہیں لینا چاہیئے کیونکہ رسول اللہ ؐ کی سیرت یہ تھی کہ آپ ؐ حقوق اللہ کو پامال کرنے والوں کو سزا دیتے تھے اور جہاں حدود خداوندی کو جاری کرنا ضروری ہوتا تھا وہاں حد جاری فرماتے تھے اور کسی کی سفارش قبول نہ کرتے تھے۔ اسی طرح امیر المومنین حضرت علی ؑ جن کی تربیت رسول ؐ اللہ کے دامن میں ہوئی تھی اللہ کے حقوق کو کسی صورت ضایع ہونے نہیں دیتے تھے اگر چہ اللہ کے حقوق کو پامال کرنے والا آپ ؑ کا نزدیک ترین فرد ہی کیوں نہ ہو۔ اسی بناء پر جب آپ کی حکومت کے ایک گورنر نے بیت المال سے غلط فائدہ اٹھایا تو آپ ؑ نے اسے ایک خط لکھا جس کے بعض مندرجات کچھ یوں ہیں:

فَاتَّقِ اللّٰهَ وَ ارْدُدْ اِلٰى هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ اَمْوَالَهُمْ فَاِنَّكَ اِنْ لَمْ تَفْعَلْ ثُمَّ اَمْكَنَنِى اللّٰهُ مِنْكَ لَاُعْذِرَنَّ اِلَى اللّٰهِ فِيْكَ وَ لَاَضْرِبَنَّكَ بِسَيْفِى الَّذِىْ مَا ضَرَبْتُ بِهِ اَحَداً اِلَّا دَخَلَ النَّارَ وَ وَاللّٰهِ لَوْ اَنَّ الْحَسَنَ وَ الْحُسَيْنَ فَعَلَا مِثْلَ الَّذِىْ فَعَلْتَ مَا كَانَتْ لَهُمَا عِنْدِىْ هَوَادَةٌ وَ لَا ظَفِرَا مِنِّى بِاِرَادَةٍ حَتّٰى آخُذَ الْحَقَّ مِنْهُمَا وَ اُزِيْحَ الْبَاطِلَ عَنْ مَظْلَمَتِهِمَا (۱)

پس اللہ کا خوف کرو اور ان لوگوں کے اموال ان کو لوٹا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور خدا نے مجھے موقع دیا تو میں تمہارے معاملے میں اپنی الہی ذمہ داری کو نبھاؤں گا

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح مکتوب نمبر ۴۱۔

اور میں ضرور بہ ضرور اپنی اس تلوار سے تجھے ماروں گا جس سے میں نے کسی کو نہیں مارا مگر یہ کہ وہ داخل جہنم ہوا۔ اللہ کی قسم اگر حسنؑ اور حسینؑ بھی وہ کام کرتے جو تو نے کیا ہے تو انہیں (بھی) میری طرف سے کوئی حمایت حاصل نہ ہوتی اور میرے ذریعے وہ اپنے ارادوں تک نہ پہنچ سکتے یہاں تک کہ میں ان سے حق لے لیتا اور ان کے ظلم کا ازالہ کرتا۔

دوسرا نکتہ:-

بہت سے موقعوں پر جب انسان خود غلطی اور خطا کر بیٹھتا ہے تو دوسروں سے عفو کی امید رکھتا ہے لیکن دوسروں کی غلطیوں پر اپنی طرف سے عفو و درگذر کا کوئی مظاہرہ نہیں کرتا۔ بنابریں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کی غلطیوں سے چشم پوشی کریں اسے چاہیئے کہ وہ خود بھی دوسروں کی غلطیوں سے درگذر کرے اور ان کی لغزشوں کو بخش دے تاکہ دوسرے لوگ اس کی غلطیوں کو بھول جائیں۔ اگر کوئی شخص دوسروں کی برائی کا جواب برائی سے دے کر انتقام لے تو یہ طرز عمل ان کے درمیان کینہ، عداوت کی آگ کو بھڑکانے کرنے کا باعث بنے گا۔ لیکن اگر بدی کا جواب اچھائی سے دیا جائے تو اس طرز عمل سے مد مقابل کو مطیع، اور اس کی عداوت کو دوستی اور محبت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

عَاتِبْ اَخاکَ بِالاِحْسَانِ وارْدُدْ شَرَّهُ بِالاِنْعَامِ عَلَیْهِ (۱)

اپنے بھائی کی ملامت احسان و نیکی کے ذریعے کرو۔ اور اس کے ساتھ بھلائی کر کے اس کے شر کو دور کرو (یعنی اس کی برائی کا جواب اچھائی سے دو)

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح حکمت ۱۵۸۔

اتحاد و اتفاق

جذبہ اتحاد و اتفاق معاشرتی آداب اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا ایک حصہ ہے۔ اگر لوگ اس بات کے خواہشمند ہوں کہ وہ اچھی زندگی گزاریں اور اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں عظیم اور مثبت تبدیلیاں لے آئیں تو انہیں مل کر کام کرنا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں انہیں اپنی بکھری ہوئی اور چھوٹی چھوٹی قوتوں کو یکجا کرنا اور ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا پڑے گا، تاکہ وہ اتفاق و اتحاد کے سائے میں اور افکار و عقاید کے تبادلہ کے ذریعے اپنے مسائل و مشکلات کو موثر انداز میں حل کرسکیں۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ انسان اپنی فطری سوچ کی بناء پر اجتماعی و معاشرتی زندگی گزار رہا ہے یا اپنی ضروریات سے مجبور ہوکر ایسا کررہا ہے۔ لیکن بہر حال یہ حقیقت ہے کہ انسان باہمی تعاون اور اتحاد کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔ جب تک معاشرے کے افراد ایک دوسرے سے تعاون اور اتحاد کا مظاہرہ نہ کریں وہ کامیاب نہیں ہوسکتے۔

قرآن اور اتحاد کی دعوت

اتحاد و اتفاق اجتماعی امور میں پیشرفت اور اعلی مقاصد کی تکمیل میں تعمیری اور اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن کریم مختلف مقامات پر مسلمانوں کو اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتا ہے اور افتراق و اختلاف کے منحوس نتائج سے انہیں خبردار کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے:

وَ اعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيْعاً وَّ لاَ تَفَرَّقُوا وَ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَاناً۔ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱)

---

(۱) سورہ آل عمران / ص ۱۰۳۔

(تم سب اللہ کی رسی (قرآن اور اسلام یا ولایت اہل بیت ؑ) کو مضبوطی سے تھام لو۔ اور افتراق کا شکار مت ہوجاؤ۔ اور اپنے اوپر ہونے والی اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے لیکن اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کردی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ پھر تم جہنم کے کنارے پر تھے لیکن اللہ نے تمہیں اس سے نجات دی۔ یوں اللہ اپنی بات کو تمہارے لئے آشکار بیان فرماتاہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

اللہ تعالیٰ افتراق و اختلاف کو عزت و شوکت سے محرومی کا موجب قرار دیتاہے۔

ایک جگہ فرماتاہے:

وَ اطیعُوا وَ رسُولَہ وَ لا تَنَازعُوا فتفشلوا وَ تَذهَبَ ریحکُمُ و اَ صبِرُوا اِ نَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِ یْن (۱)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ایک دوسرے سے نزاع نہ کرو۔ وگرنہ کمزور پڑجاؤگے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو۔ بہ تحقیق اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اختلاف عذاب خداوندی ہے

قرآن مجید ایک اور مقام پر اختلاف و نزاع کو ایک آسمانی عذاب قرار دیتے ہوئے فرماتاہے:

قُلْ ھُوَ الْقَادِرُ عَلٰیٓ اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَاباً مِنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعاً وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیَاتِ لَعَلَّھُمْ یَفْقَھُوْنَ (۲)

---

(۱) سورہ انفال / ۴۶۔

(۲) سورہ انعام / ۶۵۔

کہہ دیجئے کہ وہی اس بات پر بھی قادر ہے کہ تمہارے اوپر سے یا پیروں کے نیچے سے عذاب بھیج دے یا ایک گروہ سے ٹکرادے اور ایک کے ذریعے دوسرے کو عذاب کا مزہ چکھادے۔ دیکھو ہم کس طرح آیات کو بدل بدل کر بیان کرتے ہیں تاکہ ان کی سمجھ میں آجائے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف و افتراق اس قدر خطرناک ہے کہ اس کا شمار آسمانی عذاب، بجلی گرنے، اور زلزلہ وغیرہ کے ساتھ ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں اپنے مذموم عزائم اور مقاصد کی تکمیل اور دنیا کے لوگوں پر حکومت کرنے نیز ان کی جان و مال اور اولاد و ناموس پر تجاوز کرنے کے لئے اقوام عالم کے درمیان اختلاف و افتراق کے بیج بوتی ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید فرعون کے بارے میں کہتا ہے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً یُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ وَ یَسْتَحْیِی نِسَاءَهُمْ اِنَّهُ کَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۱)

فرعون نے زمین (مصر) میں برتری اختیار کی اور اس نے اہل زمین کو مختلف گروہوں میں تقسیم کردیا۔ وہ ان میں سے ایک گروہ کو کمزور بناتا تھا ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑتا تھا۔ بہ تحقیق وہ ظالموں میں سے تھا۔

اس آیت سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فرعون اپنی استبدادی حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے مصر کے لوگوں میں اختلاف ڈالتا تھا۔ یہ وہی روش ہے جو سیاسی اصطلاح میں "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے نام سے معروف ہے۔

---

(۱) سورہ قصص / ۴۔

اختلاف شیطان کا ہتھکنڈا ہے

شیطان کا کام لوگوں کو گمراہ کرنا، ان کو فریب دینا اور انہیں فلاح و خوشبختی کے راستے سے دور رکھنا ہے۔ اس مقصد تک رسائی کے لئے وہ لوگوں کے درمیان اختلاف اور دشمنی ڈالنے کا حربہ استعمال کرتا ہے۔

اس بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ [1]

شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان عداوت اور کینہ پیدا کرے۔

اسلام دین اتحاد

اسلام اتحاد و وحدت کا دین ہے اور اپنے پیروکاروں کو ہر قسم کے اختلاف، نفاق اور افتراق سے خبردار کرتا ہے۔

اللہ تعالی اپنے رسولؐ سے فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ [2]

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور جو گروہ گروہ ہو گئے ان سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ پھر وہ انہیں ان کے اعمال سے باخبر کرے گا۔

اختلاف کے برے نتائج احادیث کی روشنی میں

قرآنی نقطہ نظر سے اختلاف کے برے نتائج کا مطالعہ کرنے کے بعد اب ہم بعض احادیث کا ذکر کریں گے جن میں لوگوں کو گروہ بندی اور اختلاف سے منع کیا گیا ہے۔

---

(۱) سورہ مائدہ / ۹۱۔

(۲) سورہ انعام / ۱۵۹۔

امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

وَ احذرُوا مَا نَزَلَ بالاُمَمِ قبلکم مِنَ الْمَثُلَاتِ بِسُوءِ الاَفعالِ وَ ذَمِیمِ الاَعمالِ فَتَذَکَّرُوا فِی الخَیرِ وَ الشَّرِّ اَحوالَهُمْ وَ احْذَرُوا اَنْ تَکُونُوا اَمثالَهُمْ ..... (۱)

گذشتہ امتوں کو ان کی بد عملی اور برے اعمال کی جو سزائیں ملیں ان سے ڈرو۔ ان کے اچھے اور برے احوال کو یاد کرتے رہو۔ اور اس بات کا خیال رکھو کہ کہیں تم بھی ان کی طرح نہ بن جاؤ۔

نیز آپؑ نے اختلافات کے نقصان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

فَاِیَّاکُمْ وَ التَّلَوُّنِ فِی دِیْنِ اللّٰهِ فَاِنَّ جَمَاعَةً فِیْمَا تَکْرَهُونَ مِنَ الْحَقِّ خَیرٌ مِنْ فُرْقَةٍ فِیْمَا تُحِبُّونَ مِنَ الْبَاطِلِ وَ اِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ لَمْ یُعْطِ اَحَداً بِفُرْقَةٍ خَیْراً مِمَّنْ مَضیٰ وَ لَا مِمَّنْ بَقِیَ (۲)

اللہ کے دین میں دو رنگی اور اختلاف سے بچو کیونکہ راہ حق میں نہ چاہتے ہوئے بھی اتحاد و اتفاق کرنا بہتر ہے اس افتراق سے جو تمہارے پسندیدہ امر باطل پر ہو نیز اللہ نے اختلاف کے باعث کسی کو اچھائی سے ہمکنار نہیں کیا خواہ اس کا تعلق گذشتہ لوگوں سے ہو یا باقی ماندہ افراد سے۔

ایک اور مقام پر اختلاف کو شیطانی دام میں پھنسنے کا موجب قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَ الْزَمُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّ یَدَاللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ وَ اِیَّاکُمْ وَ الفُرْقَةَ فَاِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ لِلشَّیْطَانِ کَمَا اَنَّ الشَّاذَّ مِنَ الْغَنَمِ لِلذِّئْبِ (۳)

---

(۱) نہج البلاغہ ص ۱۹۲۔

(۲) نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۱۷۶۔

(۳) نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۱۲۷۔

ہمیشہ سب سے بڑی جماعتوں (جو حق پر ہوں) کے ساتھ رہو کیونکہ اللہ کی مدد جماعت کے ساتھ ہوتی ہے اور افتراق سے بچتے رہو کیونکہ اکیلا انسان شیطان کا حصّہ ہے جس طرح اکیلی گوسفند بھیڑیے کا حصہ ہے.....

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتاہے:

انَّ الشَّیْطَانَ یُسَنّیٰ لَکُمْ طُرقَہ وَ یُرِیْدُ اَنْ یُحلّ دِینکُمْ وعُقدۃً عُقدہٗ وَ یُعْطِیکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ الفرقۃ وَ بالفرقۃ اَلْفِتْنَۃَ ۔ فَاصْدِفُوا عَنْ نَزَغَاتِہ وَ نَفَثَاتِہ وَ اقْبَلُوا النَّصِیْحَۃَ مِمَّنْ اَھْدَاھَا اِلَیْکُمْ وَاعْقِلُوھَا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ (۱)

شیطان اپنی راہوں کو تمہارے لئے آسان راہوں کے طور پر جلوہ گر کرتاہے۔ وہ چاہتاہے کہ تمہارے دینی عہدوں کی گرہیں ایک ایک کرکے کھولے اور اتفاق و اتحاد کی جگہ افتراق ڈالے اور افتراق کے ذریعے فتنہ و فساد پیدا کرے۔ بنابریں شیطانی وسوسوں اور چالوں سے بچے رہو اور نصیحت کرنے والوں کی نصیحت کو قبول کرتے ہوئے اسے اپنے وجود کے اندر محفوظ کرو۔

نیز ارشاد فرمایا ہے:

وَ اعْلَمُوا اَنَّ الشَّیْطَانَ اِنَّمَا یُسَنّیٰ لَکُمْ طُرُقَہ لِتَتَّبِعُوا عَقِبَہ (۲)

اور جان لو کہ شیطان اپنی (مکارانہ) راہوں کو تمہارے لئے آسان بناکر پیش کرتاہے تاکہ تم لوگ اس کی پیروی کرو۔

عہد و پیمان کی پابندی

عہد و پیمان کی پابندی ایک فریضہ ہے۔ یہ معاشرتی آداب اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا ایک حصّہ بھی ہے۔ جادہ حق پر گامزن شخص کو چاہیئے کہ وہ اس فریضے کی طرف ہمیشہ توجہ دیتارہے۔

---

(۱) نہج البلاغہ فیض الاسلام خطبہ ۱۲۰۔

(۲) نہج البلاغہ فیض الاسلام خ ۱۳۸۔

قرآن اور احادیث میں اس مسئلے کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے چنانچہ ہم بعض آیات اور احادیث کا یہاں تذکرہ کرتے ہیں۔

عہد کی پابندی قرآن میں

★ ایمان کی علامت

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۱)

یعنی مومن وہ لوگ ہیں جو اپنی امانتوں اور وعدوں کا پاس رکھتے ہیں۔

★ نیکوکاری کی علامت

قرآن کہتا ہے:

وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (۲)

(نیک لوگ وہ ہیں) جو عہد کرنے کے بعد اس کو پورا کرتے ہیں

★ اسماعیلؑ، وعدے کا سچا

عہد کی پابندی کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ تعالی حضرت اسماعیلؑ کی عظمت کو بیان کرنا چاہتا ہے تو عہد کی پابندی کو ان کی نمایاں صفات میں سے ایک کے عنوان سے ذکر فرماتا ہے ارشاد ہوا:

وَ اذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا (۳)

اور اپنی آسمانی کتاب میں اسماعیل کو یاد کرو۔ بے شک وہ وعدے کا سچا تھا نیز وہ ہمارا رسول اور باعظمت نبی تھا۔

---

(۱) سورہ مومنون / ۸ نیز سورہ معارج / ۳۲۔ (۲) سورہ بقرہ / ۱۷۷۔

(۳) سورہ مریم / ۵۴۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں عہد کی سچائی کا ذکر رسالت و نبوت کے ذکر سے پہلے کیا گیا ہے گویا اللہ یہ فرمانا چاہتا ہے کہ وعدے کی پابندی نبوت کی بنیاد ہے۔

بہرحال قرآن مجید عہد کی پابندی پر بہت زور دیتا ہے اور فرماتا ہے:

وَاَوفُوا بِالعَہدِ اِنَّ العَہدَ کَانَ مَسئُولاً (۱)

اور عہد کو پورا کرو بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

عہد کی پابندی کی اہمیت احادیث کی روشنی میں

احادیث میں بھی عہد و پیمان کی پابندی کی پر زور دیا گیا ہے۔ یہاں ہم اس سلسلے کی بعض روایات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

* عہد کی پابندی مومنوں کا شیوہ ہے

رسول اکرمؐ کی حدیث ہے:

مَن کَانَ یُؤمِنُ بِاللّٰہِ وَ الیَومِ الآخِرِ فَلیَفِ اِذا وَعَدَ (۲)

جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ اپنا وعدہ وفا کرے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا:

اِنَّ الوَفَاءَ بِالعَہدِ مِن عَلاَمَاتِ اَہلِ الدِّینِ (۳)

بہ تحقیق عہد کی پابندی دینداروں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

---

(۱) سورہ اسراء / ۳۴۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۳۶۴ حدیث ۲۔

(۳) سفینۃ البحار ج/ ۲ ص ۶۷۵۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہؐ سے منقول ہے:

لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ (۱)

جو شخص عہد کی پابندی نہ کرے وہ بے دین ہے۔

★ وعدہ وفا نہ کرنا منافق کی علامت ہے

رسول اللہؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

آیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاث اذا حَدَّثَ کَذَبَ وَ اذا وَعَدَ اخْلَفَ و اذَ ائْتُمِنَ خَانَ (۲)

منافق کی تین علامات ہیں دروغگوئی، عہدشکنی اور امانت میں خیانت۔

ھشام بن سالم کہتا ہے کہ حضرت امام صادقؑ نے فرمایا:

عِدَۃُ الْمُؤْمِنِ اَخاہ نَذْرٌ لَا کَفَّارَۃَ لَہٗ فَمَنْ اَخْلَفَ فبِخُلْفِ اللّٰہِ بَدَ اَوَ لِمقْتِہِ تَعَرَّض وَ ذالِکَ قَوْلُہٗ ....

مومن اپنے برادر دینی سے جو وعدہ کرتا ہے۔ وہ ایک نذر ہے جس کی پابندی لازم ہے اور اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ جو شخص وعدہ خلافی کرے وہ گویا خدا کی مخالفت سے ابتدا کرتا ہے۔ اور اس کے غضب کو دعوت دیتا ہے یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے اے ایمان لانے والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے؟

---

(۱) بحار الانوار ج/ ۷۲ ص ۹۶۔

(۲) المتعارف ج/ ۱ ص ۱۹۸۔

یاد دہانی

اسلام عہد کی پابندی کو بڑی اہمیت دیتا ہے یہاں تک کہ اس شخص کے ساتھ بھی عہد و پیمان کی پابندی کو لازم قرار دیتا ہے۔ جو انسان کا دشمن اور عقیدہ، مسلک اور ہدف میں اس کا مخالف ہو۔

حضرت امام صادقؑ کا ارشاد ہے:

ثَلاثٌ لَمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِاَحَدٍ فِيهِنَّ رُخْصَةً اَداءُ الْاَمانَةِ اِلَى الْبَرِّ وَالْفاجِرِ وَالْوَفاءُ بِالْعَهْدِ لِلْبَرِّ وَالْفاجِرِ وَبِرُّ الْوالِدَيْنِ بَرَّيْنِ كانا اَوْ فاجِرَيْنِ[1]

تین چیزیں ایسی ہیں جن کی مخالفت کرنے کی اللہ نے کسی کو اجازت نہیں دی (ان میں سے ایک) کسی کی امانت کی ادائیگی ہے خواہ وہ نیک ہو یا برے دوسری چیز یہ ہے کہ ہر اچھے برے کے ساتھ کئے گئے عہد کو پورا کیا جائے۔ اور تیسری چیز والدین کے ساتھ نیکی ہے خواہ وہ اچھے ہوں یا فاجر۔

نیز امیر المومنین حضرت علیؑ نے مالک اشتر کو حکم دیا کہ وہ اپنے دشمن کے ساتھ کئے گئے عہد کی پابندی بھی کرے۔ چنانچہ آپؑ نے فرمایا:

وَاِنْ عَقَدْتَ بَيْنَكَ وَبَيْنَ عَدُوِّكَ عُقْدَةً او البستَه مِنْكَ ذِمَّةً فَحُطْ عَهْدَكَ بِالْوَفاءِ وَارْعَ ذِمَّتَكَ بِالْاَمانَةِ وَاجْعَلْ نَفْسَكَ جُنَّةً دُونَ ما اَعْطَيْتَ فَاِنَّهُ لَيْسَ مِنْ فَرائِضِ اللّٰهِ شَيْءٌ النّاسُ اَشَدُّ عَلَيْهِ اجْتِماعاً مَعَ تَفَرُّقِ اهوائِهِم وَتَشَتُّتِ آرائِهِمْ مِنْ تَعْظِيمِ الْوَفاءِ بِالْعُهُودِ[2]

---

(۱) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۶۲۔

(۲) نہج البلاغہ صبحی صالح مکتوب نمبر ۵۳۔

اگر اپنے دشمن کے ساتھ کوئی عہد کرو یا اس کو پناہ دو تو اپنے عہد کو جامہ عمل پہناؤ اور اپنی پناہ کو نبھاؤ اور اپنی جان کو اپنے وعدوں کی ڈھال بناؤ کیونکہ واجبات خداوندی میں سے کوئی چیز اس لحاظ سے عہد کی پابندی کی طرح نہیں کہ لوگ اپنی خواہشات اور آراء و افکار میں اختلاف کے باوجود عہد کی پابندی کو اہمیت دیتے ہیں اور اس بارے میں اتفاق نظر رکھتے ہیں۔

رسول اللہؐ کا دشمن کو امان دینا اور اسے نبھانا

رسول اللہؐ کے ایک دشمن نے جنگ خیبر میں آپ سے امان مانگی تا کہ وہ اس کے بدلے قلعہ خیبر میں داخلے کا راستہ دکھائے۔ حضورؐ نے اسے امان دے دی۔ اس نے اہل قلعہ تک پانی کی رسد کا راستہ دکھایا اور اسے بند کر کے اہل قلعہ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کا مشورہ دیا۔ رسول اللہؐ نے ایسا کرنے سے انکار فرمایا لیکن اس شخص کو امان دے کر اپنا وعدہ پورا کیا۔ بہر حال دوست و دشمن کے ساتھ عہد کی پابندی انسانی معاشرتی نظام کا اہم ترین ستون ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے عہد و پیمان اور وعدوں کو نبھائے۔ یہ امر اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا ہے:

اَقْرَبُکُمْ مِنّی غَداً فِی الْمَوْقِفِ اَصْدَقُکُمْ لِلْحَدِیْثِ وَ اَدّاکُمْ لِلْاَمَانَةِ وَ اَوْفَاکُمْ بِالْعَهْدِ (1)

کل قیامت کے دن سب سے زیادہ میرے قریب وہ شخص ہوگا جو تم میں زبان کا سب سے زیادہ سچا، امانت کو سب سے زیادہ ادا کرنے والا اور عہد کا سب سے زیادہ پابند ہو۔

---

(1) بحار الانوار ج/ ۲۱ ص ۹۸۔

عہد کرتے وقت اپنی بساط کا جائزہ لینا

عہد کی پابندی کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اسلام نے حکم دیا ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ کوئی وعدہ کرنا چاہے وہ وعدہ کرنے سے قبل اپنی طاقت، توانائی اور بساط کا جائزہ لے کہ کیا وہ اپنے وعدے کو نبھا سکتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ اسے نبھانے کی طاقت نہیں رکھتا تو وعدہ ہی نہ کرے۔

چنانچہ امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

لَا تَعِدَنَّ عِدَةً لَا تَثِقُ مِنْ نَفْسِکَ بِاِنْجَازِهَا [1]

ایسا وعدہ ہرگز نہ کرو جسکو پورا کر سکنے کے بارے میں تجھے یقین حاصل نہ ہو۔

---

(۱) فہرست غرر الحکم ص ۴۰۷ شمارہ ۱۰۲۷۹۔

بیسواں نکتہ

زھد

زہد سے مراد اس چیز سے بے رغبتی ہے جس میں ذاتی اور فطری طور پر جاذبیت ہو اور انسان اس کی طرف رحجان اور رغبت رکھتا ہو اگر انسان اپنے ارادہ و اختیار سے اس چیز سے بے رغبتی اختیار کرے اور اس کی جاذبیت و دلکشی کو اہمیت نہ دے تو وہ زاہد کہلائے گا۔ قرآن کریم حضرت یوسفؑ کے بھائیوں (جنہوں نے حضرت یوسفؑ کو غلام کے طور پر معمولی قیمت کے بدلے فروخت کیا تھا) کے بارے میں فرماتا ہے:

وَ کَانُوا فِیہِ مِنَ الزَّاہِدِینَ (۱)

یعنی انہوں نے اپنے بھائی یوسف کے بارے میں زہد اور بے رغبتی کا مظاہرہ کیا اور انہیں کم قیمت میں فروخت کر دیا۔ وہ یوسفؑ سے حسد کے باعث انہیں اپنے درمیان نہیں دیکھنا چاہتے تھے یوں انہوں نے اپنے باپ (یعقوبؑ) کو سالہا سال تک یوسفؑ کے فراق میں تڑپایا۔

---

(۱) سورہ یوسف / ۲۰۔

یہ تھا زہد کا لغوی اور عام معنی لیکن اخلاقی و معنوی خصوصیت کے لحاظ سے زہد کا مفہوم اس سے کہیں بلند و بالا ہے، زھد عرفا کی نظر میں عبودیت کا ایک مرحلہ و مرتبہ ہے دوسرے الفاظ میں زہد عبارت ہے دنیا کو دل سے نکالنے اور اخروی منازل کی طرف حرکت کرنے سے۔

اس لطیف نکتے کی تفسیر ایک جملے یا ایک کتاب میں نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عرفاء اور علم اخلاق کے ماہرین نے زہد کے بارے میں مختلف عبارات اور تعبیروں سے کام لیا ہے جن میں سے ہر تعبیر زہد کے کسی ایک پہلو کی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ لفظ ایک لطیف عرفانی اور مذھبی مفہوم کا حامل ہے لہذا بہتر ہے کہ ہم اس لفظ کی تعریف کرتے وقت زبان وحی، پیشوایان مذہب کی تعبیرات اور تعلیمات دینی کا سہارا لیں اور اس لفظ کے حدود اربعہ کو انہی کی روشنی میں معین کریں۔ قرآن کریم نے دو مختصر جملوں میں اس کی ایک جامع تعریف بیان کی ہے جو حکمت و معرفت سے لبریز ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لِكَيْلاَ تَاسَوْا عَلىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلاَ تَفْرَحُوا بِمَا آتيكُمْ .... (۱)

یعنی اگر دنیا کا تیری طرف منہ کرنا یا اس کا منہ پھیرنا یا اس کا حصول اور اس سے محرومی تمہاری نظروں میں مساوی ہوں دوسرے لفظوں میں دنیا سے محرومی پر تمہیں غم و اندوہ یا افسوس نہ ہو اور دنیا کے حصول سے شادان و وابستہ نہ ہوں تو اس صورت میں تم زہد کے مقام کو حاصل کرلوگے۔

اس جملے سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہوتی ہے کہ زہد ایک باطنی کیفیت ہے جو ان دونوں خصوصیات (دنیا سے محرومی پر عدم افسوس اور حصول دینا پر عدم خوشحالی) کے ذریعے پہچانی جا سکتی ہے۔ بنابریں حقیقی زاہد وہ ہے جو دنیا کی رنگینیوں اور اس کے زرق

---

(۱) سورہ الحدید / ۲۳۔

و برق کا دیوانہ نہ بن جائے اور مادی دنیا کو اپنا حقیقی مقصد قرار نہ دے بلکہ اس سے کہیں بلند و برتر مقاصد کو پیش نظر رکھے۔ ان عرائض کی روشنی میں ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حقیقی "زہد" تین چیزوں سے مشروط ہے:

پہلی شرط یہ کہ:۔ انسان کے اندر فطری خواہش، رجحان اور رغبت موجود ہو۔ اگر کوئی شخص بیماری کی وجہ سے کھانے کی اشیاء اور پھلوں وغیرہ سے بے رغبت ہوجائے تو اس بے رغبتی کو ہم زہد نہیں کہہ سکتے اور اس کا زہد سے کوئی تعلق نہیں۔

دوسری شرط یہ کہ:۔ مادی وسائل تک دسترسی ممکن ہو۔ پس اگر کسی کو مجبوری اور عجز و ناتوانی کی بناء پر حصول دنیا سے محرومی کا سامنا کرنا پڑے تو اسے بھی زاہد کہنا درست نہیں۔

تیسری شرط یہ ہے کہ:۔ دنیا کی تمام تر مادی اور شہوانی "جاذبیت" کے باوجود انسان عظیم تر مقاصد اور بالاتر اہداف کی خاطر دنیا سے بے رغبتی اختیار کرے اور دنیا کے زرق و برق اور آنکھوں کو چکاچوند کرنے والی رنگینیوں کا غلام بن کر نہ رہ جائے۔

یہ تینوں شرائط پوری ہوں تو زہد کا حقیقی چہرہ منصہ شہود پر آتا ہے خلاصہ یہ کہ حقیقی زاہد وہ ہے جو دل سے دنیا کو طلاق دے۔ زاہد وہ نہیں جو حصول دنیا میں ناکامی یا مجبوری یا خودنمائی اور دکھاوے کی خاطر تارک دنیا بن بیٹھے۔

بقول شاعر

غلامِ همتِ آنم که زیر چرخ کبود ز هر چه رنگ تعلق پذیرد آزاد است

اس شعر میں شاعر اس شخص کی ہمت کو خراج تحسین پیش کرتا ہے جو دنیا کی رنگینیوں کے ہاتھوں دل نہیں دے بیٹھتا۔

اس بارے میں امیرالمومنین علیؑ نے بہت کچھ فرمایا ہے جن میں سے کچھ نہج البلاغہ میں مذکور ہے۔ اگر ہم آپؑ کے فرامین کی روشنی میں اس موضوع کے تمام گوشوں پر سیر حاصل بحث کرنا چاہیں تو اس کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہوگی۔ بنابریں یہاں ہم چند نکات بیان کرنے پر اکتفا کریں گے اور تفصیلات کے طالب حضرات کو اس فن کے اساتید کی

وتحریروں خاص کر شہید مرتضیٰ مطہریؒ کی کتاب سیری در نہج البلاغہ[1] کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیں گے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ ایک جگہ دنیا کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یَا دُنیَا یَا دُنیَا اِلَیکِ عَنّی اَبِیَ تَعَرَّضتِ امْ اِلَیَّ تَشَوَّقتِ؟ لاحَانَ حِیْنُکِ۔ هَیْهَاتَ غُرِّی غَیرِیْ لاَ حَاجَۃَ لِیَ فِیکِ۔ قَدْ طَلَّقتُکِ ثَلَاثاً لاَ رَجْعَۃَ فِیهَا۔ فَعَیْشُکِ قَصیرٌ وَ خَطَرُکِ یَسیرٌ وَ اَمَلُکِ حَقیر[2]

اے دنیا! اے دنیا! مجھ سے دور ہوجاؤ۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میرے سامنے جلوہ گر ہوجاؤ۔ تجھے مجھ سے رغبت ہوگئی ہے؟ تیرا وہ وقت نہ آئے (کہ تو مجھے فریب دے) ایسا کبھی نہ ہوگا۔ جاؤ میرے سوا کسی اور کو دھوکہ دو۔ مجھے تیری کوئی حاجت نہیں۔ میں تجھے تین بار طلاق دے چکا ہوں جس کے بعد رجوع کی گنجائش نہیں تیری زندگی مختصر، تیری قدر و قیمت کم اور تیرے ساتھ امید باندھنا پست و حقیر کام ہے۔

ایک اور مقام پر آپؑ کا ارشاد ہے:

و لو شِئتُ لاَ هْتَدَیتُ الطَّرِیْقِ اِلَی مُصَفّی هٰذا العَسَلَ وَ لُبابَ هذا القَمحِ وَ نَسَائِجِ هذا القزِّ وَ لٰکِن هَیْهَاتَ انْ یَّغلِبَنِي هَوٰیَ وَ یَقُودَنِیْ جَشَعِی اِلیٰ تَخَیُّرِ الْاَطْعِمَۃِ...... فَمَا خُلِقتُ لِیَشْغَلَنِیِ اَکْلُ الطَّیِّبَاتِ کَالْبَهِیْمَۃِ الْمَرْبُوطَۃِ هَمُّهَا عَلَفُهَا[3] .....

---

(۱) اس کتاب کا اردو ترجمہ اسرار نہج البلاغۃ کے نام سے دار الثقافۃ الاسلامیہ کراچی نے چھاپا ہے۔ جو اسی مترجم کی کاوش ہے۔

(۲) نہج البلاغہ فیض الاسلام حکمت ۷۶۔

(۳) نہج البلاغہ فیض السلام مکتوب ۴۵۔

اگر میں چاہتا تو خالص شہد، گندم اور ریشم کے لباسوں کو استعمال کر سکتا تھا لیکن میں کبھی بھی اپنی خواہشات سے مغلوب ہونے والا نہیں ہوں۔ اور نہ لالچ مجھے شکم پرستی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ میں اس لئے خلق نہیں ہوا ہوں کہ اچھے اور لذیذ کھانوں کے چکر میں کھو کر رہ جاؤں اس چوپائے کی طرح جو بندھا ہوا ہو اور اس کا کام چارہ کھانا ہو اور بس۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

لَيْسَ الزُّهْدُ فِى الدُّنْيَا إِضَاعَةَ الْمَالِ وَ لاَ تَحْرِيمُ الْحَلَالِ بَلِ الزُّهْدُ فِى الدُّنْيَا انْ لاَ تَكُونَ بِمَا فِى يَدِكَ أَوْثَقُ مِمَّا عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ[1]

زہد یہ نہیں کہ تم دنیا میں اپنا مال ضائع کر دیا حلال کو اپنے اوپر حرام قرار دو بلکہ زہد اور دنیا سے بے رغبتی یہ ہے کہ تم اپنے پاس موجودہ چیز کی بہ نسبت اللہ کے ہاں موجود اشیاء کو زیادہ اہمیت دو۔ یعنی اگر تم صرف اللہ پر بھروسہ کرو اور اس کے علاوہ کسی چیز کا سہارا نہ لو۔ تو جان لو کہ تم زاہد ہو۔

زہد کی علامات

زہد کے کچھ آثار و علامات ہیں صاحبان عرفان اور سیر و سلوک کے ماہرین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق زہد کے مختلف آثار بیان کئے ہیں لیکن بہتر ہے کہ یہاں بھی ہم رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کے فرامین کی طرف رجوع کریں کیونکہ قرآن کے بعد سب سے بہتر اور سب سے زیادہ خوبصورت کلام رسول خداؐ اور زاہدوں کے سالار علی بن ابی طالبؑ کا کلام ہے۔

---

(۱) فروع کافی ج/ ۵ ص ۷۰۔

رسول اکرمؐ کی حدیث ہے:

مَنْ زَهَدَ فِی الدُّنیَا اَدْخَلَ اللّٰهُ الحِکمةَ فِی قَلْبِهِ فَاَنْطَقَ بِهَا لِسَانَه وَ عَرَّفَهُ داءَ الدُّنیَا وَدَوَائهَا وَاَخْرَجَهُ مِنْهَا سَالِماً اِلیٰ دَارِ السَّلَامِ (۱)

جو شخص دنیا سے بے رغبتی اور زہد اختیار کرے اللہ اس کے دل میں حکمت کو داخل کرتاہے اور، اس کی زبان پر حکمت کو جاری فرماتاہے، اسے دنیا کی بیماریوں اور دوائیوں سے آشنا بناتاہے اور اسے دنیا سے صحیح و سالم نکال کر دار السلام (بہشت) کی طرف لے جاتاہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

اِنَّ الزَّاهِدِیْنَ فِی الدُّنیَا تَبْکِیْ قُلُوبُهُمْ وَاِنْ ضَحِکُوا وَیَشْتَدُّ حُزْنُهُمْ (۲) وَاِنْ فَرِحُوا وَیَکْثُرُ مَقْتُهُمْ اَنْفُسَهُمْ وَاِنْ اغْتُبِطُوا بِمَا رُزِقُوا ....

بہ تحقیق زہد (دنیا سے بے رغبتی) اختیار کرنے والوں کے دل روتے ہیں اگر چہ وہ بظاہر ہنستے ہیں اور وہ سخت محزون ہوتے ہیں اگر چہ ظاہرا خوشحال ہوتے ہیں نیز وہ اپنے نفس کے ساتھ بہت مقابلہ کرتے ہیں اگر چہ ان کو حاصل نعمتوں پر دوسرے لوگ رشک کرتے ہیں۔

یہاں اس نکتے کا ذکر فائدہ سے خالی نہیں کہ مذکورہ بالا تشریح و توضیح کی روشنی میں زہد مکمل طور پر ترک دنیا اور مادی نعمتوں سے پرہیز کا نام نہیں۔ چنانچہ حضرت رسول خداؐ، حضرت سلیمانؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت علیؑ اور حضرت خدیجہؑ اور دیگر بہت سے اولیائے خدا سلطنت و حکومت اور مال و دولت رکھنے کے باوجود اللہ کے زاہدترین بندوں

---

(۱) المحجۃ البیضاء ج/۷ ص ۳۵۳۔

(۲) نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ نمبر ۸۱۔

میں شامل تھے ۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ عام طور پر زہد انسان کو اس قدر مال و دولت پر قانع بنا دیتا ہے جس سے اس کا گزارہ چل جائے اور اس کی پاکدامنی محفوظ رہے۔

زاہد لوگ اس سے زیادہ دنیا کے پیچھے پڑ کر اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا نہیں کرتے ۔ اگر ان کے پاس کوئی چیز ہو بھی تو اسے راہ خدا میں یا لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کی خاطر خرچ کر ڈالتے ہیں اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں ۔

چنانچہ ارشاد قرآنی ہے :

وَ یُؤثِرُوْنَ عَلیٰ اَنْفُسِہِمْ وَ لَوْ کَانَ بِہِمْ خصاصة (1)

یعنی وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود تنگی میں ہوں۔

---

(1) سورہ حشر / آیت 9 ۔

اکیسواں نکتہ

قناعت

قناعت صاحب ایمان اور نیک لوگوں کی ایک اور خصوصیت ہے۔ تزکیہ و تربیت نفس والے اشخاص جو قناعت و عزت کے اوصاف سے بھی متصف ہیں دوسروں کے مال و دولت کو لالچ اور طمع کی نظر سے نہیں دیکھتے اور حصول جاہ و مال کے لئے اپنی شخصیت کو تباہ نہیں کرتے۔ قناعت پسند لوگ بنیادی ضروریات پر بلکہ اس سے کم پر بھی راضی ہوتے ہیں۔ قناعت کی سب سے واضح علامت خدا کی تقسیم پر راضی برضا رہنا ہے۔ قناعت اخلاقی بلندی کی ایک دلیل اور رسول اکرمؐ کی اخلاقی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔ ہمیں بھی چاہیئے کہ آنحضرتؐ جو ہمارے لئے نمونہ عمل ہیں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس صفت سے آراستہ کریں۔

حضرت امام صادقؑ نے فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ خَصَّ رَسُولَہ بِمَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ فَامْتَحِنُوا اَنْفُسَکُمْ فَاِنْ کَانَتْ فِیْکُمْ فَاحْمِدُوا اللّٰہ وَارْغَبُوا اِلَیْہِ فِی الزِّیَادَۃِ مِنْھَا

فَذَكَرَهَا۔ عَشَرَةً: اَلیَقِینَ وَ القناعۃ وَ الصَّبْرُ وَ الشُّکْرَ وَ الحِلْمَ وَ حُسْنَ الخُلُقِ وَ السَّخَاءَ وَ الغَیْرَۃَ وَ الشَّجَاعَۃَ والمُرُوَّۃَ (۱)

بہ تحقیق اللہ تعالی نے اعلیٰ اخلاقی خوبیوں کو اپنے رسولؐ کا خاصہ قرار دیا۔ پس تم بھی اس سلسلے میں اپنے آپ کو آزماؤ۔ پھر اگر تم میں یہ خوبیاں موجود ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ ان میں اضافہ کرے۔ وہ خصوصیات یہ ہیں، یقین، قناعت، صبر، شکر، رضا، خوش خلقی، سخاوت، غیرت شجاعت اور بہادری۔

قناعت کے دو درجے ہیں ایک عالی اور دوسرا اعلیٰ پہلا درجہ یہ ہے کہ بندہ صرف ضروری چیزوں پر اکتفا کرے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس سے بھی کم پر راضی ہو۔

قناعت کی یہ دونوں صورتیں عظیم انسانی صفات نیز انبیاء و اولیاء صالحین کی خصوصیات میں داخل ہیں البتہ دوسرا درجہ پہلے والے درجے سے زیادہ اہم ہے کیونکہ جو شخص اس مرحلے میں بھی قناعت کا عادی ہو وہ قناعت کے علاوہ جذبہ ایثار و قربانی کا بھی حامل ہوگا۔

قرآن کے مطابق:

وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَ لَوْ کَانَ بِہِمْ خصاصۃ (۲)

وہ دوسروں کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں اگر چہ وہ خود، شدید محتاج ہی کیوں نہ ہوں۔

---

(۱) وسائل الشیعہ ج۱۱/ ص ۱۳۹۔

(۲) سورہ حشر/ ۹۔

امیر المومنین علی علیہ السلام کا ارشاد:

آپؑ رسول خداؐ کے ایک صحابی خبّاب بن ارت کی تعریف کرتے ہوئے ان کی امتیازی صفات میں سے ایک قناعت اور مقدار ضرورت پر اکتفا کرنے کی خصلت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يَرحمُ اللهُ خبّابَ ابْنَ الأرَتّ فَلَقَدْ أسْلَمَ رَاغِباً وَ هَاجَرَ طَائِعاً وَ قَنَعَ بِالْكَفَافِ وَ رَضِيَ عَنِ اللهِ وَ عَاشَ مجاهداً

خباب بن ارت پر اللہ کی رحمت ہو۔ بہ تحقیق وہ اپنی رغبت سے مسلمان ہوا۔ اس نے جذبہ اطاعت کے تحت ہجرت کی۔ سادہ زندگی اپنائی۔ اللہ (کی قضاء و قدر) سے راضی رہا اور مجاہدانہ زندگی گزاردی۔

اس کے بعد فرمایا:

طوبىٰ لِمَنْ ذكرَالمعَادَ وعَمِلَ لِلحساب وقَنعَ بِالْكَفَافِ وَ رضِيَ عَنِ اللهِ (۱)

خوش نصیب ہے وہ شخص جو آخرت کو یاد کرے۔ روز حساب کے لئے عمل کرے ضرورت بھر پر قناعت کرے اور اللہ سے راضی رہے۔

قناعت کے آثار و نتائج

قناعت کی موجودگی اور عدم موجودگی کے آثار و نتائج مختلف ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اگر کسی انسان میں قناعت کا جذبہ موجود ہو تو اس کے بہت ہی اچھے نتائج مرتب ہوں گے لیکن اگر وہ قناعت کی بجائے حرص و طمع کا غلام ہو تو اس کے برے اور منفی اثرات ظاہر ہوں گے۔

---

(۱) نہج البلاغہ فیض الاسلام حکمت ۳۱۔

قناعت کے مثبت اثرات

۱۔ عزت و سرفرازی : اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ اسلامی اور قرآنی نقطہ نظر سے عزت و بزرگی کے حقدار صرف مومنین ہیں۔

ارشاد قرآنی ہے :

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰـکِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱)

عزت تو صرف اللہ ، اس کے رسول اور مومنین کا حق ہے لیکن منافقین یہ نہیں جانتے ۔

مؤمن کو حاصل یہ عزت اور عظمت اس قدر اہم ہے کہ اسلام نے مومن کو دوسروں کے آگے اپنے آپ کو ذلیل و خوار بنانے کی کسی صورت اجازت نہیں دی ہے۔

حضرت امام صادقؑ کا ارشاد ہے :

اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی فَوَّضَ اِلَی الْمُؤْمِنِ اُمُوْرَہٗ کُلَّھَا وَلَمْ یُفَوِّضْ اِلَیْہِ اَنْ یُذِلَّ نَفْسَہٗ اَلَمْ تَرَ قَوْلَ اللّٰہِ سُبْحَانَہٗ وَ تَعَالٰی ھٰھُنَا " وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنُ یَنْبَغِیْ اَنْ یَّکُوْنَ عَزِیْزاً وَلَا یَکُوْنَ ذَلِیْلاً (۲)

بہ تحقیق اللہ تعالی نے مومن کے تمام امور اس کے حوالے کردیے ہیں لیکن اسے یہ اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل و خوار کرے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ سبحانہ و تعالی فرماتاہے ۔ عزت تو بس اللہ ، اس کے رسول اور مومنین کو حاصل ہے ۔ بنابریں مومن کو باعزت رہنا چاہیئے اور اسے ذلت و خواری اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔

---

(۱) سورہ منافقون / ۸۔

(۲) تفسیر برہان ج/۴ ص ۳۲۹۔

قناعت انسان کو عزت و شرف سے ہمکنار کرتی ہے اور ذلت و خواری سے نجات بخشتی ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

لَاَ عَزَّ مِنْ قَانِعٍ (۱)

صاحب قناعت انسان سے بڑھکر کوئی شخص عزت والا نہیں۔

اَلْقَنَاعَةُ اَبْقیٰ عِزٍّ

قناعت سب سے زیادہ پائیدار عزت ہے۔

بہر حال جو شخص اپنی عزت نفس کی حفاظت کا طلبگار ہو اسے چاہیئے کہ قناعت اختیار کرے اور لوگوں کے آگے اپنی عزت و آبرو میں کمی آنے نہ دے۔

حضرت امام علیؑ اس بارے میں فرماتے ہیں:

لَاکَنْزَ اَغْنیٰ مِنَ الْقَنَاعَةِ (۲)

کوئی خزانہ قناعت سے زیادہ بے نیاز کرنے والا نہیں۔

قناعت اور بے نیازی

بعض احادیث میں مذکور ہے کہ اگر کوئی اللہ کی طرف سے عطا کردہ چیزوں پر قناعت کرے تو وہ سب سے زیادہ بے نیاز انسان ہے۔

(در حقیقت جو بات اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہے وہ قناعت اور بے نیازی ہے نہ کہ مال و دولت۔ کتنے ہی افراد ایسے ہیں جو مال و دولت کی فراوانی کے باوجود گداگروں والی صفت کے حامل ہیں)۔

---

(۱) فہرست غرر ص ۳۳۰ شمارہ ۶۱۸۔

(۲) نہج البلاغہ صبحی صالح حکمت ۳۷۱۔

رسول گرامی اسلامؐ سے مروی ہے:

لَيْسَ الْغِنىٰ عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ۔ اِنَّمَا الْغِنىٰ غِنىٰ النَّفْسِ (۱)

بے نیازی دولت کی فراوانی میں نہیں بلکہ بے نیازی تو بس نفس کی بے نیازی ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے:

مَنْ قَنَعَ بِمَا رَزَقَهُ اللهُ فَهُوَ مِنْ اَغْنَى النَّاسِ (۲)

جو شخص اللہ کی دی ہوئی چیزوں پر قانع رہے وہ لوگوں میں سب سے زیادہ غنی ہے۔

قناعت نہ کرنے کے برے اثرات

★ پہلا نکتہ:۔ ذلت و خواری:

جو شخص اللہ کی طرف سے ملی ہوئی چیزوں پر راضی نہ ہو وہ خواہ ناخواہ دوسروں کے اموال کی طرف حرص و طمع کی نظروں سے دیکھے گا جس کے نتیجے میں وہ ان کی طرف دست سوال دراز کرے گا۔ یہ کام بجائے خود اس کی ذلت و خواری کا موجب ہوگا۔

حضرت امام صادق علیہ السلام کا ارشاد گہربار ہے:

مَا اَقْبَحَ بِالْمُؤْمِنِ اَنْ تَكُونَ لَهُ رَغْبَةٌ تُذِلُّهُ۔ (۳)

مؤمن کے لئے یہ بات کس قدر نازیبا ہے کہ وہ ایسی چیز کی خواہش کرے جو اسے ذلیل کردے۔

---

(۱) المحجۃ البیضاء ج ۶ ص ۵۱۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۱۳۹۔

(۳) اصول کافی ج/ ۲ ص ۳۲۰ حدیث نمبر ۱۔

مجلسی مرحوم اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جس رغبت و خواہش کی مذمت ہوئی ہے اور جو انسان کو ذلیل و خوار کردیتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلائے اور ان سے کچھ مانگے۔ رہا اللہ سے مانگنا اور اس کی طرف توجہ و رغبت مبذول کرنا تو یہ امر نہ صرف یہ کہ ذلت کا باعث نہیں بلکہ انسان کی سربلندی و عزت کا موجب بھی ہے[1]

★ دوسرا نکتہ:۔ دائمی پریشانی:

حرص اور لالچ کا ایک نتیجہ ذہنی پریشانی اور اضطراب ہے۔

قرآن کریم کی ایک آیت ہے:

وَلاَ تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهِ اَزْوَاجاً مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى[2]

اور خبردار ہم نے ان میں سے بعض لوگوں کو زندگانی دنیا کی رونق سے جو مالامال کیا ہے اس کی طرف آپ نظر اٹھاکر بھی نہ دیکھیں کہ یہ دنیوی زندگی کے شگوفے اور ان کی آزمائش کا ذریعہ ہے اور آپ کے پروردگار کا رزق اس سے کہیں زیادہ بہتر اور پائیدار ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

اِسْتَوٰى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ جَالِساً ثُمَّ قَالَ مَنْ لَمْ يَتَعَزَّ بِعَزَاءِ اللّٰهِ تَقَطَّعَتْ نَفْسُهُ عَلَى الدُّنْيَا حَسَرَاتٍ وَمَنْ اَتْبَعَ بَصَرَهُ مَا فِي اَيْدِي النَّاسِ طَالَ هَمُّهُ وَلَمْ يَشْفِ غَيْظُهُ وَمَنْ لَمْ يَعْرِفْ اَنَّ لِلّٰهِ عَلَيْهِ نِعْمَةً اِلاَّ فِي مَطْعَمٍ وَمَشْرَبٍ قَصُرَ اَجَلُهُ وَدَنَا عَذَابُهُ.

---

(۱) مرآت العقول ج/ ۱۰ ص ۲۵۸۔

(۲) سورہ طہ / ۱۳۱۔

یعنی جب رسول اللہؐ نے یہ آیت سنی تو سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا، جو شخص اللہ سے دل نہ لگائے وہ حسرت دنیا کے ہاتھوں جان دے دے گا۔ جو کوئی لوگوں کے مال و دولت پر نظریں جمائے رکھے اس کا حزن و غم طویل ہو جائے گا اور اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا اور جو کوئی اللہ کی نعمتوں کو صرف کھانے پینے کی اشیاء تک محدود سمجھے اس کی عمر کم ہو جائے گی اور اس کا عذاب (غم و اندوہ) قریب ہو جائے گا۔

رزق کی ضمانت

چونکہ قناعت کی بحث کے دوران رزق کی تقسیم کا تذکرہ آیا تھا، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں مختصر سی وضاحت کی جائے۔

رزق کی ضمانت اور فراہمی کا مسئلہ قانون خلقت کے ایک مسلمہ اصول کی حیثیت سے قرآن مجید میں مذکور ہے۔ یعنی قرآن مجید کی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے تمام بندوں کی روزی معین ہے اور دیوان خداوندی سے کسی کا نام حذف نہیں ہوا۔ نمونے کے طور پر درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَابَّةٍ لاَ تَحْمِلُ رِزْقَهَا۔ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ .... (۱)

کتنے ہی زمین پر چلنے والے جاندار ایسے ہیں جو اپنی روزی کا بوجھ نہیں اٹھاتے۔ اللہ ہی ہے جو ان کو اور تمہیں روزی دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ (۲)

بے شک رزق دینے والا صاحب قوت اور زبردست صرف اللہ ہے۔

---

(۱) سورہ عنکبوت / ۶۰۔

(۲) سورۂ ذاریات / ۵۸۔

وَلاَ تَقْتُلُوا أَوْلاَدَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلاَقٍ۔ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ (۱)

اور اپنی اولاد کو فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی ان کو اور تمہیں رزق دیتے ہیں۔

مذکورہ آیات سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ رزق دینے والا صرف اللہ ہے اور صرف اسی کی ذات ہے جو جانداروں کی روزی کی ضامن ہے۔ان آیتوں اور اس طرح کی دوسری آیات وغیرہ میں غور و فکر کے نتیجے میں رزق کی ضمانت کا مسئلہ ایک تکوینی حقیقت کی حیثیت سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

سعی و کوشش ضروری ہے

اگر چہ اللہ نے بندوں کی روزی کی ضمانت دی ہے لیکن اس نکتے سے غفلت نہیں برتنی چاہیئے کہ رزق کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کا رزق اس کے دروازے پر حاضر کیا جاتاہے یا اس کے لئے آسمان سے خوان نازل ہوتاہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ عالم خلقت میں جانداروں کے لیے رزق کی فراہمی کے اسباب کا بندوبست کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتاہے:

وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا (۲)

اللہ نے جانداروں کی روزی کو اس عالم میں اندازے کے مطابق معین فرمایا ہے۔

لیکن حصول رزق کے لئے سعی و کوشش ضروری ہے تاکہ اللہ کے عطا کردہ وسیع اور مالامال سرچشموں سے اس کو حاصل کیا جائے۔

---

(۱) سورہ اسراء / ۳۱۔

(۲) سورہ فصلت / ۱۰۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَ اَنْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۱)

انسان کے لیئے صرف وہی ہے جتنی وہ کوشش کرے۔

بنابریں ہر شخص اپنی سعی و کوشش اور استعداد کے مطابق اپنا حصہ پاتا ہے۔ اگر کوئی شخص رزق کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنے گھر میں بیٹھ جائے اور بھوکا مرجائے تو یہ خودکشی ہے اور اس کا گناہ خود اس کی گردن پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو رزق کی تلاش میں سعی و کوشش سے کام نہیں لیتے چنانچہ یہ حدیث ملاحظہ ہو۔

حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

اِنِّیْ اَجِدُنِیْ اَمْقُتُ الرَّجُلَ متعذر الْمَکَاسِبَ فَیَسْتَلْقِی عَلٰی قِفَاہُ وَ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی وَ یَدَعُ اَنْ یَنْتَشِرَ فِی الْاَرْضِ وَ یَلْتَمِسَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ فَالذَّرَّۃُ تَخْرُجُ مِنْ حُجْرِھَا تَلْتَمِسُ رِزْقَھَا (۲)

مجھے وہ شخص ناپسند ہے جو کسب کے لیے سعی نہیں کرتا۔ اور پشت کے بل لیٹ کر کہتا ہے، اے اللہ مجھے رزق عطا کر۔ یوں وہ اللہ کی نعمتوں کی تلاش کے لئے اقدام نہیں کرتا۔ اس کے بعد فرمایا، چیونٹی رزق کی تلاش میں اپنے سوراخ سے باہر نکلتی ہے۔ (یعنی انسان کو رزق کی تلاش میں چیونٹی سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے)۔

---

(۱) سورہ نجم / ۴۱۔

(۲) وسائل الشیعہ ص ۱۷ حدیث ۴۔

★ تیسرا نکتہ:-

احساس ذمہ داری اور انسان دوستی

اس نکتے کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ مذکورہ اصول (رزق کی ضمانت) پر اعتقاد کے بہانے کوئی یہ نہ کہے کہ ہر شخص کو اس کا معینہ رزق ملتا ہے لہذا غریبوں اور ناداروں کا حق ان تک پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس بہانے راہ خدا میں خرچ کرنے سے ہاتھ کھینچ لیں اور ناداروں کو فراموش کر بیٹھیں۔

اللہ تعالی اس طرز فکر کو کافرانہ طرز فکر قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

وَ اِذا قِیْلَ لَهُمْ اَ نْفِقُوا مِمَّا رَزَ قَکُمُ اللهُ قَالَ الَّذِ یْنَ کَفَرُوا لِلَّـذِ یْنَ آمَنُوا اَ نُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللهُ اَطْعَمَهٗ ۔ اِنْ اَ نْتُمْ اِلاَّ فِیْ ضَلالٍ مُّبِیْنٍ (۱)

جب کافروں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے تمہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو یہ کفار مومنین سے (طنزیہ انداز میں) کہتے ہیں، ہم ان لوگوں کو کیوں کھلائیں جن کو اللہ چاہتا تو خود ہی کھلا دیتا؟ (یعنی جب خدا نے ان کو محروم رکھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو ان کا بھوکا رہنا ہی مطلوب ہے۔ پس اللہ ان سے خطاب کرکے فرماتا ہے کہ اے کافرو! تم تو بس کھلی گمراہی میں مبتلا ہو۔

علاوہ ازیں اللہ نے مالداروں کے اموال پر (خمس زکات اور دیگر شرعی واجبات کی طرح کے) مخصوص فرائض معین کیے ہیں اور اس طرح ان پر لازم کیا ہے کہ وہ محتاجوں کی مدد کریں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

---

(۱) سورہ یسین / ۴۷۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِہِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ (۱)

اور ان کے اموال میں سائل اور محتاج کے لئے حق مقرر کیا گیا ہے۔

بہر حال مال داروں اور دولتمندوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ صاحب آبرو محتاجوں کی مدد کریں۔ کتنے ہی صاحب عزت افراد ایسے ہیں جو اپنی دردناک صورتحال کا کسی سے تذکرہ نہیں کرتے جسکی وجہ سے لوگ ان کو مالدار سمجھتے ہیں۔

قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے:

یَحْسَبُہُمُ الْجَاہِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ۔ تَعْرِفُہُمْ بِسِیْمَاہُمْ۔ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافاً (۲)

نا واقف لوگ انہیں ان کی حیا و عفت کی بناء پر مالدار سمجھتے ہیں حالانکہ تم چہرے کے آثار سے ان کی غربت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ یہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے۔

احادیث میں بھی اس مسئلے (دوسروں کی مدد کرنے) پر کافی زور دیا گیا ہے۔ بطور نمونہ چند احادیث کا ذکر کیا جاتا ہے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:

مَا آمَنَ بِیْ مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَ جَارُہٗ جَائِعٌ۔ قَالَ وَ مَا مِنْ اَہْلِ قَرْیَۃٍ یَبِیْتُ فِیْہِمْ جَائِعٌ یَنْظُرُ اللّٰہُ اِلَیْہِمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (۳)

وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جو خود سیر ہو کر سو جائے جبکہ اس کا ہمسایہ بھوکا ہو فرمایا جس بستی کے مکینوں میں سے کوئی بھوک کی حالت میں رات گزارے اللہ قیامت کے دن اس بستی والوں کی طرف رحمت کی نظر سے نہیں دیکھے گا۔

---

(۱) سورہ ذاریات / ۱۹۔

(۲) سورہ بقرہ / ۲۷۳۔

(۳) الوافی ج / ۱ جزء ۳ ص ۹۶۔

★ چوتھا نکتہ :-

مال امتحان کا سبب ہے :

اگر چہ اللہ نے تمام اہل عالم کے رزق کا بند و بست کر رکھا ہے لیکن خدا کی نعمتوں میں ہر انسان کا حصہ مساوی نہیں کیونکہ جسمانی قوت ، استعداد و صلاحیت ، ہوشیاری ، ذکاوت ، طرز فکر ، نسلی اثرات ، مادی وسائل ، اور جغرافیائی حالات کے لحاظ سے سارے انسان یکساں نہیں ہیں ۔ اجمالی طور پر یہ فرق عالم خلقت کے قطعی اصولوں میں سے ایک ہے جسے خداوند علیم و حکیم نے حکمت و مصلحت کی بنیادوں پر قائم رکھا ہے تا کہ لوگ ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت کا احساس کریں نیز ایک دوسرے کی مدد اور خدمت کریں ۔ اگر مذکورہ فرق نہ ہوتا تو معاشرتی زندگی کے تانے بانے بکھر جاتے اور انسانی سرگرمیاں رکود و جمود میں بدل جائیں ۔ علاوہ ازیں افراد بشر کے درمیان تفاوت کا ایک راز لوگوں کی آزمائش ہے جو بجائے خود انسان کے تکامل و ترقی کیلئے ضروری ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْمَآ اٰتٰىكُمْ

اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو امت واحدہ (مساوی اور یکساں) قرار دیتا لیکن اللہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ان چیزوں کے بارے میں آزمائے جو اس نے تمہیں عطا کی ہیں ۔

یہ فرق اس لئے ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ انسان خدا کے عطا کردہ وسائل سے کس طرح استفادہ کرتا ہے بنابریں اگر لوگوں کے درمیان تفاوت نہ ہوتا اور سب برابر ہوتے تو ان کو آزمانا اور ان سے امتحان لینا ممکن نہ ہوتا ۔ یوں اچھے اور برے میں تمیز نہ ہو سکتی ۔ اسی لئے فرمایا :

(۱)
لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ....

تا کہ اللہ خبیث اور طیب کے درمیان امتیاز کرے ۔

---

(۱) سورہ انفال / ۳۷ ۔

رزق کی تقسیم کے لحاظ سے لوگوں کے درمیان جو امتیاز اللہ نے رکھا ہے اس کے بارے میں قرآن میں متعدد آیات موجود ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے بعض کا تذکرہ کریں گے۔

(۱)
اللّٰهُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَ یَقْدِرُ لَهٗ ......

اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے بارے میں چاہے رزق کو وسعت دیتا ہے یا محدود کرتا ہے۔

وَ قَالُوا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ۔ اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّکَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا وَ رَحْمَتُ رَبِّکَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (۲)

اور وہ کہنے لگے کہ آخر یہ قرآن دونوں بستیوں (مکہ و طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ کیا یہی لوگ رحمت پروردگار کو تقسیم کرتے ہیں؟ (نہیں بلکہ) ہم نے ہی دنیوی زندگی میں ان کی معیشت کی تقسیم کی ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر برتری دی ہے تا کہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور رحمت پروردگار ان کے جمع کردہ مال و متاع سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

مذکورہ باتوں کی روشنی میں یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ معاشرتی ماحول اور روابط کو ہر لحاظ سے صاف ستھری بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے تا کہ انسانی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے ایک عادلانہ اور معقول راستہ ہموار کیا جاسکے اور ہر کوئی اپنی استعداد کے مطابق جدوجہد کر کے اپنی صلاحیت بروئے کار لائے اور اپنی قوت و کوشش کے حساب سے اس

---

(۱) سورہ عنکبوت / ۶۲۔

(۲) سورہ زخرف / ۳۱، ۳۲۔

عالم کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوجائے (البتہ جو لوگ کام کرنے سے معذور ہیں یا کسی مجبوری میں مبتلا ہیں حکومت اور لوگوں کو ان کی زندگی کے متوسط مخارج کی فراہمی کا بند و بست کرنا چاہیئے۔)

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتاہے کہ اگر ہر شخص کے رزق کی فراہمی کا ذمہ اللہ نے لیا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود کامیاب نہیں ہوتے اور بہت کم لوگ اپنی پسند کی زندگی گزارنے میں کامیاب ہوتے ہیں ؟ اس سوال کا جواب گذشتہ بیانات کی روشنی میں اچھی طرح واضح ہوجاتاہے لیکن ہر قسم کا شک و شبہ زائل کرنے کے لئے درج ذیل وضاحتوں کی طرف توجہ مبذول فرمائیں۔

الف :- بہت سی محرومیوں کی وجہ لوگوں کا ایک دوسرے پر ظلم و ستم روا رکھنا اور ایک دوسرے کے حقوق کو پامال کرناہے ؟

ب :- اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ دنیا سے ظلم و ستم کا خاتمہ ہوجاتاہے تو پھر بھی لوگوں کی کوششوں کے نتائج یکساں نہیں ہوں گے کیونکہ سعی و کوشش اگر چہ لازمی شرط ہے لیکن کافی نہیں۔

ج :- اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ خداوند کریم لوگوں کی مصلحتوں کو خود ان سے زیادہ جانتاہے۔ کتنے ہی لوگ خوشحال زندگی گزارنے کے خواہشمند ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالی ان کی مصلحت اس چیز میں نہیں دیکھتا۔ رزق اور روزی کا مسئلہ جو اللہ کے اختیار میں ہے اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ملیں گے کہ اگر ہم ان کی فقیرانہ زندگی کا موازنہ ان کی ناز و نعمت والی زندگی سے کریں تو ان دونوں میں زبردست فرق پائیں گے۔ کتنے ہی افراد ایسے ہیں جو فقر و تنگدستی کے دوران ہمیشہ خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنی دینی، معاشرتی اور اخلاقی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے لیکن جونہی مالدار بن جاتے ہیں وہ اللہ کو فراموش کردیتے ہیں۔

اسی لئے قرآن کہتا ہے:

وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۔ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (۱)

یعنی اگر اپنے تمام بندوں کے لئے رزق کے دروازے کھول دے تو وہ زمین میں سرکشی اختیار کریں گے لہذا وہ اپنی مرضی سے ایک خاص مقدار کے مطابق رزق نازل کرتا ہے۔ بہ تحقیق وہ اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ اور بینا ہے۔

ساتھ ہی اس نکتے سے بھی چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے کہ سعی و کوشش کے علاوہ بھی کچھ عوامل ہیں جو رزق کی وسعت اور تنگی میں موثر ہیں یہ عوامل بھی اس پر اسرار عالم میں اللہ کے معین کردہ اسباب و علل کا ایک حصہ ہیں۔

---

(۱) سورہ شوریٰ / ۲۷۔

رزق میں اضافہ کے اسباب قرآن و حدیث کی روشنی میں

★ ۱۔ گناہوں سے اجتناب

اللہ تعالی قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

وَ لَو انَّ اَ هلَ القُریٰ آمَنُـوا وَ اتَّقَوا لَفَتَحْنَـا عَلَیهِـم بَرکَاتٍ مِن السَّمَاءِ وَ الاَ رْضِ وَ لکن کَذَّ بُوا فَاَخَذ نَا هُمْ بِمَا کَانوا یَکسبون (۱)

اگر شہروں اور بستیوں کے سارے مکین ایمان لائیں اور تقوی اختیار کریں تو ہم آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے ان پر کھول دیں گے۔ لیکن انہوں نے حقایق کو جھٹلایا پس ہم نے بھی انہیں ان کے کرتوتوں کی سزا دی۔

★ ۲۔ دوسرا سبب استغفار ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

وَ قَـدْ جَعَـلَ اللّٰهُ الاِ سْتِغْفَارَ سببـاً لِـدُرُورِ الـرِّ زْقِ وَ رَحْمَـةِ الخَلْـقِ فَقَـالَ سُبْحَانَـهُ: اِ سْتَغْفِرُوا رَ بَّكُـمْ اِ نَّـه كَانَ غَفَّاراً يُـرْ سِلِ السَّمَـاءَ عَلَيْكُـمْ مِـدْ راراً (۲)

اور بہ تحقیق اللہ نے استغفار کو رزق کی فراوانی اور بندوں پر اپنی رحمت کے نزول کا سبب قرار دیا ہے چنانچہ اگر ایسا کروگے تو اللہ آسمان سے تمہارے اوپر موسلادھار باران رحمت نازل فرمائے گا۔

---

(۱) سورہ اعراف / ۹۶۔

(۲) نہج البلاغہ خطبہ ۱۴ (ترجمہ مفتی جعفر حسین خطبہ نمبر ۱۴۱)۔

رزق میں کمی کے اسباب

★۱۔ ناشکری

اللہ فرماتا ہے:

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَاتِيهَا رِزْقُهَا رَغَداً مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَت بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱)

اللہ ایسی بستی کی مثال دیتا ہے جہاں امن و امان اور اطمینان کا دور دورہ تھا اور ہر طرف سے وافر مقدار میں رزق وہاں پہنچتا تھا لیکن اس بستی نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی پس اللہ نے ان کے کرتوتوں کے باعث اس بستی کو بھوک اور خوف کا لباس پہنایا۔

قرآن مجید معاشرے کے افراد کو ایک جسم کے مانند قرار دیتا ہے۔ جس طرح لوگوں کے انفرادی اعمال کے انفرادی اثرات مرتب ہوتے ہیں اسی طرح معاشرے کے اجتماعی اعمال کے اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔

اگر معاشرہ ایمان اور تقوی اختیار کرے تو یہ عام لوگوں کے لئے برکت کا موجب ہے اور اگر لوگ مجموعی طور پر ناشکری اور کفران نعمت کے مرتکب ہوں تو یہ امر معاشرتی فقر اور بدامنی کا باعث بنے گا۔

مذکورہ بالا آیت میں معاشرتی و اجتماعی سطح پر امن و امان کی بات ہوئی ہے. جس کا تعلق ایک ملت سے ہوتا ہے۔ آیت میں ان کو ناشکری اور کفران نعمت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

---

(۱) سورہ نحل / ۱۱۲۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ناشکری اور کفران نعمت کو بستی کی طرف منسوب فرماتا ہے اس کے مکینوں کی طرف نہیں چنانچہ فرماتا ہے: فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ یعنی اس بستی نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ یہ تعبیر بستی والوں کے مجموعی کردار کی طرف اشارہ و کنایہ ہے اسی لئے اللہ کا عذاب بھی بستی پر نازل ہوا فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ۔ یعنی اللہ نے اس بستی کو بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا۔ دوسرے الفاظ میں وہ بستی تیر بلا کا ہدف قرار پائی جس کی وجہ سے بستی والے عذاب کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

★ ۲۔ لاپرواہی اور گناہ

جیسا کہ قبل ازیں گناہ کے اثرات کی بحث میں ذکر ہو چکا، گناہوں کا ایک برا نتیجہ رزق میں کمی ہے۔

حضرت امام باقرؑ ارشاد فرماتے ہیں:

إِنَّ الْعَبْدَ لَيُذْنِبُ الذَّنْبَ فَيُزْوَى عَنْهُ الرِّزْقَ (۱)

بہ تحقیق بندہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو رزق اس سے دور کر دیا جاتا ہے۔

---

(۱) اصول کافی ج ۲ ص ۲۷۰۔

بائیسواں نکتہ

تواضع

تواضع دینی اور معاشرتی آداب و رسوم کا ایک حصہ ہونے کے علاوہ اچھے اخلاق کے مالک انسان کی ایک خصوصیت بھی ہے۔ اسلام نے تواضع کے بارے میں بہت تاکید کی ہے اس سلسلے میں یہاں ہم بعض آیات و احادیث کا تذکرہ کرتے ہیں۔

قرآن اور تواضع

اللہ تعالٰی اپنے خاص بندوں کی صفات و خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے تواضع کو ان صفات و خصوصیات میں شمار فرماتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا [1]

---

(۱) الفرقان / ۶۳۔

خداوند رحمان کے بندے وہی ہیں جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے خطاب کرتے ہیں تو انہیں سلام کرتے ہیں اور بے اعتنائی و سنجیدگی کے ساتھ گذر جاتے ہیں۔

اللہ تعالی اپنے خاص بندوں کی جو پہلی صفت بیان فرماتا ہے وہ غرور و تکبر کے بغیر سنجیدگی اور سکون کے ساتھ راستہ چلنا ہے کیونکہ راستہ چلتے وقت انسان کی اندرونی خصلتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اتنے مغرور اور متکبر ہوتے ہیں کہ ان کے چلنے کے ڈھنگ سے ان کے غرور و نخوت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اسی لئے قرآن مجید میں خداوند تعالی ایک خاص طریقے سے لوگوں کو متکبرانہ چال سے منع فرماتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَلاَ تَمْشِ فِی الاَرْضِ مَرَحاً اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولاً (۱)

اور روئے زمین پر اکڑ کر نہ چلنا کیونکہ نہ تم زمین کو شق کر سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندیوں کو چھو سکتے ہو۔

لقمان حکیم نے اپنے بیٹے سے فرمایا:

وَلاَ تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلاَ تَمْشِ فِی الاَرْضِ مَرَحاً اِنَّ اللّٰہَ لاَ یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (۲)

اور خبردار لوگوں کے سامنے اکڑ کر منہ نہ پھلا لینا اور زمین میں غرور کے ساتھ نہ چلنا بے شک خدا اکڑنے والے اور مغرور کو پسند نہیں فرماتا۔

---

(۱) سورہ اسراء / ۳۷۔

(۲) سورہ لقمان / ۱۸۔

تواضع ، احادیث کی روشنی میں

حضرت علیؑ نے اہل تقوی کی توصیف میں فرمایا ــــــ

وَ مَشْیُهُمُ التَّوَاضُعُ ....(۱)

یعنی پرہیزگاروں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے راستہ چلنے اور ان کی راہ و روش میں فروتنی اور تواضع کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

رسول گرامی اسلامؐ نے فرمایا:

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰه رَفَعَهُ اللّٰهُ فَهُوَ فِیْ نَفْسِهِ ضَعِیْف وَ فِی اَعْیُنِ النَّاسِ عَظِیْم (۲)

جو شخص اللہ کی خاطر تواضع اختیار کرے اللہ اس کے مقام کو بلند کرتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: متواضع انسان اپنے آپ کو ضعیف اور حقیر سمجھتا ہے لیکن لوگ اسے تعظیم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا ہے:

کَذٰلِکَ الْحِکْمَةُ تَعْمُرُ فِیْ قَلْبِ الْمُتَوَاضِعِ وَلَا تَعْمُرُ فِی قَلْبِ الْمُتَکَبِّرِ الْجَبَّارِ لِاَنَّ اللّٰهَ جَعَلَ التَّوَاضُعَ آلَةَ الْعَقْلِ وَ جَعَلَ التَّکَبُّرَ آلَةَ الْجَهْلِ (۳)

یوں صاحب تواضع انسان کے دل میں حکمت گھر کر لیتی ہے جبکہ مستکبر اور سرکش انسان کے دل میں نہیں ٹھہرتی کیونکہ اللہ نے تواضع کو عقل کا وسیلہ اور تکبر کو جہالت کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

---

(۱) نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۱۹۳۔

(۲) کنز العمال ج/ ۳ ص ۱۱۳۔

(۳) بحار الانوار ج/ ۷۵ ص ۳۱۲۔

رسول اکرمؐ کا ارشاد مبارک ہے:

الاربع لا یعطیھن اللہ الا من یحبہ۔ الصمت وھو اول العبادۃ والتوکل علی اللہ والتواضع والزھد فی الدنیا (۱)

یعنی چار صفات ایسی ہیں جنہیں اللہ صرف اپنے محبوب بندوں کو عطا کرتا ہے…… ان میں سے ایک تواضع ہے۔

تواضع کی علامات

کچھ لوگ تواضع کا دعوی کرتے ہیں لیکن عمل کے میدان میں ان کے قول و فعل میں زبردست فرق نظر آتا ہے۔

شیخ بہائی مرحوم کے بقول:

آراستہ ظاہرم و باطن نہ چنان

القصہ چنانکہ مینمایم نہ ایم

ہمارا ظاہر خوبصورت ہے لیکن باطن میں ہم ایسے نہیں یعنی ہم جس چیز کا اظہار کرتے ہیں وہ ہمارے اندر نہیں ہوتی۔

یہاں ہم تواضع کی بعض علامات اور متواضع انسانوں کی معین خصوصیات کا تذکرہ کریں گے اس امید کے ساتھ کہ ہم ان خصوصیات کو اپنی زندگی کے لئے نمونہ عمل قرار دیں گے جیسا کہ امام سجادؑ خدا کے حضور مناجات کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

واَلِیْنُ جَانِبِی لَهُمْ تَوَاضُعاً (۲)

یعنی خدایا مجھے توفیق دے کہ میں اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کے ساتھ نرم خوئی اور تواضع اختیار کروں۔

---

(۱) جامع السعادات ج ۱، ص ۳۵۵۔

(۲) صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۲۶۔

امام حسن عسکری ؑ فرماتے ہیں:

مِنَ التَّوَاضُعِ السَّلَامُ عَلَی کُلِّ مَنْ تَمُرُّ بِہِ (۱)

تواضع کی علامت یہ ہے کہ تم جس کے پاس سے گزرو اسے سلام کرو۔

یہ طرز عمل اس قدر اہم ہے کہ قرآن مجید متعدد مقامات پر صریحاً اس کا حکم دیتا ہے۔ اہل بیت ؑ کی احادیث میں بھی اس امر پر زور دیا گیا ہے اور اس کے لئے بہت ثواب بیان ہوا ہے نیز سلام کو ترک کرنے کی مذمت ہوئی ہے۔ یہاں ہم اس بارے میں چند احادیث کی طرف اشارہ کریں گے۔

حضرت امام جعفر صادق ؑ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ؐ نے عبد المطلب کی اولاد سے فرمایا:

یَا بَنِی عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اَفْشُوا السَّلَامَ وَ صِلُوا الْاَرْحَامَ وَ تَهَجَّدُوا وَ النَّاسُ نِیَامٌ وَ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَ اَطِیبُوا الْکَلَامَ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ (۲)

اے اولاد عبد المطلب آشکارا سلام کرو، صلہ رحمی کرو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں اس وقت تم تہجد بجا لاؤ، لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور اچھی باتیں کرو تاکہ صحیح سلامت بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

ساتویں امام ؑ نے بھی فرمایا:

اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَ اَفْشُوا السَّلَامَ وَ صَلُّوا وَ النَّاسُ نِیَامٌ وَ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ (۳)

لوگوں کو کھانا کھلاؤ، آشکارا سلام کرو اور جب لوگ سوئے ہوئے ہوں اس وقت نماز تہجد پڑھو یوں سلامتی کے ساتھ داخل بہشت ہو جاؤ۔

---

(۱) تحف العقول ص ۳۴۶۔

(۲) محاسن برقی ص ۳۸۶۔

(۳) اختصاص شیخ مفید ص ۲۵۳۔

یاد رہے کہ سلام کرنا مستحب ہے اور اس کا جواب دینا واجب ہے۔ سلام کا جواب زیادہ اچھے الفاظ میں دینا بہتر ہے۔

تحیت کیا ہے ؟

قرآن میں بعض جگہوں پر تحیت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ بعض احادیث میں اسلام سلام کرنا مراد لیا گیا ہے۔ بطور نمونہ ان کو بیان موارد کیا جاتا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا (۱)

اور جب تمہیں کوئی تحیت پیش کی جائے تو اس سے بہتر یا کم از کم ویسا ہی جواب دو۔ بیشک اللہ ہر شے کا حساب کرنے والا ہے۔

نیز ارشاد ہے:

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً (۲)

پس جب تم لوگ گھروں میں داخل ہو تو کم از کم اپنے ہی اوپر سلام کرلو کہ یہ پروردگار کی طرف سے نہایت ہی مبارک اور پاکیزہ تحفہ ہے۔

یعنی اگر کوئی گھر میں نہ ہو تو اللہ کی طرف سے اپنے اوپر سلام کرو۔ یہ بات سلام کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ (۳)

---

(۱) سورہ نساء / ۸۶۔

(۲) سورہ نور / ۶۱۔

(۳) اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گھروں میں داخل ہوتے وقت ایک دوسرے کو سلام کیا جائے۔

امام محمدؑ باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

اِنَّ الْمُرادَ بِالتَّحیةِ فِی الآیةِ اَلسَّلامُ وَ غَیْرُہُ مِنَ الْبِرِّ (۱)

اس آیت میں تحیّت سے سلام اور ہر قسم کی نیکی مراد ہے۔

اگر چہ اس آیت کے دیگر معانی بھی بیان ہوئے ہیں جو فی الحال موضوع بحث نہیں بلکہ مفسّرین کہتے ہیں کہ تحیت کا ایک واضح مصداق سلام ہے۔ یہ امر بجائے خود اس اسلامی اور انسانی ذمہ داری کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

اس دینی روایت کی پابندی اس قدر اہم ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

مَنْ بَدَءَ بِالْکَلامِ قَبْلَ السَّلامِ فَلاَ تُجِیْبُوہُ (۲)

جو شخص سلام کرنے سے پہلے کلام شروع کرے اس کا جواب نہ دو۔

ترک سلام کی مذمت

حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الْبَخِیْلَ مَنْ یَبْخَلُ بِالسَّلاَمِ (۳)

بخیل وہ ہے جو سلام کرنے میں بخل سے کام لے۔

ہر کسی کو سلام

کچھ لوگ فقط اپنے دوست احباب کو سلام کرتے ہیں لیکن اسلام اس طرز فکر کا مخالف ہے۔ اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ جس سے بھی ملاقات ہو اسے سلام کیا جائے۔

---

(۱) تفسیر برہان ج ۱ ص ۳۹۹۔

(۲) اصول کافی ج ۲ ص ۶۴۴۔

(۳) اصول کافی ج ۲ ص ۶۴۵۔

سید قطب اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

قَدْ سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ اَيُّ الْعَمَلِ خَيْرٌ؟ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَءُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ (۱)

رسول اکرمؐ سے سوال ہوا کہ کونسا عمل بہتر ہے؟ فرمایا: لوگوں کو کھانا کھلانا نیز ہر واقف اور ناواقف کو سلام کرنا۔

سلام اہل بہشت کا تحفہ ہے

ارشاد قرآنی ہے:

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا (۲)

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کی بناء پر جنت کے بالاخانے عطا کئے جائیں گے اور وہاں انہیں تحیت و سلام سے نوازا جائے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ (۳)

بہشت میں ان کا تحفہ سلام ہوگا۔

رسول اللہؐ کا دستور

رسول اللہؐ سلام کرنے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ابن شہر آشوب لکھتے ہیں:

وَيَبْدَءُ مَنْ لَقِيَهُ بِالسَّلَامِ (۴)

جس شخص کی حضورؐ سے ملاقات ہوتی آپؐ اس کو سلام کرنے میں پہل فرماتے تھے۔

---

(۱) فی ظلال القرآن ج ۲ جزء ۵ ص ۱۷۶۔

(۲) سورہ فرقان / ۷۵۔

(۳) سورہ یونس / ۱۰۔

(۴) مناقب آل ابی طالب ج ۱ ص ۱۴۷۔

آنحضرتؐ لڑکوں اور کم عمر بچوں تک کو بھی سلام کرتے تھا تا کہ آپؐ کے بعد بھی سلام کرنے کی رسم باقی رہے اور لوگ سلام میں سبقت کرنے کو اپنا شیوہ قرار دیں۔

اسی لئے فرمایا:

خَمْسٌ لَا اَدَعُهُنَّ حَتَّى الْمَمَاتِ ...... وَ التَّسْلِيْمُ عَلَى الصِّبْيَانِ لِتَكُوْنَ سُنَّةً مِنْ بَعْدِيْ (۱)

پانچ باتوں کو میں آخری دم تک نہیں چھوڑوں گا (ان میں سے ایک ہے) بچوں پر سلام کرنا ہے تا کہ یہ میرے بعد ایک عام سنت (روایت) بن جائے لوگوں کے درمیان اسلامی روایت کے طور پر رائج ہو جائے۔

سلام کرنے میں پہل کرنے کے بارے میں امام صادقؑ نے فرمایا:

اَلْبَادِيْ بِالسَّلَامِ اَوْلٰى بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ۔ (۲)

سلام میں پہل کرنے والا خدا اور رسول سے نزدیک تر ہوتا ہے۔

حضرت امام علیؑ نے فرمایا:

لِلسَّلَامِ سَبْعُوْنَ حَسَنَةً تِسْعَةٌ وَ سِتُّوْنَ لِلْمُبْتَدِئِ وَ وَاحِدَةٌ لِلرَّادِّ۔ (۳)

سلام کے ستر ثواب ہیں جن میں سے انہتر (۶۹) سلام میں پہل کرنے والے کے لئے ہیں اور ایک جواب دینے والے کا۔

بے جا توقع

افسوس کا مقام ہے کہ بعض لوگ غرور و تکبر اور خود بینی کی بناء پر اس اسلامی روایت کو اہمیت دینے کی بجائے اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ سارے لوگ ان کو سلام کریں۔

---

(۱) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج/ ۱۶ ص: ۲۲۰۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۶۴۵ حدیث ۸۔

(۳) بحار الانوار مطبوعہ بیروت ج/ ۷۳ ص ۱۱۔

کچھ لوگ تو اتنے مغرور اور متکبر ہوتے ہیں کہ وہ توقع رکھتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہوکر سلام کریں۔

اس قسم کے لوگ اپنی اس بے جا توقع کے باعث اسلام کے دو زرین اصولوں کو پامال کرتے ہیں جن میں سے ایک سلام کرنا اور دوسرا سلام کے آداب کو ملحوظ رکھنا ہے۔ اسلام نے ان تمام نکات کو ٹھیک ٹھیک بیان کیا ہے۔

سلام کے آداب

کون سلام کرنے میں پہل کرے؟

معصومین ؑ کی احادیث میں اس بارے میں قابل توجہ اور دقیق احکام بیان ہوئے ہیں۔

حضرت امام صادق ؑ کا ارشاد ہے:

يُسَلِّمُ الصَّغِيْرُ عَلَى الْكَبِيرِ وَ الْمَارُّ عَلَى الْقَاعِدِ وَ الْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ (۱)

چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔ چلنے والا بیٹھے ہوئے آدمی اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے۔

نیز ارشاد فرمایا ہے:

يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِيْ وَ الْمَاشِيْ عَلَى الْقَاعِدِ۔ وَ اِذَا لَقِيَتْ جَمَاعَةٌ جَمَاعَةً سَلَّمَ الاَقَلُّ عَلَى الاَكْثَرِ وَ اذا لَقِيَ واحد جَمَاعَةً سَلَّمَ الْوَاحِدُ عَلَى الْجَمَاعَةِ (۲)

سوار شخص پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے جب کوئی گروہ دوسرے گروہ سے ملے تو چھوٹا گروہ بڑے گروہ کو سلام کرے اور جب اکیلے آدمی کی ملاقات کسی گروہ سے ہو تو اکیلا آدمی اس گروہ کو سلام کرے۔

---

(۱) اصول کافی ج/ ۲ ص ۶۴۶۔

(۲) اصول کافی ج/ ۲ ص ۶۴۷۔

سلام کا جواب اور اس کے آداب

قبل ازین بیان ہوچکا کہ سلام کرنا مستحب ہے لیکن اس کا جواب دینا واجب ہے۔ یہاں تک کہ نماز کی حالت میں بھی سلام کا جواب دینا چاہیئے۔ رہے اس کے آداب تو واضح ہو کہ سلام سے زیادہ واضح اور بہتر انداز میں جواب دینا مستحب ہے۔ البتہ یہ اس وقت ہے جب جواب دینے والا نماز کی حالت میں نہ ہو کیونکہ نماز کے دوران سلام کے برابر جواب دینا چاہیئے زیادہ لمبا جواب دینا نماز کو باطل کردیتاہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

اذا حُیّیتم بتحیۃٍ فحیّوا باحسنَ منہا اَو ردّوہا (۱)

جب تم پر سلام کیا جائے تو اس کا جواب بہتر انداز میں دو یا کم از کم اسی طرح کا جواب دو۔

ملاحظہ ہو کہ یہاں پہلے بہتر جواب کا ذکر ہوا ہے اور پھر مساوی جواب کا۔ جس سے پتہ چلتاہے کہ جو چیز اللہ کو مطلوب اور پسند ہے وہ بہتر جواب ہے۔ سلام کا بہتر جواب یہ ہے کہ جوابی الفاظ کامل تر اور زیادہ بلند مفہوم کے حامل ہوں۔

بحث اور مناظرہ سے پرہیز

تواضع کی ایک اور علامت کج بحثی اور جھگڑے سے اجتناب ہے۔ حضرت امام صادقؑ کا ارشاد ہے

.... اَلتّواضعُ .... وَاَن تترکَ المِرآءَ وَاِن کُنتَ مُحقاً وَ راسُ الخیرِ التّواضعُ (۲)

تواضع کی کئی نشانیاں ہیں ..... جن میں سے ایک یہ ہے کہ تم فضول بحث اور مجادلہ سے پرہیز کرو اگرچہ تم حق پر ہو اور تواضع خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔

---

(۱) سورۂ نساء / ۸۶۔

(۲) بحار الانوار ج ۷، ص ۲۳۔

مجادلہ کیا ہے؟

راغب اصفہانی جدال کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اَلْجِدَالُ الْمُفَاوَضَۃُ عَلٰی سَبِیْلِ الْمُنَازَعَۃِ وَالْمُغَالَبَۃِ وَاَصْلُہٗ مِنْ جَدَلْتُ الْحَبْلَ اَیْ اَحْکَمْتُ فَتْلَہٗ۔

جدال (مجادلہ) سے مراد وہ بحث اور گفتگو ہے جو مد مقابل کو مغلوب کرنے اور اسے دبانے کے لئے کی جائے۔ اس قسم کی بحث کو مجادلہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ فریقین ایک دوسرے سے الجھ پڑتے ہیں تاکہ ہر کوئی اپنی بات کو دوسرے پر ٹھونسے۔ لفظ جدال "جَدَلْتُ الْحَبْلَ" (میں نے رسی کو مضبوطی سے بل دیا) سے لیا گیا ہے کیونکہ اس قسم کی گفتگو کرنے والا مخالف کو اپنی باتوں اور خیالات کے ذریعے جکڑ دینا چاہتا ہے تاکہ وہ مجبور ہو کر اپنے نظریے اور خیال سے دست بردار ہو جائے:

رہا جدال کا اصطلاحی مفہوم تو وہ یہ ہے کہ انسان اپنے مد مقابل کے ہاں مسلمہ باتوں سے اس کے خلاف استدلال کرے۔ یہ طریقہ مد مقابل کو مطمئن کرنے یا خاموش کرنے کے لئے بہت موثر ہے۔ اگر اس قسم کے استدلال کے دوران اچھی اور صحیح روش اختیار کی جائے تو یہ وہی مستحسن مجادلہ ہے جس کی قرآن نے تعریف کی ہے:

مجادلہ کا مثبت پہلو

اسلام نے ہر قسم کے مجادلے سے منع نہیں کیا بلکہ قرآن میں بعض مقامات پر رسول اکرمؐ کو مجادلے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ لوگوں کو مختلف مسائل سے آگاہ کرنے کے لیے بحث و گفتگو ایک ضروری امر ہے: